مضامین ومباحث

حیدر قریشی

مضامین ومباحث

حیدر قریشی

Mazameen o Mabahes By Haider Qureshi

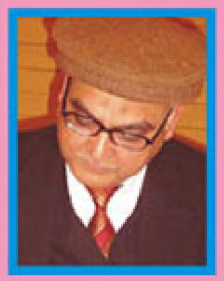

''ہمارا ادبی منظرنامہ'' ستمبر۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی تھی۔اس میں میرے تنقیدی مضامین کے یہ چھ مجموعے یک جا کیے گئے: ۱۔حاصلِ مطالعہ، ۲۔تاثرات، ۳۔مضامین اور تبصرے، ۴۔ستیہ پال آنند کی بودنی نابودنی، ۵۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت، ۶۔ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت۔

اس دوران چند نئے مضامین، تبصرے، تاثرات لکھے گئے، چند مباحث بھی ہوئے اور یہ سارا میٹر یکجا کیا گیا تو ۲۳۲ صفحات کی کتاب بن گئی۔یوں ''مضامین ومباحث'' کی اشاعت کا جواز بن گیا۔اس کتاب کو ''ہمارا ادبی منظرنامہ'' کا ضمیمہ شمار کیا جانا چاہئے۔''ہمارا ادبی منظرنامہ'' کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں یہ کتاب ''مضامین ومباحث'' بھی شامل رہے گی، انشاءاللہ۔اس مجموعہ میں بعض باتوں اور نکات کی تکرار ہوئی ہے۔ایک مضمون کے بعد دوسرے مکالمہ یا مضمون میں بھی جب ملتی جلتی بات زیرِ گفتگو آئی تو وہاں ایسی تکرار ناگزیر تھی۔تاہم ایسے نکات میں میرے نئے مطالعہ اور اس پر میرے غور وفکر کے ایسے اثرات ضرور ملیں گے جو اہلِ علم حضرات کے لیے دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

''مضامین ومباحث'' میں ''بحث ونظر'' کے تحت شامل کی جانے والی خط وکتابت اور مصری ادیب اسماعیل احمد اوہم کی کتاب ''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' کے اردو ترجمہ پر میرا جائزہ خصوصی پیشکش ہے۔خوش ہوں کہ مجھے یہ کام کرنے کی توفیق ملی۔ ----------

---اردو ماہیے پر تحقیق وتنقید کی میری پانچ کتابیں ان سات کتابوں کے علاوہ ہیں۔ان معروضات کے ساتھ اپنے تنقیدی مضامین کا ساتواں مجموعہ ''مضامین ومباحث'' ادبی دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

حیدر قریشی

مضامین ومباحث

حیدرقریشی

عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد

جملہ حقوق بحق حیدرقریشی محفوظ

Mazameen o Mabahes

(Critisism: Articles, Book Reviews and Discussions)

By: Haider Qureshi

Year of 1st Edition: 2017

نام کتاب: مضامین ومباحث

مصنف: حیدرقریشی

مصنف کا پتہ: **Rossertstr.6, Okriftel, 65795 Hattersheim,Germany**

E-Mail: haider_qureshi2000@yahoo.com

سرورق: ارشدخالد

سال اشاعت اول: 2017ء

قیمت 300 روپے

☆

عکاس انٹرنیشنل پبلی کیشنز۔اسلام آباد

مکان نمبر1164، گلی نمبر2، بلاک سی

نیشنل پولیس فاؤنڈیشن سیکٹر9-O۔لوہی بھیر، اسلام آباد

E Mail:akkasurdu2@gmail.com

انتساب

اپنے نانا جی میاں سراج دین صاحب

اور

اپنی بے جی خیراں بی بی کے نام

دل کے دروازے پہ دستک دے کے چھپ جاتے ہیں وہ
اور اپنے سامنے حیدؔر کھڑا رہتا ہوں میں

دل میں بسنے والے دور بھلا کب ہوتے ہیں
دنیا کی نظروں میں بے شک دوری ہوتی ہے

ترتیب

عرضِ حال 7

1- اردو ادب اور الیکٹرانک میڈیا 9

2- ڈاکٹر لدمیلا اور ان کی دو نئی کتابیں 15

3- مت سہل ہمیں جانو۔۔۔مطالعۂ میرؔ کا ایک انداز 28

4- عباس خان کا فکری سفر 36

5- جوگندر پال وفات پا گئے 49

6- جوگندر پال: اردو فکشن کی شان 51

7- گلزار۔فلم سے ادب تک 55

8- کشور ناہید کا کالم اور اصل حقائق 71

9- رضیہ اسماعیل کے مجموعہ ''آدھی چادر'' کے افسانے 78

10- بشریٰ رحمٰن کی ماہیا نگاری 87

11- استعارہ مری ذات کا 93

12- فرحت نواز کی حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ شاعری 95

13- نذیر ناجی صاحب کا خاص کالم 100

14- رضینہ خان کا مقالہ اور چند وضاحتیں 107

15- تھائی لینڈ کا سفر نامہ 112

16- نسیم انجم کے دو ناول 121

17- ایک وضاحت (انگلینڈ کے ایک انٹرنیٹ میگزین کے حوالے سے) 124

18- وزیر آغا کی نظم نگاری 127

19- سرگودھا میں وزیر آغا شناسی 130

20- تسلیم الٰہی زلفی کی فیض شناسی یا خود نمائی؟ 132

21- شرارِ جستہ 144

22- سخن یہ ہے 146

23- پشاور کی ۱۷ کہانیاں 148

24- خواب گاہ میں ریت 149

25- گوہرِ اعجاز 151

26- مشتاق قمر کے ناول و ڈرامہ کا خصوصی مطالعہ 152

27- عشق چلا تھا اوڑھ کے چادر 153

28- حُسن تغزل 154

29- پارٹ ٹائم شاعری 155

30- ترقی پسند نظم نمبر اور میرا جی 156

31- گزارشِ احوالِ واقعی (ثمینہ راجہ کے خطوط کے حوالے سے) 159

اردو افسانے کی اولیت کی تحقیق کا مسئلہ (حیدر قریشی، ناصر عباس نیر) 176

32- جدید ادب جرمنی کے تین اداریے 179

بحث و نظر

ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں مکالمہ (عمر فاروق۔حیدر قریشی) 184

''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' کا جائزہ 213

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

عرضِ حال

''ہمارا ادبی منظرنامہ'' ستمبر ۲۰۱۴ء میں شائع ہوئی تھی۔اس میں میرے تنقیدی مضامین کے یہ چھ مجموعے یک جا کئے گئے :۱۔حاصلِ مطالعہ،۲۔تاثرات،۳۔مضامین اور تبصرے،۴۔ستیہ پال آنند کی بودنی نابودنی،۵۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت،۶۔ڈاکٹر وزیر آغا۔عہد ساز شخصیت۔

اس دوران چند نئے مضامین،تبصرے،تاثرات لکھے گئے،چند مباحث بھی ہوئے اور یہ سارا میٹر یک جا کیا گیا تو 232 صفحات کی کتاب بن گئی۔یوں ''مضامین و مباحث'' کی اشاعت کا جواز بن گیا۔ اس کتاب کو ''ہمارا ادبی منظرنامہ'' کا ضمیمہ شمار کیا جانا چاہئے۔''ہمارا ادبی منظرنامہ'' کا نیا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں یہ کتاب ''مضامین و مباحث'' بھی شامل رہے گی۔انشاء اللہ۔اس مجموعہ میں بعض باتوں اور نکات کی تکرار ہوئی ہے۔ایک مضمون کے بعد دوسرے مکالمہ یا مضمون میں بھی جب ملتی جلتی بات زیرِ گفتگو آئی تو وہاں ایسی تکرار ناگزیر تھی۔تاہم ایسے نکات میں میرے نئے مطالعہ اور اس پر میرے غور وفکر کے ایسے اثرات ضرور ملیں گے جو اہلِ علم حضرات کے لیے دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

''مضامین و مباحث'' میں ''بحث ونظر'' کے تحت شامل کی جانے والی خط و کتابت اور مصری ادیب اسماعیل احمد ادہم کی کتاب ''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' کے اردو ترجمہ پر میرا جائزہ خصوصی پیشکش ہے۔خوش ہوں کہ مجھے یہ کام کرنے کی توفیق ملی۔اسماعیل احمد ادہم کے اردو ترجمہ نگار کے ساتھ میری جو مراسلت ہوئی،اسے کسی ایڈیٹنگ کے بغیر شامل کیا گیا ہے۔اس خط و کتابت سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک علمی معاملہ میں میری طرف سے پوری کوشش ہوتی رہی کہ دوسرے فریق کے ساتھ عزت واحترام کے ساتھ پیش آیا جائے۔علمی بحث کو دلائل اور شواہد کے ساتھ علمی طور پر ہی آگے بڑھایا جائے۔لیکن میری طرف سے عزت واحترام اور ہمدردی کے باوجود فریق ثانی مسلسل شرارت اور اشتعال انگیزی کی طرف مائل رہے۔اور میرے مستحکم دلائل کو پڑھنے کے بعد کوئی مدلل بات کرنے کی بجائے یکے بعد دیگرے مختلف موضوعات کو چھیڑ کر اور شوخ بیانی سے کام لے کر ہر پہلے موضوع سے فرار اختیار کرتے رہے۔

ہماری اردو کی ادبی دنیا میں مصری ادیب مذکور جیسے نظریات رکھنے والے ادباء کو عام طور پر آسانی کے ساتھ مذہبی اشتعال انگیزی کا شکار بنا لیا جاتا ہے۔میں بھی اس گھٹیا حربہ کو آزما سکتا تھا لیکن میں اسے اردو کی ادبی دنیا کا منفی رویہ سمجھتا ہوں۔چنانچہ میں نے اپنے مکالمہ کو مدلل علمی سطح پر رکھا اور اپنے علمی دلائل کے ساتھ اسماعیل احمد ادہم کے اردو ترجمہ نگار کے تئیں ہمدردانہ،دوستانہ اور کسی حد تک حوصلہ افزا رویہ اختیار رکھنے کی کوشش کی۔لیکن افسوس کہ میرے ایسے رویہ کا انہوں نے منفی اثر لیا اور علمی طور پر بات آگے بڑھانے کی بجائے مسلسل شرارت اور اشتعال انگیزی کی طرف مائل رہے۔تا آنکہ مجھے تھوڑا سا سختی کے ساتھ ان کا نوٹس لینا پڑا اور پھر وہ ساری شوخیاں بھول کر بالکل غائب ہوگئے۔

اپنے اس تجربہ کو اس لیے بھی من وعن پیش کر رہا ہوں کہ اس سے اندازہ کیا جاسکے کہ اپنے پہلے ادبی معرکوں میں بھی میرا رویہ آن دی ریکارڈ اور آف دی ریکارڈ ایسا ہی رہا ہے۔میں نے از خود کوئی جنگ چھیڑنے سے گریز کیا ہے۔علمی وادبی اختلاف رائے کرنا اور ادبی تہذیب کے ساتھ اس کا اظہار کرنا ہر ادیب کا حق ہے۔میں نے ہمیشہ کوشش کی کہ کہیں کوئی اختلافی بات ہے تو اسے سلیقے کے ساتھ پیش کر سکوں۔لیکن ہمارے اردو کے ادبی معاشرے میں طاقت اور اختیار کی رعونت کے حامل ادیبوں نے اختلاف کو بھی گستاخی میں شمار کیا اور پھر مجھے ایک کے بعد ایک ادبی معرکے سے گزرنا پڑا۔میں معرکہ آرائیوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن جب بار بار مجھے بعض معرکوں میں الجھایا گیا تو مجھے ہر معرکے کو اس کے منطقی انجام تک پہنچانا پڑا۔یہ سراسر خدا کا فضل وکرم ہے کہ میں ہر معرکہ میں سرخرو ہو کر نکلا۔معرکہ آرائی کے دوران میں نے ممکنہ حد تک ادبی تہذیب کو ملحوظ رکھا۔کہیں مجھے بعض سخت الفاظ لکھنا پڑے تو وہ الفاظ بھی معرکے کے دوسری طرف کے لوگوں کے سو فیصد سخت الفاظ وانداز کے مقابلہ میں بمشکل پانچ فیصد تھے۔کبھی دوٹوک حساب کتاب کی ضرورت پڑی تو ان معرکوں کے ریکارڈ سے اپنے اس موقف کے سارے ثبوت بھی پیش کردوں گا۔ویسے مخالفین کا سارا متعلقہ ریکارڈ میرے ساتوں تنقیدی مجموعوں میں موجود ہے،کوئی بھی ذہین محقق آسانی سے انہیں تلاش کرسکتا ہے۔

اردو ماہیے پر تحقیق وتنقید کی میری پانچ کتابیں ان سات کتابوں کے علاوہ ہیں۔ان معروضات کے ساتھ اپنے تنقیدی مضامین کا ساتواں مجموعہ ''مضامین و مباحث'' ادبی دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

حیدر قریشی (جرمنی سے)

اردو ادب اور الیکٹرانک میڈیا

عزت مآب پروفیسر ایس آر نرنجن وائس چانسلر گلبرگہ یونیورسٹی
مہمانانِ خصوصی جناب عزیز اللہ بیگ صدر نشین کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور۔
جناب انجینئر اکرم نقاش، رکن کرناٹک اردو اکیڈمی، بنگلور
صاحبِ صدر جناب پروفیسر عبدالرب استاد
اور جملہ منتظمینِ سیمینار اور معزز خواتین وحضرات!

''اردو ادب اور الیکٹرانک میڈیا'' کے موضوع پر ہونے والا آج کا سیمینار گلبرگہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی کی جانب سے ایک نہایت مستحسن اور قابلِ تعریف کاوش ہے۔اس طرح اردو کو اپنے عصر سے ہم آہنگ کرنے میں مدد ملے گی۔ میں جملہ منتظمین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی مجھے ایسے سیمینار سے مخاطب ہونے کا شرف بخشا ہے۔ یہ عملی طور پر آج کی جدید ترٹیکنالوجی کے جادو کا ہی ایک منظر ہے۔ یہ منظر میرے لیے حیرت آمیز مسرت کا موجب ہے۔اردو ادب اور الیکٹرانک میڈیا کے آج کے تعلق پر بات کرنے سے پہلے مجھے اردو، ہندی، فارسی اور عربی داستانوں کی دنیا کی چند ہلکی سی جھلکیاں دکھانی ہیں۔آج ان ناقابلِ یقین قصوں کو ہم کہیں زیادہ بڑے روپ میں آج کی جدید ترین دنیا میں رُونما ہوتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

ہماری داستانوں میں اُڑتے ہوئے دیو، جن، پریاں، اُڑن قالین اور اُڑن طشتریاں آج تیز رفتار طیاروں اور خلائی تسخیر میں مصروف راکٹس اور سیاروں کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ایران کے بادشاہ جمشید کا جام جہاں نما ہمارے لیے ایک افسانہ ہی تھا لیکن آج کا اسمارٹ فون جامِ جمشید سے کہیں آگے پہنچ چکا ہے۔

علی بابا کی کہانی میں ''کھل جا سُم سُم'' کا اسم بولنے سے دروازہ کھلتا تھا لیکن آج کی سپر مارکیٹوں

کے خودکار دروازے ہمارے پہنچتے ہی کسی اسم کے بغیر کھل جاتے ہیں۔

پرانی داستانوں میں سلیمانی ٹوپی کے ساتھ اس سے ملتی جلتی حاضر و موجود ہوتے ہوئے نظروں سے اوجھل رہنے کی کہانیاں ملتی ہیں۔ بالی ووڈ کی ایک فلم ''مسٹر انڈیا'' اسی داستانوی کردار کو کسی حد تک قابلِ فہم بناتے ہوئے پیش کی جا چکی ہے۔اور اب ایک کیمیائی مادہ تیار کرلیا گیا ہے جسے Metamaterials [1] کا نام دیا گیا ہے۔ یہ کیمیائی مادہ جس شئے پر لگا دیا جائے وہ کسی کو دکھائی نہیں دے گی۔انسان سے لے کر ڈرون طیاروں تک کو اس مادہ سے پینٹ کر دیا جائے تو ہمارے پاس ہوتے ہوئے بھی ہمیں دکھائی نہیں دیں گے جبکہ ہم پوری طرح ان کی نگاہ یا زد میں ہوں گے۔ دلچسپی رکھنے والے احباب Metamaterials لکھ کر کسی بھی سرچ انجن میں اس مادہ کی حقیقت اور کارکردگی کے بارے میں جانکاری حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ مادہ روشنی کو خود میں جذب کیے بغیر اور عکس بنائے بغیر خود سے دور ہی جھکا دیتا ہے، یوں وہ حصہ جو اس مادہ میں لپٹا ہوا ہے کسی کو دکھائی نہیں دیتا اور اس کے پیچھے جو کچھ ہو وہ دکھائی دے رہا ہوتا ہے۔

ہماری بعض کہانیوں میں عمر کو گزرنے سے بچائے رکھنے کے واقعات ملتے ہیں۔لطائف کی صورت میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔''عذرا کی واپسی'' کی صورت میں ایک معروف فن پارہ ایک سحر انگیز داستان سناتا ہے اور اب حیاتیاتی سائنس میں حیرت انگیز تجربہ ہوا ہے۔صرف عمرِ رفتہ کو بچائے رکھنا ہی نہیں بلکہ عمر کو کئی سال پیچھے لے جانے کا تجربہ بعض جانوروں پر آزمایا گیا ہے اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔دس بیس برس تک عمر کم کرنے کا سلسلہ تو مردوں سے زیادہ خواتین میں مقبول ہو جائے گا لیکن یہ خطرہ بھی موجود ہے کہ کہیں یہ تجربہ انسانی زندگی کو غیر معمولی حد تک طویل کرنے کی طرف نہ جا نکلے۔اور پھر ہم سب ان لوگوں جیسے حال کو نہ پہنچ جائیں جو آبِ حیات نہر کا پانی پی کر اس کے کنارے پر پڑے ہوئے تڑپ رہے تھے، موت کی آرزو کر رہے تھے اور انہیں موت نہیں آرہی تھی۔ ہماری اردو کی داستان میں تو ایسا ہی لکھا ہوا ہے، دیکھتے ہیں ہماری اگلی نسلوں کی حقیقی زندگی کی داستان میں کیا لکھا جاتا ہے۔

بعض مذہبی روایات اور آیات میں زمانے کی دستبرد سے عرصہ تک محفوظ رہنے والوں کا ذکر ملتا ہے۔اصحابِ کہف کے واقعہ سے ملتے جلتے کئی واقعات ہمارے قصوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔یعنی ایک طرف صدیاں گزر جاتی ہیں دوسری طرف محض پلک جھپکنے تک بات ہوئی ہوتی ہے۔اور اب یہ سب کچھ ایک حقیقت کا روپ دھارنے کے قریب پہنچ رہا ہے۔فرانس اور سوئٹزرلینڈ کی سرحد پر تعمیر کی گئی ''یورپی لیبارٹری برائے ذراتی فزکس'' [2] میں ایٹم کے چند ذرات پر بگ بینگ کا تجربہ دہرایا گیا جس سے

کائنات کی ابتدا کے بارے میں بگ بینگ کے سائنسی تصور کی تصدیق ہوگئی۔اس تجربہ کے آغاز ہی میں ایک انوکھا سب پارٹیکل سامنے آیا اور پھر وہ غائب ہوگیا۔اس کے ساتھ ہی بڑے دھماکے کا عمل شروع ہو گیا۔اس سب پارٹیکل کو ویسے تو ہگز بوسون پارٹیکل کا نام دیا گیا ہے لیکن اس کی کارکردگی کے باعث اسے گاڈ پارٹیکل بھی کہا جاتا ہے۔سائنس دان اب اس کی کھوج میں مصروف ہیں۔اگر یہ ان کی دسترس میں آ گیا تو روشنی کی رفتار سے سفر کرنا معمول کی بات ہو جائے گی۔گویا بیگم سبزی کاٹ رہی ہوں گی اور ہم اپنے نظام شمسی سے باہر کا ایک چکر لگا کر واپس آ جائیں گے اور بیگم یا تو تب بھی سبزی ہی کاٹ رہی ہوں گی یا ہنڈیا بھون رہی ہوں گی۔یہ نہ تو محض مذاق ہے اور نہ ہی صرف خیال آرائی۔جیسے ہماری ہزاروں برسوں سے سینہ بہ سینہ چلتی داستانوں اور لوک قصوں میں موجود ناقابلِ یقین باتیں آج ہماری زندگی کا حصہ بن چکی ہیں ویسے ہی روشنی کی رفتار سے سفر کی ناقابلِ یقین بات ہماری اگلی نسلوں کی زندگی کے معمولات میں شمار ہوگی۔گویا ہم وسیع تر خلائی دور (سپیس ایج) میں داخل ہونے والے ہیں۔ہاں ایک ڈر ضرور ہے،اگر ہم کسی عالمی یا علاقائی حماقت کے نتیجہ میں ایٹمی جنگ کا شکار ہو گئے تو پھر سپیس ایج کی بجائے پتھر کے زمانے میں چلے جانے کا خطرہ بھی سروں پر موجود ہے۔

میں نے قدیم قصوں کے چھ واقعات میں سے چار ایسے بیان کیے ہیں جو سائنسی طور پر حقیقت بن چکے ہیں۔جبکہ آخر الذکر دو واقعات ایسے بتائے ہیں جو ابھی سائنسی طور پر تحقیق کے مراحل سے گزر رہے ہیں تاہم کسی وقت بھی ان کا مکمل حقیقت بن جانا خارج از امکان نہیں ہے۔حقیقت یہ ہے کہ ہمارے مشرق کی بیشتر قدیم داستانوں کی کئی طلسماتی اور ہوش رُبا کہانیاں حقیقت کا روپ دھار کے ہمارے سامنے آن کھڑی ہیں۔اور ہماری نئی نسل اس جہانِ طلسم میں کسی حیرت میں مبتلا ہوئے بغیر ان سب تحیرات کو اب معمولاتِ زندگی میں شمار کرتی ہے۔

ان ساری داستانوں میں سے محض ایک داستان جامِ جمشید کا تعلق الیکٹرانک میڈیا سے جڑتا ہے۔الیکٹرانک میڈیا میں سارے ٹی وی چینلز، برق رفتار اطلاعی نظام، انٹرنیٹ کی ساری دنیا، جس میں ساری ویب سائٹس، سارے سوشل فورمز، آن لائن رابطوں کے سارے ذرائع ہمہ وقت دستیاب ہیں، ہر طرح کے علوم اور ہر طرح کی معلومات کے سات سمندر نہیں، بلکہ ہزاروں سمندر موجزن ہیں۔اپنے اپنے جہان میں آزادانہ طور پر متحرک ہر طرح کا میڈیا انٹرنیٹ کی، یا یوں کہئے کہ اسمارٹ فون کی ڈبیہ میں بند ہو کر ہم سب کے ہاتھ میں آ گیا ہے۔

اردو ادب اخبارات و رسائل سے ہوتا ہوا ریڈیو، ٹی وی چینلز تک اور پھر مشاعروں، کانفرنسوں اور سیمینارز کے ذریعے اپنے ہونے کا تھوڑا بہت ثبوت دیتا آ رہا ہے۔انٹرنیٹ کی دنیا آباد ہونے کے بعد اردو ادب اس جہان میں بھی دھیرے دھیرے دکھائی دینے لگا تھا۔شعر و ادب کے مختلف انتخاب سے آراستہ ویب سائٹس سامنے آئیں تو پہلے پہل وہاں رومن رسم الخط کے ذریعے اردو ادب کو متعارف کرایا گیا۔مختصر مدت میں ہی اردو ادب کے شیدائیوں نے پکچر کی صورت میں اردو رسم الخط کے ذریعے اردو ادب کی ویب سائٹس قائم کرنا شروع کر دیں۔ایسی ابتدائی اور نہایت اہم ویب سائٹس میں اردوستان ڈاٹ کام اور اردو دوست ڈاٹ کام کا نام لوں گا۔افسوس کہ اس وقت یہ دونوں ابتدائی ویب سائٹس بند ہیں۔اسی دوران پی ڈی ایف فائل کی صورت میں پوری کتاب کو انٹرنیٹ پر پیش کرنا آسان ہوا تو ای لائبریریز کا سلسلہ شروع ہو گیا۔مختلف اداروں کے تحت، بعض اردو دوست احباب کی کاوشوں کے ذریعے اور متعدد ادیبوں کی ذاتی توجہ کے نتیجہ میں ایسی لائبریریوں نے اردو ادب کی نئی پرانی ہر طرح کی کتابوں تک رسائی کو بے حد آسان بنا دیا۔اردو زبان یونی کوڈ میں منظرِ عام پر آئی تو اس جدید ترین سہولت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یونی کوڈ میں ویب سائٹس قائم ہونے لگیں اور متعدد لائبریریز نے یونی کوڈ میں اردو کتابیں فراہم کرنا شروع کر دیں۔یونیورسٹی کے طالب علموں کے لیے ایسی لائبریریوں کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں سے متحرک الفاظ کو کاپی اینڈ پیسٹ کر کے اپنے مقالہ جات میں آسانی کے ساتھ حوالہ دے کر شامل کر سکتے ہیں۔اس سے تحقیقی مقالات کی تکمیل میں بڑی سہولت ہونے لگی ہے۔ذاتی اور اجتماعی بلاگز کے سلسلہ نے اہلِ ادب کے لیے مزید آسانیاں مہیا کر دی ہیں۔سو اردو ادب کا بے شمار قدیم و جدید سرمایہ اس وقت الیکٹرانک میڈیا پر موجود ہے۔اس تک رسائی آسان ہے۔تاہم جیسے ادبی کتاب کے قارئین بہت کم رہ گئے ہیں ویسے ہی الیکٹرانک میڈیا پر بھی سنجیدہ ادبی کتابوں کے قارئین بہت کم ہیں۔الیکٹرانک میڈیا پر شوبز کی چکا چوند کے باعث یا تو ہمارے اہلِ ادب بھی اسی رو میں بہنے لگے ہیں یا پھر کسی حد تک مایوسی کا شکار ہونے لگے ہیں۔بہت کم ہیں جو ہر طرح کی میڈیائی بے اعتنائی کے باوجود اپنے لکھے ہوئے لفظوں پر پورا اعتماد کرتے ہوں۔میں اپنے ایک پرانے مضمون ''ادب، میڈیا اور انٹرنیٹ''[۳] میں اس حوالے سے جو کچھ مُثبت و منفی موجود ہے اس کا ذکر تفصیل سے کر چکا ہوں۔

الیکٹرانک میڈیا پر ہر طرح کا مواد موجود ہے۔ایسا بے شمار مواد جسے عموماً ایک دوسرے سے چھپ کر دیکھا

اور سنا جاتا ہے۔ایسے مواد کے سلسلہ میں ہم اہلِ مشرق اور اہلِ مغرب میں ایک بنیادی فرق موجود ہے۔اس فرق کو واضح کرنے کے لیے دو سادھوؤں کا قصہ یاد آ گیا۔دونوں سفر پر نکلے،رستے میں ایک بڑی ندی دکھائی دی۔ندی کے کنارے پر ایک دوشیزہ پریشان کھڑی تھی۔اسے دوسرے کنارے پر جانا تھا لیکن وہ لہروں کے زور سے ڈر رہی تھی۔ایک سادھو نے اسے پیش کش کی کہ میرے کندھوں پر بیٹھ جاؤ تمہیں دوسرے کنارے تک پہنچادوں گا۔لڑکی سادھو کے کندھوں پر سوار ہوگئی۔دوسرے کنارے پر سادھو نے اسے اتار دیا اور وہ اس کا شکریہ ادا کر کے چلی گئی۔پھر وہ دونوں سادھو دیر تک اور دور تک خاموشی سے چلتے رہے۔آخر دوسرے سادھو نے خاموشی کو توڑا اور پہلے سادھو سے کہا ہم تو سادھو ہیں،ہمیں ناری کو چھونا منع ہے اور تم نے اسے کندھوں پر سوار کر لیا۔اپنے ساتھی کی یہ بات سن کر پہلا سادھو مسکرایا اور بولا میں نے تو اس ناری کو دوسرے کنارے پر پہنچتے ہی اپنے کندھوں سے اتار دیا تھا لیکن لگتا ہے تم نے ابھی تک اسے اپنے کندھوں پر سوار کر رکھا ہے۔

نہ تو اہلِ مغرب سادھو ہیں اور نہ ہم اہلِ مشرق۔تاہم اہلِ مغرب پہلے سادھو کی طرح ندی کے دوسرے کنارے پر اپنا بوجھ اتار کر اپنے اصل کام میں لگ جاتے ہیں جبکہ ہم لوگ عام طور پر دوسرے سادھو کی طرح ایسی چیزوں کو اپنے سروں پر سوار کیے رکھتے ہیں۔

بہر حال ایسے سطحی مواد،سوشل میڈیا کی گالی گلوچ سے بھی بڑھی ہوئی آزادی،متعدد اخلاقی اور سماجی مسائل کو جنم دیتی ہوئی خرابیاں،ایسا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی اسی الیکٹرانک میڈیا پر ہی ہم نے اردو ادب کے سلسلہ میں اپنا مُثبت کردار ادا کرتے رہنا ہے۔قرآن مجید کی **سورۃ النحل** میں نہایت لطیف بات کی گئی ہے۔تمہارے لیے جانوروں میں سوچنے کا مقام ہے کہ ہم نے ان کے پیٹ میں گوبر اور خون کے درمیان میں سے دودھ کی دھاریں نکال دی ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہیں۔۴ سو جب ہم غور کریں گے تو اسی الیکٹرانک میڈیا کے پیٹ میں موجود گوبر اور خون کے درمیان میں سے ادب کے دودھ کی دھاریں نکالتے رہیں گے۔اپنے عصر سے ہم آہنگ ہوتے چلے جائیں گے۔

۹/اپریل ۲۰۱۶ء کو گلبرگہ یونیورسٹی کرناٹک کے شعبۂ اردو و فارسی کی جانب سے ''اردو ادب اور الیکٹرانک میڈیا'' کے موضوع پر ہونے والے ایک روزہ سیمینار میں کلیدی خطبہ کے طور پر پڑھا جانے والا مقالہ

حوالہ جات

۱۔ https://en.wikipedia.org/wiki/Metamaterial_cloaking

۲۔ http://www.gotquestions.org/God-particle.html

https://de.wikipedia.org/wiki/Higgs-Boson

۳۔ **مضمون** ''ادب،میڈیا اور انٹرنیٹ'' میری کتاب ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' کے صفحہ نمبر ۴۷۹ پر موجود ہے۔انٹرنیٹ پر اس تک براہِ راست رسائی کے لیے یہ لنک پیش ہے۔

http://punjnud.com/ViewPage.aspx?BookID=2927&Book PageID=55315&BookTitle=Mazameen%20aur%20Tabsaray

۴۔ **وانّا لکم فی الانعام لعبراۃ....لبناً خالصاً سآئغاً للشٰربین۔**

پ:۱۴۔سورہ النحل،۱۶۔آیت ۶۶

مطبوعہ

یونیورسٹی جرنل **''تحقیقات''**۔وفاقی اردو یونیورسٹی،اسلام آباد۔سال جنوری تا جون ۲۰۱۶ء

ڈنمارک

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?

mod=article&cat=Functions&article=1677

آسٹریلیا

http://punjnud.com/Aarticles_detail.aspx?

ArticleID=1073&ArticleTitle=Urdu%20Adab%20aur%20Electronic%20Media

کینیڈا

https://themuslimtimes.info/2016/12/26/

electronic-medias-influence-on-urdu-literature/

ڈاکٹر لدمیلا اوران کی دونئ کتابیں

ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا روس میں اردو زبان وادب کی ممتاز اسکالر اور علمی وادبی شخصیت ہیں۔اردو زبان وادب کے حوالے سے ان کی خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ان کا نام اور کام اردو کے ادبی حلقوں میں خاصا جانا پہچانا ہے۔تاہم بہت سارے لوگ شاید ان کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں رکھتے۔علم شرقیات کے روس کے مرکزی تحقیقی ادارہ

Institute of Oriental Studies of the Russian Academy of Sciences in Moscow.

کے ادبیاتی شعبے کی محقق ہیں۔ڈاکٹر لدمیلا ماسکو یونیورسٹی اور رشین سٹیٹ یونیورسٹی فار دی ہیومینیٹیز سے بھی اردو ادب کی لیکچرر کی حیثیت سے منسلک رہی ہیں۔انہوں نے ۱۹۸۷ء میں مولانا الطاف حسین حالی پر اپنا ڈاکٹریٹ کا مقالہ مکمل کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔فیض احمد فیض جب بھی روس جاتے ڈاکٹر لدمیلا ان کی مترجم کے فرائض انجام دیتیں۔۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۴ء تک انہوں نے یہ کام کیا۔اس دوران انہیں فیض صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان کی تخلیقی شخصیت کو سمجھنے میں کافی مدد ملی۔چنانچہ انہوں فیض صاحب پر متعدد مضامین کے علاوہ ایک کتاب ''پرورشِ لوح وقلم۔فیض احمد فیض :حیات اور تخلیقات'' کے عنوان سے لکھی۔ڈاکٹر لدمیلا نے فیض صاحب کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال کے بارے میں بھی اردو اور روسی دونوں زبانوں میں قابلِ ذکر کام کیا ہے۔انہوں نے غالب کے کلام کا روسی ترجمہ بھی کیا ہے۔[۱] اردو کے لیے ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف کے طور پر ڈاکٹر لدمیلا کو انڈو پاک اور بیرون برصغیر سے کئی ادبی ایوارڈ مل چکے ہیں۔انہیں صدرِ پاکستان کی جانب سے سن ۲۰۰۶ء میں ستارۂ امتیاز سے بھی نوازا گیا۔

ڈاکٹر لدمیلا کے علمی وادبی کام کی اہمیت اور قدر وقیمت کا ایک زمانہ معترف ہے۔یہاں اردو کے ممتاز نقاد اور دانشور شمیم حنفی کی مختصر سی رائے پیش کر دیتا ہوں۔

''ڈاکٹر لُدمیلا وسیلئیوا کی اس کتاب کے سلسلے میں دو باتیں بہت اہم ہیں۔ایک تو یہ کہ اس کا

موضوع اردو کے سب سے مقبول اور محبوب شاعر فیض کی زندگی اور شاعری ہے۔دوسرے یہ کہ اسے ڈاکٹر لدمیلا وسیلیوا نے لکھا ہے جنھیں ہمارے زمانے کے غیر ملکی اردو اسکالرز اور مستشرقین میں بہت ممتاز حیثیت حاصل ہے۔لدمیلا اردو زبان کے محاسن اور اسالیب پر گہری نظر رکھتی ہیں۔انھوں نے حالی اور فیض پر بہت وقیع کام کیا ہے۔ایسے کئی سوال انھوں نے اپنی تحریروں میں اٹھائے ہیں جن سے کبھی کبھی اہلِ زبان بھی سرسری گزر جاتے ہیں۔'' [۲]

اردو ادب کے مطالعے اور تحقیق کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر لدمیلا روسی زبان میں اردو کے نثر نگاروں اور شعراء کی تخلیقات کا ترجمہ بھی کرتی ہیں۔میری خواہش تھی کہ میں ان کے ایسے سارے کام کو اپنے مضمون میں نشان زد کرسکوں لیکن ڈاکٹر لدمیلا کی کسرِ نفسی یا بے نیازی کے باعث مجھے ایسی معلومات مہیا نہ ہوسکی۔سو اس وقت ڈاکٹر لدمیلا کی روسی زبان میں دو کتابوں کا تعارف کرانے پر اکتفا کروں گا۔

پہلی کتاب اردو غزل کے ابتدائی دور سے متعلق ہے۔ "The formation of Urdu ghazal: the origins of the genre" [۳]۔''**اُردو غزل بحیثیت صنف کا آغاز اور تشکیل**''۔یہ کتاب ۳۸۲ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں پانچ باقاعدہ ابواب اور ایک تعارف اور ایک اختتامیہ شامل ہیں۔ان کی ہلکی سی جھلک ان ابواب کے عناوین اور ذیلی عناوین میں دیکھی جاسکتی ہے۔

''**تعارف**:ہندوستان کے ادبی اور ثقافتی تناظر میں اردو غزل۔صنف کے اعتبار سے غزل کی خصوصیات اور ''غزل کی دنیا''۔مطالعہ غزل کی خبر۔

باب اول:وقت کی رَو اور اُردو زبان:

اردو زبان کیا ہے؟ جغرافیائی پھیلاؤ اور اردو زبان کا ارتقا۔شمال سے جنوب کی طرف اور واپس شمال کی طرف اردو کا سفر۔اردو لفظ کے معانی۔اشعار میں محفوظ،تاریخی حافظہ۔رسم الخط پر کچھ باتیں۔

یورپ والے اور اردو۔فورٹ ولیم کالج، جان گلکرسٹ اور اردو۔ہندی، ہندوستانی اور اردو۔دورِ حاضرہ اور اردو۔بھارت، پاکستان اور دنیا۔

باب دوم:اردو غزل کا ابتدائی دور:

گیارویں تا چودھویں صدی میں شمالی ہندوستان بطور ایک ثقافتی خطہ۔اردو غزل کے آغاز سے متعلق:مفروضات۔امیر خسرو دہلوی۔اردو غزل پر شعریاتِ امیر خسرو کا اثر۔ریختہ غزل۔صدیوں پرانی بچ جانے والی ایک ابتدائی غزل۔اردو غزل کی ''ماقبل تاریخ'' کے بعض نتائج۔

باب سوم: اردو غزل کا بچپن

جنوب کی طرف سفر۔ پہلے پہلے دکنی شعرا اور ان کی غزلیں۔ فیروز بیداری، حسن شوقی محمود دکنی، محمد قلی قطب شاہ۔

دکنی میں فارسی غزل کا پہلا ترجمہ۔ یوسفِ گم گشتہ۔ دکن میں درباری غزل۔ بعض نتائج۔

باب چہارم: عبوری دور

۱۷ویں صدی کے آخر میں اورنگ آباد، دکن کا ثقافتی مرکز۔ ولؔی نام کا ایک شاعر۔ موجودہ غزل کا بنیاد گزار ولؔی۔ ابتدائی غزل کی دکنی صفات اور فارسی مثالوں کی روشنی میں ولؔی کے شعری پیکروں میں آمیزش و اختلاط۔ صوفیانہ غزل۔ سراج اورنگ آبادی۔

باب پنجم: اردو غزل کا شباب

اورنگ زیب کی حکومت کا خاتمہ اور دہلی کے ادبی حلقے۔ مرزا بیدل اور دوسرے۔ بعد از ولؔی کی دلّی۔ محمد شاہ کا دور۔ ریختہ شاعری کا دھماکہ۔ ادبی استادی اور شاگردی کی روایت۔ خان آرزو کا شیخ علی ہزین کے ساتھ ادبی معرکہ۔ ایہام گوئی کی تحریک: آبرؔو اور دوسرے۔ فیض دہلوی۔ آرزو کی اصلاحات اور اردو معلّٰی۔ صاف گوئی۔ مرزا جان جہاں مظہر۔ کلاسیکی عہد کی آمد آمد۔

اختتامیہ۔ ہندوستانی مشاعرہ: صوفیا کی خانقاہیں۔ شاہی دربار۔ شہر کے چوک۔

مشاعرہ کیا ہے؟ تاریخ پر ایک سرسری نظر، عربوں کے قدیم زمانے سے ہندوستان کے عہدِ قدیم تک۔ ہندوستان کے ابتدائی مشاعرے۔ کلاسیکی مشاعرے۔ ایک ''شاہی مشاعرہ''۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں مشاعرے۔ ایک جدید جھلک۔ آج کل کی غزل اور مشاعرہ۔۔۔'' [۴]

ڈاکٹر لدمیلا کی ایک نئی کتاب ابھی زیرِ تحریر ہے۔ یہ انڈو پاک سے باہر کے علاقوں میں اردو زبان میں تخلیق کئے جانے والے اُس ادب، شاعری اور افسانوی ادب کا مطالعہ ہوگا جو وطن سے دور بسنے والے لوگوں کی زندگی کا آئینہ معلوم ہوتا ہے۔ اس میں ان کے بنیادی سماجی، اقتصادی اور نفسیاتی مسائل منعکس ہو رہے ہیں۔ ان میں اپنی مادری زمین سے تعلق یا قطع تعلق اور مختلف سماجی اور تہذیبی ماحول میں اپنی نئی شناخت کی تلاش یا پرانی شناخت برقرار رکھنے کی کوشش جیسے مسائل پر ڈاکٹر لدمیلا خصوصی توجہ دینے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں دستیاب معلومات کے مطابق اس میں برِصغیر اور اس سے باہر کے ادب کے آپسی تعلق کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔ ڈائسپرا کا اردو ادب پاکستان اور ہندوستان

کے اردو ادب کا ایک حصہ ہے یا اس کی اپنی کوئی منفرد حیثیت اور کیفیت ہے؟ ان سوالات اور مسائل کا سامنا کرنے کے لیے بیرون برصغیر کے ممالک میں اردو کی ادبی تنظیموں کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے گا اور اردو میں نکلنے والے ادبی جرائد اور خاص طور پر بیرون برِصغیر سے نکلنے والے ادبی رسائل کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

چونکہ اس کتاب میں بیرون برصغیر سے شائع ہونے والے ادبی رسائل کا جائزہ بھی پیش کیا جانا ہے۔ اس لیے ''جدید ادب'' [۵] کے حوالے سے ڈاکٹر لدمیلا کو چند وضاحتیں درکار تھیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں ایک ای میل کے ذریعے استفسار کیا، میرے جواب سے ہمارے درمیان برقی مراسلت چل نکلی۔ یوں اس زیرِ تحریر کتاب کا علم ہوا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ ڈاکٹر لدمیلا کی اردو غزل کے ابتدائی دور پر کیے گئے کام پر مشتمل ۳۸۲ صفحات کی کتاب دسمبر ۲۰۱۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ یوں مجھے روسی زبان میں ہونے والے اس کام کا علم ہوا اور اب اسے اردو دنیا کے علم میں لا رہا ہوں۔ ہمارے درمیان جو برقی مراسلت ہوئی ہے، وہ میرے لیے بہت حوصلہ افزا رہی۔ ایک دو بار جب بھی ہماری کسی کانفرنس میں ملاقات ہوئی یا مجھے ان سے کسی کتاب پر رائے لینے کے لیے کہنا پڑا، انہوں نے ہمیشہ میرے ساتھ خلوص و محبت کا سلوک کیا۔ میری بے حد حوصلہ افزائی کی۔ ہماری حالیہ خط و کتابت سے بھی میرے تئیں ڈاکٹر لدمیلا کے خلوص اور محبت کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ''جدید ادب'' کے بارے میں ان کے محبت بھرے اور حوصلہ افزا الفاظ میرے لیے کسی سرمائے سے کم نہیں۔ اسی طرح میرے ادبی کام کو انہوں نے جس طرح سراہا ہے وہ خود ان کی اپنی علمی و ادبی بڑائی کا ثبوت ہے۔ ان کی طرف سے یہ خبر ملنا کہ وہ اپنی کتاب میں ''جدید ادب'' کا ذکر کر رہی ہیں اور اسے بیرون برصغیر کے ادبی رسائل میں بہت خاص اہمیت دینا۔ اسی طرح میرے ادبی کام کی تحسین اور میری بعض تخلیقات کے روسی ترجمہ کی اس کتاب میں شمولیت کی خبر، یہ میرے لیے ادبی خوشی کی بہت بڑی خبریں ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود اپنے سارے اردو اور روسی زبان میں کیے گئے کام کی تفصیل فراہم کرنے سے گریز، ان کی انکساری اور بے نیازی کا ثبوت ہے۔

اب ذیل میں ڈاکٹر لدمیلا کے ساتھ ہونے والی خط و کتابت یہاں پیش کر رہا ہوں۔ اس خط و کتابت کی اشاعت کے لیے میں نے ان سے اجازت بھی لے لی ہے۔

16.09.2016, 20:52

محترم حیدر قریشی صاحب، آج کل میں ایک کام میں مصروف ہوں جس میں آپ کی تخلیقات اور ادبی سرگرمیوں کا بھی ذکرِ خیر ہے۔اس سلسلے میں آپ سے دو، چار سوال کرنے ہیں۔ بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ کچھ باتوں کی وضاحت کریں۔آپ کی شخصیت اور فن پر اپنے مقالے میں منزہ یاسمین نے لکھا کہ "جدید ادب جرمنی" کا جو پہلا شمارہ ۹۹۹۱ء دسمبر میں نکلا تھا تو اس کے دو مدیران تھے: آپ اور کرسٹینا اوسٹر ہیلڈ۔لیکن اس کے بعد کرسٹینا کا کوئی ذکر نہیں ملا۔ وہ کب تک رسالے سے منسلک رہیں؟

اسی مقالے میں یہ بھی پڑھا کہ "جدید ادب جرمنی" مئی ۲۰۰۰ء تک جاری رہا اور اس کے بعد بند کر دیا گیا اور اس کی وجوہ آپ کے الفاظ میں بتائی گئیں۔لیکن میرے پاس ۲۰۰۵-۲۰۰۸ء تک کے شمارے موجود ہیں جو آپ کی مہربانی سے مجھے کتابی شکل میں ملتے رہے تھے،اس کے بعد اون لائن کے شمارے نظر آتے رہے۔شمارہ ۱۷ میں جولائی-دسمبر ۲۰۱۱ء کا ہے،اس کے اداریہ میں آپ نے "جدید ادب" کے ادوار کا ذکر کر کے "تیسرے دور کی تکمیل" کا علان کیا۔ اس سلسلے میں بھی آپ کچھ وضاحت کریں گے؟ کیا اب "جدید ادب" نہیں نکلتا ہے؟

آپ ٹھیک ٹھیک بتائیں کہ "جدید ادب جرمنی" ۱۹۹۹ء سے لے کر کب تک جاری رہا؟ کب تک کتابی شکل میں؟ کب سے اون لائن ڈالا گیا؟ آج کل اس کی کیا صورتِ حال ہے؟

اور ایک اور سوال۔آج جرمنی میں کوئی ادبی رسالہ نکلتا ہے؟ آپ کی نظر میں برِصغیر سے باہر کہاں اور کیا رسالے نکلتے ہیں جو آپ کی نظر میں قابلِ ذکر ہیں؟

آپ کی بہت مشکور رہوں گی۔

خیر اندیش، **لدمیلا**

Sep 18 at 12:00 PM

لدمیلا جی

آداب

آپ کے سوالات کا مختصر سا جواب تو یوں بنتا ہے کہ اکتوبر ۱۹۷۸ء میں جدید ادب خان پور کا پہلا شمارہ شائع کیا گیا جو کتابی سائز کے ۸۰ صفحات پر مشتمل تھا۔تاہم اشاعت کے دوران وقفے آتے رہے۔۱۹۸۱ء تک تو ہر دو مہینے بعد رسالہ نکال لیتے تھے،لیکن پھر وسائل نہ ہونے کے باعث وقفہ وقفہ سے

اسے شائع کرنا شروع کیا۔خانپور کے دور میں عام شمارہ ۸۰ صفحات کا ہوتا تھا،۱۶۰،۲۶۰ اور ۳۱۲ صفحات کے شمارے بھی شائع کیے گئے اور اُسی دور میں ۵۰۰ صفحات کا ایک شمارہ بھی شائع کیا گیا۔موجودہ دور میں عموماً ۲۵۰ صفحات کے لگ بھگ شمارہ ہوتا ہے لیکن شمارہ نمبر ۱۴ تین سو ساٹھ صفحات تک بھی چلا گیا ہے۔ جبکہ میرا جی نمبر ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔

پاکستان میں ۱۹۸۶ء تک رسالہ جیسے تیسے نکلتا رہا۔پھر بند ہو گیا۔جرمنی آنے کے بعد ۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۰ء میں دو شمارے شائع کیے۔اس دور میں ڈاکٹر کرسٹینا بھی ادارت میں شامل تھیں۔لیکن جرمنی میں رہ کر پاکستان سے رسالہ چھپوانا مشکل تجربہ تھا۔رسالے کے مواد پر میری پوری کمانڈ نہ تھی،رسالہ پاکستان سے چھپتا تھا اور وہاں کے دوست اس میں بہت کچھ اپنی مرضی کا شامل کر لیتے تھے۔چنانچہ دو شماروں کے بعد اسے بند کر دیا۔

انٹرنیٹ پر متحرک ہونے کے بعد اور ان پیج کی سہولت ملنے کے بعد پھر ۲۰۰۳ء میں جدید ادب کو ششماہی رسالہ کے طور پر شائع کرنا شروع کیا۔تب سے جولائی ۲۰۱۲ء تک رسالہ جاری رہا۔اس کے ۱۹ شمارے شائع ہوئے۔۱۹واں شمارہ جو معمول سے ڈبل ضخیم ہو گیا تھا میرا جی نمبر ہے۔

مجموعی طور پر خانپور کے دور میں ۱۷ شمارے، جرمنی میں پہلے دور میں دو شمارے، اور دوسرے دور میں ۱۹ شمارے چھپ چکے ہیں۔میرا جی نمبر کے بعد رسالہ بند کر دیا تھا۔وجہ بہت سادہ سی ہے۔انڈو پاک دونوں ملکوں میں کتابوں کی ترسیل بے حد مہنگی کر دی گئی ہے۔رسالے پر جتنی لاگت آتی تھی ڈاک خرچ اس سے بھی زیادہ ہو گیا تھا۔ایسے حالات میں رسالہ بند کر دینا ہی مناسب لگا۔

میرا خیال ہے کہ جدید ادب سے متعلق آپ کے سارے سوالوں کا جواب اس خط میں آ گیا ہے۔میں سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب ''انٹرویوز'' کی ان پیج فائل بھی بھیج رہا ہوں۔اس کے صفحہ نمبر ۱۹۸ سے آخر تک عاصم بٹ،عزیز نبیل اور سعید الرحمٰن کے لیے ہوئے تین انٹرویوز میں بھی شاید آپ کو کچھ مطلوبہ مواد مل جائے۔چاہیں تو دیکھ لیں۔ان پیج فائل کھول نہ سکیں تو اس کی پی ڈی ایف فائل فراہم کر دوں گا۔

جرمنی سے فی الوقت تو کوئی ادبی رسالہ نہیں نکل رہا۔مغربی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف رسائل نکلتے رہے ہیں۔ان میں بعض معیاری تھے اور بعض بہت ہی سطحی سے تھے۔اس وقت بھی یہی منظر نامہ ہے۔ مزید کسی وضاحت کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔

والسلام
آپ کا مخلص
حیدر قریشی

Sep 19 at 9:56 PM

محترم حیدر قریشی صاحب،

آپ کے تفصیل جواب کے لیے بیحد شکریہ۔

جہاں تک 'جدید ادب" کے خانپور کے دور کی بات ہے تو اس کی پوری داستان مجھے معلوم ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے اہلِ ادب سے آپ کے روابط، مالی سمیت وہ ساری مشکلات بھی جو آپ کو رسالہ نکالنے کی راہ میں عبور کرنا پڑیں اور آپ کی اَن دیکھی قوتِ ارادی اور استقلال، سب معلوم، اور اس سب کچھ سے میں بہت ہی متاثر ہوئی ہوں۔ برِصغیر سے باہر شائع ہونیوالے جریدوں پر، جو ستر کے عشرے سے لے کر آج تک نکالے جاتے تھے، میرے مطالعہ، جائزہ میں آپ کا کردار اور آپ کا "جدید ادب" مرکزِ توجہ ہے۔ آپ کا ایک مثالی فقرہ جو "جدید ادب" کے شمارہ نمبر ۱۷، ۲۰۱۱ء کے اداریہ میں درج ہے، آپکی ادبی سرگرمیوں کی بہترین وضاحت ہے، جس پر خاص زور دیئے بغیر نہیں رہا جاتا ہے کہ "میں کوئی ادبی خدمت نہیں کر رہا بس اپنی زندگی اور ادبی زندگی بسر کر رہا ہوں"۔ کیا خوب آپ نے کہا۔

آپ نے میرے سب سوالوں کے جواب دئے۔ ایک اور سوال اٹھا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان سے رسالہ بھیجنے بھجوانے کی مشکلات کی بات تو واضح ہے، لیکن کیا انٹرنیٹ پر ہی رسالہ جاری رکھنا بھی مشکل تھا؟ اس معاملے میں میری معلومات صفر ہیں لیکن یہ سنا کہ بعض رسالے انٹرنیٹ پر ہی پڑھے جاتے ہیں۔ "جدید ادب" کا پوری طرح بند ہونا اردو دنیا کے لیے نہایت افسوس ناک بات معلوم ہوتی ہے۔

سب حوالوں کے لیے بہت شکریہ۔ وہ سب اچھی طرح کھل جاتے ہیں۔ ان میں سے کئی سارے میں پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔ افسوس کہ سعید شباب کی مرتب کردہ کتاب ''انٹرویوز'' کی ان پیج فائل نہیں کھل پائی ہے۔ اس پر آتا ہے:

downloaded.becannotandcontentharmfulcontainmayemailthisinAttachments

اگر پی ڈی ایف فائل فراہم کرنے میں زیادہ مشکل نہ ہو تو مجھے بھیج دیں، بہت مہربانی ہوگی۔

آپکی شکر گزار اور خیر اندیش،
لدمیلا

Sep 19 at 10:28 PM

لدمیلا جی

آپ کی ای میل میرے تئیں آپ کی محبت اور حوصلہ افزائی کی غماز ہے، اس کے لیے آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ جدید ادب کو انٹرنیٹ پر پیش کیا جا سکتا ہے لیکن مجھے کتابی صورت کے بغیر انٹرنیٹ ایڈیشن میں بہت ادھورا پن محسوس ہوتا ہے. دوسرے رسائل کا اپنا معاملہ ہے

کتاب انٹرویوز بھیج رہا ہوں. یہ پی ڈی ایف فایل ہے۔ ویسے یہ کتاب اور اس نوعیت کی بعض دوسری کتابیں اس لنک پر دستیاب ہیں شاید یہ لنک آپ کے علم میں ہو۔

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

والسلام
آپ کا مخلص
حیدر قریشی

Sep 20 at 7:31 AM

آپ کے ادبی اور تعلیمی کام کی تفصیل کو ایف کی صورت میں موجود ہو تو عنایت کر دیں۔
شاید مجھے آپ کے کام کے حوالے سے ایک مضمون لکھنے کی توفیق مل جائے۔
حیدر قریشی

Sep 20 at 9:13 PM

محترم حیدر قریشی صاحب،

آپ کے دونوں ای۔میل ملے ہیں، شکر گزار تو میں آپ کی ہوں۔ اب میرے پاس انٹرویوز کی کتاب بھی ہے، بہت شکریہ۔

عامر سہیل نے مجھے اپنی کتاب اس کے نکلتے ہی بھیجی تھی، مجھے خوشی ہے کہ ان کو میری تحریر، جو فلیپ پر آئی ہے، پسند آئی۔

انٹرنیٹ ایڈیشن میں ادھورا پن آپ کو محسوس ہوگا سہی لیکن پورا نہ ہونے پر ادھورا بھی شاید برا نہیں۔ خیر، یہ تو آپ ہی جانیں۔ مجھے افسوس ہے کہ اس قدر معیاری رسالہ تاریخ کے طاق پر آیا ہے۔ لیکن جس کے پاس اس رسالے کے کتابی شمارے ہیں اس نے ضرور گھر کی لائبریری میں ان کو ایک نمایاں جگہ پر رکھا ہوگا۔ کم از کم میں اپنی بات بتا رہی ہوں۔ جب کچھ پڑھنے کو جی چاہتا ہے اکثر "جدید ادب" کا کوئی شمارہ اٹھا لیتی ہوں۔ اپنے کام کے لیے بھی کافی مواد ملتا ہے۔

آپ نے لکھا کہ " دوسرے رسائل کا اپنا معاملہ ہے"۔ اس سے کیا مراد ہے؟ کیا آپ کوئی اور رسالہ نکالتے ہیں یا؟''

جہاں تک میرے کام کی بات ہے تو یہی ہماری مصیبت ہے کہ یہاں سارا کا سارا کام اپنی روسی زبان میں ہوتا ہے۔ جب کبھی کسی باہر کے رسالے یا مجموعے کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش آتی ہے تو اسی صورت میں الگ سے وقت نکال کر دوسری زبان میں لکھنا یا کسی اپنے روسی مضمون کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔ اسی لیے تو اردو دنیا ہمارے کام سے تقریباً بے خبر رہتی ہے۔ یہ نہ صرف اردو کا مسئلہ ہے، بلکہ سب روسی ادیبوں، تحقیق کاروں وغیرہ کا مسئلہ بھی ہے۔ بلکہ ہر ملک کا جس میں صرف اپنی زبان چلتی ہے۔

ابھی حال ہی میں اردو غزل کے ابتدائی دور پر میری کتاب شائع ہوئی ہے۔ وہ ۳۸۲ صفحات کی ہے۔ یہاں جن لوگوں نے پڑھی کافی پسند کی کیونکہ روس کے لیے یہ بالکل نیا مضمون ہے۔ لیکن اس کتاب کے سچے قدر دان اردو والے ہی ہو سکتے ہیں۔ کتاب اردو یا انگریزی میں ترجمہ کی جائے تو وہ منظر عام پر آئیگی ۔لیکن کتاب کا ترجمہ بہت وقت طلب کام ہے۔ کون کریگا؟۔۔۔ اگر آپ کو دلچسپی ہو تو اس کے انگریزی میں مختصر سے کوائف اور ابواب کی فہرست دیکھیں۔ اور سرورق کی تصویر بھی بھیج رہی ہوں، اس پر نظر ڈالیں۔

آپ کی خیر اندیش،

لدمیلا

Sep 20 at 10:23 PM

لدمیلا جی

ای میل ملی شکریہ

میں نے جن دوسرے رسائل کا ذکر کیا تھا ان سے مراد دوسرے ایڈیٹرز کے ادبی رسائل تھے۔ میں خود کوئی اور رسالہ نہیں نکالتا البتہ جو رسائل تعاون مانگتے ہیں ان کے ساتھ تعاون کرتا ہوں۔

آپ نے اب جو غزل پر اپنی کتاب کا خلاصہ بھیجا ہے اس کا اردو ترجمہ جلد ہی ہو جائے گا اور پھر اسے سرورق سمیت بعض ویب سائٹس پر دے دوں گا۔

آپ کے کوائف جن میں آپ کے سارے کام کا احاطہ کیا گیا ہو۔ ان کا منتظر رہوں گا۔ اور ہاں کیا ادبی رسائل والی کتاب بھی روسی زبان میں لکھ رہی ہیں یا اردو میں؟

آپ کے ساتھ ایک اچھی خبر شیئر کرنے لگا ہوں۔ اردو میں تو میرے کام پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی کے کام ہو چکے ہیں۔ اب مصر سے ازہر یونیورسٹی میں کوئی جوان میری شاعری پر ایم اے کا مقالہ لکھ رہا ہے۔ اس کام میں اس نے میرے چار مجموعوں کا عربی ترجمہ بھی کیا ہے۔ مقالہ عربی میں ہوگا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔

والسلام

حیدر قریشی

Sep 22 at 7:49 PM

محترم حیدر قریشی صاحب، تسلیمات۔

آپ کی ای میل کا بہت شکریہ۔

بہت خوشی کی بات ہے کہ اتنے لوگوں کی توجہ آپ کی تخلیقات پر مرکوز ہیں۔ آپ کو اس پر تہہ دل سے مبارک باد دیتی ہوں۔

جہاں تک میری کتاب کے خلاصہ کی بات ہے تو میں نے اسے آپ کو آپکی معلومات کے لیے ہی بھیجا تھا، اس کے ترجمے وغیرہ کا کوئی خیال میرے ذہن میں تھا ہی نہیں۔ آپ نے اس سلسلے میں ایک نیک ارادہ جو کیا ہے، بہت شکریہ۔ سچ پوچھیے تو مجھے صرف اسی بات پر خوشی ہوگی کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ روس میں بھی اردو زندہ ہے اور اس پر کام جاری ہے، بس۔ آپ کا جو میری تحریروں پر کچھ لکھنے کا نیک خیال ہے، یہ

آپ کے مہربان رویے کا اظہار ہے اس کے لیے بھی آپ کی بہت مشکور ہوں۔لیکن اس کی میرے خیال میں قطعی ضرورت نہیں۔آپ نے فیض پر میری کتاب پر جو تبصرہ شائع کیا وہ الگ بات ہے، کتاب اردو میں تھی، مدِنظر تھی۔لیکن کسی تخلیق کے مختصر سے تبصرے کی بنا پر رائے قائم کرنا؟۔۔اگر کبھی خدا کی مرضی ہوئی کہ میری غزل پر کتاب کا یا کسی اور چیز کا ترجمہ ہو جائے تو میں خود آپ سے اس پر لکھنے کی ضرور درخواست کروں گی۔

میری نئی کتاب جو میری انسٹیٹیوٹ کے تین سالہ منصوبے میں شامل ہے ہمارے یہاں ہر کام کی طرح روسی میں ہی لکھی جا رہی ہے۔یہ کتاب برصغیر کے باہر اردو ادب پر ہوگی یعنی جسے پہلے "نئی بستیوں کا ادب "اور اب اکثر "مہجری ادب" کہتے ہیں۔یورپ اور امریکہ میں جاری ہونے والے اردو کے ادبی رسائل کا جائزہ میرے کام کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اردو ڈاسپرا کے ادبی زندگی کی ایک جھلک واضح ہے کہ آپ کی ادبی سرگرمیوں اور تخلیقات پر روشنی ڈالے بغیر یورپ میں اردو کی ادبی زندگی پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ابھی حال میں آپ کی ایک نظم کا ترجمہ کیا جو "اثبات" کے شمارہ ۴-۵ میں ملا۔غالباً یہ ۲۰۱۰ کا شمارہ ہوگا۔ افسوس کہ ابھی تک کئی ہندوستانی ناشروں نے اشاعت کا سال نہ لکھنے کی اپنی قدیم زمانوں سے چلی آنیوالی عادت چھوڑی نہیں۔اس رسالے میں مجھے کچھ اور دیکھنا تھا لیکن یہ نظم جو نظر آئی، اسی پر رک گئی اور اس کا ترجمہ کیے بغیر نہیں رہ سکی۔اس کا نام ہے "درد"۔ بہت پسند آئی۔اس کو بھی آپ کی دوسری نظموں اور غزلوں کے ساتھ کتاب میں شامل کروں گی۔یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ میرے پاس آپ کی بہت ساری تخلیقات موجود ہیں۔ایک بات بتاؤں؟ آپ کی مثلاً" یہ نظم اور آپکی دوسری نظمیں اور غزلیں آپ کی شاعرانہ صلاحیت اور آپ کے خیالات و جذبات کے بارے میں مجھے عامر سہیل کی کتاب کے مقابلے میں بہت زیادہ بتاتی ہیں۔اسی لیے میں کہتی ہوں کہ کسی تخلیقی کام کا، اصلی مواد کی بنا پر ہی جائزہ لینا چاہیئے۔

آئندہ بھی اگر کوئی سوال ہوگا تو آپ کی اجازت سے کروں گی۔

پرخلوص تمناؤں کے ساتھ،

لدمیلا۔

لدمیلا جی

مصر میں ہونے والے کام پر آپ کی مبارک باد کے لیے شکر گزار ہوں۔روس میں اردو کے زندہ ہونے کا بتانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے سارے کام کی تفصیل موجود ہو۔اسی لیے اس کا تقاضا کر رہا ہوں۔ آپ کی اردو غزل والی کتاب کا انگریزی تعارف نامہ شاید اگلے دو تین روز میں اردو ترجمہ بھی ہو جائے اور کسی ویب سائٹ پر شائع بھی ہو جائے۔مزید کاروائی پھر ہوتی رہے گی۔یہ سب کچھ اردو والوں کے سامنے آئے گا۔

فیض صاحب پر آپ کی کتاب پر اپنے مختصر سے تبصرہ میں، میں نے یہ دوٹوک بات لکھی تھی: ''کاش فیض کے پاکستانی اور انڈین مداح بھی فیض پر اسی پائے کی کوئی کتاب لکھ سکیں۔''

یہ ''کاش'' ابھی تک ''کاش!'' ہی ہے۔

میں تو آپ کی اس خبر سے ہی خوش تھا کہ آپ برصغیر سے باہر کے ادبی رسائل پر کام کر رہی ہیں۔یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ یہ کام تو صرف ایک حصہ ہے جبکہ آپ برصغیر سے باہر کی اردو دنیا پر پوری کتاب لکھ رہی ہیں۔پھر اسی حوالے سے جدید ادب کے بارے میں اور میرے تئیں آپ کی محبت اور اخلاص کا اظہار، ذکرِ خیر بھی اور شاعری کا روسی زبان میں ترجمہ بھی، اتنی خوشیاں۔۔۔۔۔سچی بات ہے میرا دامن چھوٹا پڑ گیا ہے۔(میں ایسی خوشیوں پر اپنے جذبات کو چھپاتا نہیں ہوں۔ہمیشہ اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتا ہوں) اللہ آپ کو خوش رکھے اور صحت تندرستی والی زندگی عطا کرے۔آمین۔

امید ہے آپ صحت و عافیت سے ہوں گی۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

یہ ملی جلی سی تحریر میری طرف سے سوویت یونین اور پھر روس میں اردو زبان و ادب کی مسلسل خدمت کرنے والی علمی و ادبی شخصیت ڈاکٹر لدمیلا کی علمی و ادبی خدمات کا ہلکا سا اعتراف ہے۔

Sep 24 at 3:38 PM

حوالہ جات

۱ https://en.wikipedia.org/wiki/Ludmila_Vassilyeva

۲ ''پرورشِ لوح وقلم۔فیض احمد فیض: حیات اور تخلیقات'' مصنفہ ڈاکٹر لدمیلا۔تاثرات شمیم حنفی۔ص ڈ۔(نئی دہلی:۱۴جون ۲۰۰۶ء)

۳ https://themuslimtimes.info/2016/10/14/ludmila-vassilyeva-russian-scholar-expert-on-urdu-poetry-literature/

۴ اقتباس از خاکہ ''اُردو غزل بحیثیت صنف کا آغاز اور تشکیل'' ترجمہ کردہ: عامر سہیل http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=1783

۵ جدید ادب جرمنی کا لنک۔ http://jadeedadab.blogspot.de/

مطبوعہ

یونیورسٹی جرنل **''تحقیقات''**۔شمارہ نمبر۲۔وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد۔جولائی تا دسمبر ۲۰۱۶ء

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Articles&article=1786

مت سہل ہمیں جانو۔۔۔۔۔مطالعۂ میرؔ کا ایک انداز

عبداللہ جاوید کینیڈا میں مقیم ایک اہم ادبی شخصیت ہیں۔انگریزی اور اردو میں ایم اے کرنے کے بعد پہلے انگریزی کے استاد ہوئے پھر اردو کے پروفیسر ہو گئے۔۱۔۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔علامہ اقبال پر ایک کتاب **بیادِ اقبال** کے علاوہ ابھی تک ان کے تین شعری مجموعے **موج صد رنگ**، **حصارِ امکاں** اور **خواب سماں** اور افسانوں کا مجموعہ **بھاگتے لمحے** شائع ہو چکے ہیں۔۲۔اور اب کہ ۸۳ سال کے ہو گئے ہیں تو ان کی ایک انوکھی کتاب **مت سہل ہمیں جانو** (**آیئے میرؔ پڑھیے**) شائع ہوئی ہے۔

میرؔ کی شاعری کی تفہیم اور تعبیر کے حوالے سے گزشتہ دو سو سال کے عرصہ میں بہت سارا کام ہو چکا ہے۔بہت سارے قابلِ قدر کام کے ساتھ مطالعۂ میرؔ کا ایک وہ انداز بھی ہے جو روایتی طور پر اتنا دہرایا جا چکا ہے کہ اب وہ میرؔ کا درسی مطالعہ بن کر رہ گیا ہے۔تاہم اپنی تشریحی تکرار کے باوجود اس مطالعہ کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے۔شمس الرحمٰن فاروقی کے **شعر شور انگیز** تک آتے آتے میرؔ کی تفہیم اپنے کمال کو پہنچ گئی۔اس کے بعد مطالعۂ میرؔ کی طرف آنا اور کسی نئے انداز سے بات کرنا بجائے خود ایک بڑا چیلنج تھا۔لیکن عبداللہ جاوید نے میرؔ ہی کے ایک شعر کے مطابق اس چیلنج کو قبول کیا۔

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اُس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا

مت سہل ہمیں جانو (**آیئے میرؔ پڑھیے**) اپنے اندازِ بیان کے لحاظ سے ایک غیر رسمی اور غیر روایتی مطالعہ ہے۔ایسے لگتا ہے کہ عبداللہ جاوید باتوں باتوں میں میرؔ کو پڑھتے جا رہے ہیں اور اس پر اظہارِ خیال کرتے جا رہے ہیں۔کہیں ان کا بیان پوری طرح نہیں کھلتا اور کہیں اتنی وضاحت کے ساتھ بات کرتے ہیں کہ لگتا ہے کلاس روم کے طلبہ کو سمجھا رہے ہیں۔اس کے باوجود مطالعۂ میرؔ محض درسی مطالعہ بن کر نہیں رہ جاتا۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے عبداللہ جاوید کے مطالعہ کی ایک جہت یوں دریافت کی ہے۔

''**مت سہل ہمیں جانو** میں عبداللہ جاوید نے عصری ادبی و سماجی رُجحانات اور فکری و نظری

عناصر کو میرؔ کے اشعار کی تفہیم کے لیے خوبی سے برتا ہے۔ عبداللہ جاوید خود شاعر ہیں اور ایک حساس اور باشعور انسان ہیں۔ میرؔ کے اس مطالعے سے ہمیں اُن کے ذوق کا اندازہ بھی ہوتا ہے اور ان کی تنقیدی بصیرت کا بھی۔ اُن کا مطالعہ وسیع ہے اور ماشاء اللہ حافظہ بھی قوی ہے۔ اس لیے وہ دوسرے اساتذہ کے اشعار اور دوسری زبانوں کے ادبی حوالوں کو بھی برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح یہ مطالعہ صرف تفہیمِ میرؔ تک محدود نہیں رہتا بلکہ قاری کے وسیع ادبی ذوق کی سیرابی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔''[۳]

میں نے ابھی کلاس روم والے انداز کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ محض درسی مطالعہ نہیں رہتا۔ اس کی ایک جھلک اس اقتباس میں دیکھیں:

''تھا وہ تو رشکِ حورِ بہشتی ہمیں میں میرؔ
سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا (ص۔۵۲)

اس شعر پر بات تو ہوسکتی ہے لیکن فی الحال میں آپ کی توجہ 'رشکِ حورِ بہشتی' کی ترکیب میں 'حور' کے لفظ پر مرکوز کرنا چاہوں گا۔ بہشت میں تو غلمان بھی ہوں گے لیکن میرؔ جی 'حور' کا ذکر کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔ کیا اُن کے اس انتخابِ ترجیحی سے 'اسی عطار کے لونڈے' کے انتخاب سے پیدا شدہ شدت میں کمی نہیں آتی؟

اسی شعر میں 'حور' کی رعایت سے 'تھا' کی جگہ 'تھی' ہونا چاہیے تھا لیکن اگر میرؔ صاحب 'تھی' لکھتے تو اس وقت کا معاشرہ اس 'تھی' کو برداشت کرنے والا نہ تھا۔ احتمال تھا کہ تلواریں کھنچ جاتیں۔ 'تھا' سے 'تھی' تک کا سفر حکیم مومن خاں مومنؔ کی جسارت سے طے ہوا اور اخترؔ شیرانی نے تو بعد میں 'تھی' کی 'تھا تھک ☆ تھیا' ہی مچادی۔ اسی ایک 'تھا' اور 'تھی' کے معاملے کو سامنے رکھ کر اس صورتِ حالات کی تصدیق کی جاسکتی ہے کہ شعر، ادب اور آرٹ معاشرے کے جبر کے آگے سر نہیں جھکاتے، معاشرہ بالآخر شعر، ادب اور آرٹ کے آگے جھک جاتا ہے۔ اس مرحلے پر میں یہ معاملہ صاف کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارے شاعر، ادیب اور فن کار کسی دور میں ☆ کلی طور پر امرد پرستی میں مبتلا نہ تھے۔ اردو کے مذکورہ تین بڑے شاعروں میں ایک بھی امرد پرست نہیں تھا۔ فارسی والے بھی عام خیال کے برخلاف اکثر و بیشتر ''یک زن بگیر'' کے قائل رہے ہیں اور ہیں۔

میرؔ جی کے رشکِ حورِ بہشتی والے مصرعے میں 'ہمیں میں' کا اصرار ملتا ہے اور دوسرے مصرعے میں 'سمجھے نہ ہم' سے قاری کو خبردار کر دیا جاتا ہے کہ کوئی معاملہ سمجھنے کے لائق موجود ہے۔ 'ہمیں میں' سے یہ مراد لی

جاسکتی ہے کہ وہ رشکِ حورِ بہشتی ہم ہی لوگوں میں موجود تھا اور یہ بھی کہ وہ ہمارے اپنے اندر تھا۔ ہمارے ذہن، دل یا روح میں مکیں تھا۔''[۴]

عبداللہ جاوید کے ہاں میرؔ کو پڑھنے اور سمجھنے، سمجھانے کا ایک انداز یوں ظاہر ہوتا ہے۔

''چھٹی غزل کا یہ شعر:

کہا میں نے کتنا ہے☆ گل کا ثبات
کلی☆ نے یہ ☆سن کر تبسم کیا

لفظ 'تبسم' کو غالبؔ کی زبان میں ''گنجینۂ معنی کا طلسم'' کہہ سکتے ہیں یا پھر مجھ بے زبان کی زبان میں حسیا☆تی معنویت کی کلید۔ کلی نے تبسم کیا سے مراد یہ لی گئی ہے کہ کلی ☆ کھل گئی، پھول بن گئی اور پھول بن کر شاعر کے سوال کی زد میں آ گئی۔ شاعر نے سوال کیا تھا کہ پھول کی دنیا میں زندگی کتنی ہے؟ شاعر نے اس کی صراحت بھی نہیں کی ہے کہ وہ حقیقت میں کس سے مخاطب ہے؟ اس کی مخاطب کلی نہیں ہے۔ شاید پھول بھی نہیں ہے۔ کلی نے شاعر کی بات سنی ہے اور اس کی بات یا سوال پر وہ مسکرانے پر مجبور ہوگئی۔ اس کی یہ مسکراہٹ جو 'تبسم' کے لفظ میں آ کر تہہ دار اور پرت پرت ہوگئی ہے، طنزیہ بھی ہوسکتی ہے۔ طنز شاعر کے سوال اور سوچ پر ہوسکتی ہے، صورتِ حالات پر، زندگی کی ناپائیداری پر بھی عین ممکن ہے۔

میرؔ کے اس تہہ دار، پہلودار، کانٹے دار ننھے مُنے معصوم سے شعر کے بعد ہم سے زیادہ قریبی زمانے کے شاعر جوشؔ ملیح آبادی کے مندرجہ ذیل قطعے پر بھی نظر ڈال لیجیے:

غنچے تری زندگی پر دل ہلتا ہے
بس ایک تبسم کے لیے☆ کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس جہاں میں بابا
یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

مندرجہ بالا قطعے نے اکثر اوقات جوشؔ صاحب کے لیے مشاعرہ☆ لوٹا ہے۔ مقبول بھی بہت ہوا ہے۔ ان اشعار میں حسیا☆تی شدت ہے، توانا ابلاغ ہے، فکر اور جذبے کا رچاؤ ہے اور دانائی و حکمت ہے، لیکن یہ الگ حقیقت ہے کہ اس میں شاعری تو ہے لیکن میرؔ کے شعر کی سی عالیہ شاعری نہیں ہے۔ زندگی کی ایک حقیقت کا بلند آہنگ بیان ہے، لیکن زندگی کی اسی حقیقت کا تہہ دارانہ ابلاغ نہیں ہے۔ جوشؔ اپنی تمام تر توانائیِ ابلاغ کے باوجود سطح پر کھڑے ہیں جب کہ میرؔ زندگی کی اسی حقیقت کی ممکنہ وسعتوں، بلندیوں اور

گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ میں بار بار یہ عرض کرتا پایا جاؤں گا کہ میرؔ کا شعر مکمل نہیں ہوتا، جاری وساری رہتا ہے۔ اُن کے دیوان سے قاری کے قلب و ذہن کے ایوان میں — لفظ کا شبدھ کا کوئی اَنت نہیں۔ لفظ، شبدھ کی پہنچ اس ذاتِ حقیقی تک ہے جو 'اللہ' ہے اور بے لفظ، اشبدھ ہے۔ جو وہ سوچتا ہے، ہو جاتا ہے۔''۵

میرؔ کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنی تفہیم کے آخر آخر میں تو ایسے لگتا ہے جیسے عبداللہ جاوید، میرؔ کے ہم قدم ہو کر چل رہے ہیں۔ ایک اور شعر کی تفہیم کرتے ہوئے عبداللہ جاوید پہلے میرؔ کے زمانے میں جاتے ہیں اور پھر کہیں سے ہوتے ہوئے کہاں جا پہنچتے ہیں۔

''لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا (ص۔۶۲)

میرؔ کے عہد میں شیشہ گر منہ سے پھونک کر شیشے کے ظروف بنایا کرتے تھے اور اس دوران سانس پر قابو رکھتے تھے۔ میرؔ نے اپنا استعارہ یا امیج اس سے لیا ہے اور آفاق پر پھیلا دیا ہے۔ اب جب کہ شیشہ گری کا عمل مشینوں کی مدد سے پورا کیا جاتا ہے، شعر ہنوز اپنی پوری تخلیقی توانائیوں کے ساتھ زندہ و پائندہ ہے۔ آفاق کی کارگہِ شیشہ گری اپنی تمام تر نزاکتوں کے ساتھ اب بھی، اس لمحۂ موجود میں بھی مصروفِ بکا رہے۔ ''لے سانس بھی آہستہ'' کی پابندی یا شرط آج بھی، اب بھی برقرار ہے۔ غزل کا مقطع ایک پامال مضمون کا حامل ہے۔ لیکن مصرعِ اوّل اس میں نئی روح پھونک رہا ہے۔ اس کو میریت کہنا پڑتا ہی ہے:

☆ ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا (ص۔۶۲)

دوسرا مصرع پڑھنے والے کے ذہن و دل کا مدتوں تعاقب haunt کرتا ہے۔ 'چراغِ سحری' کو اردو شاعری میں خوب خوب باندھا ہے اور ستارۂ سحری کو بھی شاید اس وقت تک جب اس نے فراقؔ گورکھ پوری کو آنکھ نہیں ماری لیکن میں یہاں نظیرؔ اکبر آبادی کا وہ شعر درج کرنا چاہتا ہوں جس کو پہلی مرتبہ کسی سے سن کر یہ سوچ لیا کہ میرؔ کا شعر ہے:

ملو جو ہم سے تو مل لو کہ ہم بہ نوکِ گیاہ
مثالِ قطرۂ شبنم، رہے رہے، نہ رہے

درج بالا شعر میرے ساتھ ساتھ جی رہا ہے۔''۶

عبداللہ جاوید نے میرؔ کے ہاں جا بجا استعاراتی اور علامتی (تلمیحاتی) طرزِ اظہار کی نشان دہی کی ہے حتیٰ کہ تجرید کی پرچھائیوں کو بھی چھوا ہے۔ لیکن ان کی مشہور غزل

ہستی اپنی حباب کی سی ہے
یہ نمائش سراب کی سی ہے

پوری کی پوری غزل تشبیہاتی سطح پر آئی ہوئی ہے۔ عبداللہ جاوید نے اس غزل کو درج کیا ہے لیکن پھر اسے ''پھول سی غزل'' ۷ کہہ کر آگے چل دیئے ہیں۔ اگر درجہ بندی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو استعارہ اور علامت کے سامنے تشبیہ کم تر درجہ پر رہتی ہے۔ میرؔ کی پوری غزل کا تشبیہاتی سطح پر رہ جانا کیا ردیف کی مجبوری تھی یا اس میں کوئی اور بھید پنہاں تھا؟ میرا خیال تھا کہ عبداللہ جاوید اس نکتہ پر کچھ دیر کے لیے رُکیں گے۔ کچھ بتائیں گے لیکن شاید ان کی توجہ اس طرف نہیں گئی۔

چلیں اب عبداللہ جاوید کے ساتھ میرؔ کے تین اشعار کا مختصر مختصر مطالعہ کرتے ہیں۔

''آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ (ص۔۳۳۱)

آگ کی آخری منزل خاک (راکھ) ہی تو ہے۔ امیج کے مطابق معاملہ یوں ہے۔ استعاراتی رمزیت پر غور کرتے ہیں تو عشق اپنے مرحلۂ آغاز پر کچا، خام اور وارفتہ ہوتا ہے جیسے آگ جب بھڑکتی ہے تو قابو اور قیاس سے باہر ہوتی ہے، لیکن بعد میں دھیمی اور سرد پڑتے ہوئے راکھ ہو جاتی ہے لیکن کون فراموش کر سکتا ہے کہ یہ اس کی انتہا کا مرحلہ ہے۔ اس مرحلے تک پہنچتے پہنچتے سب کچھ جل کر مشتِ خاک میں بدل جاتا ہے۔ آگ مرحلۂ اوّل ہے اور خاک مرحلۂ آخر ہے۔ آگ زینے پر پہلا قدم ہے اور خاک معراج ہے۔''۸

''تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت'' والا معاملہ ہے اور '☆ چپ' کا مرحلہ آ چکا ہے:

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے
جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

'حسرتِ دیدار' کو مصور کرنے کا انداز ملاحظہ کریں۔ تجرید کی کس طرح تجسیم کی گئی ہے۔''۹

''خاک تھی موج زن جہاں میں اور
ہم کو دھوکا یہ تھا کہ پانی ہے

میرؔ نے پانی کو بھی مٹی کر چھوڑا ہے جب کہ یہ ثابت ہے کہ کرۂ ارض پر تین حصے پانی اور ایک حصہ خشکی ہے۔ جب ہماری اصل مٹی ہے تو پانی کی اصل بھی مٹی ہوئی۔'' [۱۰]

مطالعۂ میرؔ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے عبداللہ جاوید نے کئی بڑے حساس اور اہم موضوعات کو چھوا ہے۔ الٰہیات، روحانیت، فقیری، درویشی، جدید فلاسفی، جدید سائنس، نور کی ماہئیت اور اس کے مختلف پرت، نراکار حقیقت سے ساکاری عقائد تک کو میرؔ کی شاعری کے توسط سے سمجھنے کی کاوش کی ہے۔ ان میں سے بیشتر موضوعات ایسے ہیں جن پر میری ان سے کھل کر گفتگو ہوا کرتی ہے۔ لیکن مطالعۂ میرؔ میں انہوں نے جتنا کچھ بیان کیا ہے، شاید اتنا ہی احاطۂ تحریر میں لانا ممکن تھا۔ کتاب کے آخر میں عبداللہ جاوید نے ایک دلچسپ تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے میر تقی میر کی نظمیں کے عنوان سے ۲۵ آزاد نظمیں (ادب، احترام اور معذرت کے ساتھ) پیش کی ہیں۔ یہ تجربہ کسی وضاحت کے بغیر پیش کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے ایسا لگا ہے کہ یہ بعض نظم نگاروں کو ایک رنگ میں پیغام دیا گیا ہے۔ اصلاً جدید نظم کی اردو غزل سے نہ کوئی مخاصمت ہے، نہ کسی نوعیت کی محاذ آرائی ہے۔ دونوں کے اپنے اپنے اور الگ الگ میدان ہیں۔ لیکن بعض نظم نگار جو زندگی بھر ایک اچھی اور بڑی نظم نہیں کہہ سکے، انہوں نے غزل کی مذمت کے ذریعے شہرت حاصل کرنے کا شارٹ کٹ اختیار کر رکھا ہے۔ یعنی شاعر تو وہ جدید نظم کے ہیں لیکن ان کی وجہ شہرت ان کی کوئی قابلِ ذکر نظم نہیں ہے بلکہ وجہ شہرت یہ ہے کہ وہ اردو زبان کی ترقی کے لیے بار بار فریاد کرتے ہیں کہ اردو غزل کو دریا برد کر دو، اس سے اردو کا نقصان ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ عبداللہ جاوید نے کسی بحث میں الجھے بغیر اس تجربہ کے ذریعے اس قماش کے نظم نگاروں کو بتایا ہے کہ اول تو غزل اور جدید نظم میں کوئی مخاصمت نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی کو غزل کے امکانات پر شک ہے تو دیکھیں کہ میرؔ کا ہر شعر اپنی جگہ ایک چھوٹی سی آزاد نظم ہے۔ یہ خوبی غزل میں تو ہے کہ اس کے اشعار کو کئی نظموں کی طرح پیش کیا جا سکتا ہے لیکن جدید نظم میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ کسی نظم کی لفظیات کو جوں کا توں غزل کی ہئیت میں لایا جا سکے۔ نمونہ کے طور پر میرؔ کی یہ نظمیں ملاحظہ فرمائیں۔

حمدیہ

تھا مستعار حُسن سے اس کے

جو نور تھا
خورشید میں بھی
اس ہی کا ذرّہ
ظہور تھا [۱۱]

ثباتِ گل

کہا۔۔ میں نے کتنا ہے
گل کا ثبات۔۔۔؟
کلی نے
یہ سُن کر تبسم کیا! [۱۲]

بارِ دگر جینا

شرط
سلیقہ ہے
ہر ایک امر میں
عیب بھی کرنے کو
ہنر چاہیے
خوف
قیامت کا
یہی ہے کہ میرؔ ہم کو جیا بارِ دگر چاہیے [۱۳]

عبداللہ جاوید مطالعۂ میرؔ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''میرؔ پڑھنے کے اس مرحلے پر میں یہ لکھنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ ''افسردگیِ سوختہ جاناں'' اور ''یار مستغنی ہے'' والے اشعار سے اگر میرے ساتھ میرؔ پڑھنے والے کسی صاحب یا صاحبہ کے ذہن و دل میں کوئی ارتعاش نہیں

پیدا ہوا تو یہ سمجھنا پڑے گا کہ میں ان کے معاملے میں ناکام ہو گیا ہوں، لیکن میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرؔ اپنے کسی پڑھنے والے کو مایوس نہیں کرتے اور خود ہی یہ سکھا دیتے ہیں کہ انھیں کیسے پڑھا جائے۔ پڑھنا شرط ہے،''[۱۴]

عبداللہ جاوید نے قارئین کو اپنے مطالعہ میں شریک کیا ہے، مختلف معاملات پر اپنا موقف بھی پیش کیا ہے لیکن قارئین پر کوئی تنقیدی فیصلہ مسلط نہیں کیا۔ ان کے مطالعہ کا مقصد قارئین کو میرؔ کے مزید مطالعہ کی طرف توجہ دلانا ہے اور اس مقصد میں وہ کامیاب دکھائی دے رہے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ **مت سہل ہمیں جانو** مطالعۂ میرؔ کے سلسلہ کی ایک اہم کتاب ثابت ہوگی۔

حوالہ جات

[۱] بحوالہ جدید ادب جرمنی شمارہ نمبر ۱۴۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۹ء ص ۱۲۶

[۲] بحوالہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۱۹۔ مئی ۲۰۱۴ء۔ ص ۳۵

[۳] ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے۔ مندرجہ فلیپ **مت سہل ہمیں جانو**۔

مطبوعہ جولائی ۲۰۱۴ء۔ ناشر اکادمی بازیافت کراچی

[۴] **ایضاً** ص ۱۴۔۱۵،

[۵] **ایضاً** ص ۲۱۔۲۲،

[۶] **ایضاً** ص ۲۵۔۲۶،

[۷] **ایضاً** ص ۹۲۔۹۳،

[۸] **ایضاً** ص ۷۶۔۷۷،

[۹] **ایضاً** ص ۸۱۔۸۲،

[۱۰] **ایضاً** ص ۹۳،

[۱۱] **ایضاً** ص ۲۹۹،

[۱۲] **ایضاً** ص ۳۱۶،

[۱۳] **ایضاً** ص ۳۱۹،

[۱۴] **ایضاً** ص ۴۷،

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۱۔ ستمبر ۲۰۱۵ء

مجلّہ **''الماس''**۔ شاہ لطیف یونیورسٹی۔ خیر پور۔ شمارہ: ۱۵

عباس خان کا فکری سفر

کتاب ''سچ'' کے حوالے سے

عباس خان ان ادیبوں میں شامل ہیں جو اپنے فکری سفر میں فلسفہ، سائنس، مذہب اور ادب کے سارے دیاروں سے ہوتے ہوئے اپنی نامعلوم منزل کی جانب گامزن ہیں۔ ان کی کتاب ''سچ'' ان کے ایسے ہی فکری سفر کی اب تک کی روداد ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ ہم فکری سطح پر ایک دوسرے سے خاصے قریب ہیں۔ اس قربت کا مطلب یہ نہیں کہ ہم میں فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ فکری ہم آہنگی کی بعض لہریں بھی موجود ہیں لیکن اختلاف رائے کی بہت ساری گنجائشیں بھی سامنے آئی ہیں۔ ہمارے فکری قرب کا اصل سبب یہ ہے کہ ہم دونوں اس دنیا اور اس کائنات کے سچ کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اس سفر کے دوران ہم لگ بھگ ایک جیسے ہی دیاروں سے ہوتے ہوئے اُس عظیم سچ تک پہنچنے کا جتن کر رہے ہیں۔ میں بنیادی طور پر عباس خان کی کتاب ''سچ'' کے مطالعہ کے بعد اس پر اپنے تاثرات لکھنا چاہ رہا ہوں لیکن اس فکری سفر میں عباس خان کے ہم رکاب ہوتے ہوئے مجھے اپنے فکری سفر کے جو مقامات یاد آئے ان کا ہلکا سا ذکر بھی برسبیل تذکرہ کرتا جاؤں گا۔

''سچ'' کے ابتدائی صفحات میں ہی عباس خان نے اپنے فکری سفر کا رُخ متعین کر دیا ہے۔

''انسانی اعمال و افعال کے پیچھے پانچ طاقتیں ہیں۔ بنی نوع انسان کی تاریخ کو ان میں سے کسی ایک، دو، تین، چار یا بیک وقت سب کے زیرِ اثر کہا جا سکتا ہے۔ یہ طاقتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ مذہب

۲۔ بھوک یا ذرائع پیداوار جن کی طرف کارل مارکس نے اشارہ کیا ہے۔

۳۔ جنس جس کا شارح فرائیڈ ہے۔

۴۔ خوف

۵۔لالچ یا خودغرضی

آخری دو کا نظریہ تھامس ہابز نے پیش کیا ہے۔

ان میں دو طاقتوں کا میں اضافہ کرتا ہوں۔ یہ دو سچ اور موت ہیں۔موت کی بات علیحدہ کتاب میں کریں گے۔اس وقت سامنے صرف سچ ہے۔تمام انسانی اعمال وافعال کی تشریح سچ کی طرف رُخ کر کے کی جا سکتی ہے۔خود کو سچ پر جان کر انسان، انسان کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔'' (ص ۶۔۷)

اس کے بعد عباس خان نے ول ڈیورنٹ اور برٹرینڈ رسل کے ۱۹۳۱ء کے دو خطوط دیئے ہیں۔ول ڈیورنٹ نے سچ کی دریافت کو سب سے بڑا سانحہ قرار دیا ہے جبکہ برٹرینڈ رسل نے جواباً لکھا کہ ''ابھی تک کوئی سچ دریافت نہیں ہوا۔'' (ص ۹ تا ۱۱)

عباس خان نے سچ کی جستجو میں شروع میں ہی سقراط اور نیطشے کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔سقراط سچ کو اٹل قرار دیتا ہے جبکہ نیطشے کے بقول سچ اشخاص، مقامات اور زمانوں کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔(ص ۱۳)

پھر اپنے سچ کی تلاش میں عباس خان نے خدا، کائنات اور انسان کو اپنی بحث کا بنیادی موضوع بنایا ہے۔ انسان کے حوالے سے انہوں نے انسان بذات خود، انسان جنس کے حوالے سے اور انسان بھوک کے حوالے سے، کی تخصیص بھی کر دی ہے۔اپنے موضوع کے لیے دلائل اور حوالہ جات کے سلسلہ میں انہوں نے مذہب، فلسفہ، سائنس، تاریخ اور ادب کے ذرائع کو اہمیت دی ہے۔

''سچ'' کو سمجھنے کے لیے عباس خان نے سب سے پہلے ''جنسی جذبے'' (محبت) کو اہمیت دی ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر علی شریعتی کے ایک اہم اقتباس کو بنیاد بناتے ہیں۔اقتباس دیکھئے۔

''انسان چار زندانوں میں مقید ہے۔زندان فطرت، زندان تاریخ، زندان جامعہ (زندان معاشرہ) اور زندان ذات۔

زندان فطرت سے رہائی کا ذریعہ علم یعنی سائنس اور ٹیکنالوجی (ہے)۔زندان تاریخ سے رہائی کا ذریعہ بھی علم ہے، یعنی تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کا علم، زندان جامعہ (معاشرہ) سے رہائی بھی علم ہی کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔یہ علم عمرانیات کا علم ہے۔لیکن زندان ذات سے رہائی علم کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔اگر انسان اپنی ذات کے زندان سے آزادی چاہتا ہے تو اس کا ذریعہ علم نہیں بلکہ عشق ہے۔'' (ص ۱۶)

اس اقتباس کے آخری نتیجہ کو پڑھتے ہوئے اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔

جس قدر ہوتا گیا تیری محبت کا اسیر
ذات کے زندان سے حیدرؔ رہا ہوتا گیا

مذکورہ بالا چار زندانوں کے ذکر کے ساتھ عباس خان لکھتے ہیں۔

''انسان کا پہلا زندان فطرت ہے۔انسان فطرت کے سامنے بے بس ہے۔آب و ہوا، پہاڑ، دریا، سمندر، جنگل، طوفان، فاصلے، موسم، اندھیرا، دلدلیں، کشش ثقل، مدوجزر، آسمانی بجلیاں، بارشیں اور درندے۔وہ ان سے اتنا لرزاں رہا کہ ان کے سامنے سجدے میں گر گیا۔سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے لیکن اب وہ اس زندان سے نکلنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔اب یہ سب اس کی حاکمیت تلے آتے جا رہے ہیں۔'' (ص ۱۶)

دوسرے زندان یعنی زندان تاریخ کے حوالے سے عباس خان نے تاریخ کو تھوڑا سا کھنگالا ہے۔ مختار مسعود کے ذریعے ٹائن بی کے حوالے سے طویل اقتباس درج کیے ہیں۔اس باب میں قرآن مجید کے حوالے بھی آتے ہیں اور علی عباس جلالپوری کا زاویۂ نگاہ بھی ایک موقف کے طور پر سامنے لایا گیا ہے۔اور پھر عباس خان یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔

''تاریخ اور اس کے فلسفے کو سمجھ کر انسان تاریخ کے زندان سے باہر نکل رہا ہے۔ممکن ہے کہ ایک دن مکمل طور پر اس سے نکل آئے۔'' (ص ۴۷)

تیسرے زندان کے بارے میں عباس خان لکھتے ہیں۔

''تیسرا زندان معاشرے کا ہے۔اسے عشاق کی زبان میں ظالم سماج کہتے ہیں۔اس قید خانے کی نشان دہی آغاز ہی میں ارسطو نے کر دی تھی۔اس نے کہا کہ انسان ایک معاشرتی جانور ہے اور یہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔اس قید خانے نے انسان کو اس پریشانی سے دوچار کیا کہ سپہ گری جیسا پس منظر رکھنے والا غالبؔ بھی جس سے یوں فرار چاہتا ہے۔

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

۔۔۔معاشرے کی پابندیوں کے خلاف جنہوں نے آواز اُٹھائی یا تو ہیرو بن گئے یا راندۂ درگاہ (ہو) گئے۔۔۔علم عمرانیات کی رو سے انسان سماج کے شکنجوں سے نکل رہا ہے۔وہ بتدریج ان بندھنوں کو ختم کر دے گا جنہوں نے بتدریج اس کو اپنے میں محصور کیا۔'' (ص ۴۷۔۴۸)

انسان کے چوتھے زندان، زندان ذات کے بارے میں عباس خان لکھتے ہیں۔

''یہ زندان باقی سب سے زیادہ گھناؤنا اور تکلیف دہ ہے۔خود سے چھٹکارا پانا بے حد مشکل کام ہے۔انا، خودغرضی، لالچ، حسد، لذت پرستی، جاہ طلبی، املاک اور اولاد کی محبت، غصہ، نفرت، خوف اور بھوک اس پر اس طرح مسلط ہیں جس طرح زندگی۔۔۔۔۔۔۔دنیا کا کوئی علم، کوئی پولیس، کوئی عدالت اور کوئی ڈاکٹر انسان کو اس کی ذات کے قید خانے سے رہائی نہیں دلا سکتا۔ذات کے زندان سے رہائی صرف اور صرف عشق دلا سکتا ہے۔عشق میں تو انسان اپنے عقائد، اپنی خواہشات، اولاد اور مال و متاع تو کیا اپنی جان تک قربان کر سکتا ہے۔'' (ص ۴۸)

پھر عشق کے بیان میں عباس خان میراں کے کرشن کے تصور سے عشق، اور لیلیٰ و مجنوں کے عشق سے ہوتے ہوئے عشق کے بارے میں مغربی مفکرین کی آراء درج کرتے ہیں۔اور بات فرائیڈ تک پہنچتی ہے۔مغربی مفکرین میں ایک نام مانتین کا ہے۔ان کی رائے میں عشق کیا ہے، انہیں کے الفاظ میں دیکھئے۔

''عشق محض ادعیۂ منی کو خالی کرنے کی لذت کا نام ہے۔جس طرح ہم ادرار بول سے اپنا مثانہ خالی کرتے وقت یا رفع حاجت کے وقت بڑی انتڑیوں کے خالی ہونے سے تسکین محسوس کرتے ہیں، اسی طرح ادعیۂ منی کو خالی کر دینے میں ہمیں ایک گونہ حظ محسوس ہوتا ہے۔قدرت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے لئے لذت اور غلاظت کو ایک ہی جگہ جمع کر دیا ہے۔'' (ص۔۵۷)

مانتین نے لطافت و کثافت کو لازم و ملزوم کی طرح بیان کیا ہے۔اس کا پہلا پرت دیکھا جائے تو جس مادہ (نطفہ) سے انسان کی تخلیق ہوتی ہے، اسے عمومی طور ہمارے ہاں ناپاک سمجھا جاتا ہے۔اب اگر ایک ناپاک قطرے سے وجود پانے والا انسان پاکیزگی اور طہارت کی بات کرے تو اسے کیا کہا جائے؟ بات صرف یہیں تک نہیں رہتی۔روح جو روحانیت کے سفر پر گامزن ہوتی ہے، اس کا قیام بھی اسی نطفہ میں ہی ہوتا ہے۔یہ عقیدہ پہلے سے موجود ہے کہ روح ایک لطیف نور ہے جو نطفہ کے اندر موجود ہوتی ہے اور جسم کی نشوونما کے ساتھ یہ بھی مستحکم ہوتی چلی جاتی ہے۔اس عقیدہ کی آج کے دور کے کلوننگ کے کامیاب تجربہ نے سائنسی تصدیق بھی کر دی ہے۔تو پھر نطفہ کے قطرات جو روح کے نور کو اپنے اندر سنبھالے ہوئے ہیں، انہیں ناپاک کیسے کہا جا سکتا ہے؟ جبکہ دوسری طرف اس کے انزال کے بعد غسل طہارت واجب ہے۔

شاید لطافت میں سے کثافت کو اور کثافت میں سے لطافت کو نکلتے رہنا ہے۔اس سلسلہ میں قرآن

شریف کی سورہ النحل آیت ۶۶ کے ارشاد کے مطابق:

وانّا لکم فی الانعام لعبراۃ۔۔۔۔لبناً خالصاً سآئِغاً للشٰربین۔

تمہارے لیے جانوروں میں سوچنے کا مقام ہے کہ ہم نے ان کے پیٹ میں گوبر اور خون کے درمیان میں سے دودھ کی دھاریں نکال دی ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہیں۔

لطافت و کثافت کے بیان میں میرا ذہن ان امور کی طرف چلا گیا تو مناسب لگا کہ یہاں ان کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔خیر بات ہو رہی تھی عباس خان کے فکری سفر کی۔

مغربی مفکرین سے گزر کر یونانی مفکرین کی باری آتی ہے۔فارسی شعراء کے فکر انگیز اشعار بھی یہاں ملتے ہیں۔تاہم جب جوش ملیح آبادی اور ممتاز مفتی اس حصہ میں آتے ہیں تو لگتا ہے موضوع اپنی سنجیدگی سے باہر آ گیا ہے۔جوش ملیح آبادی کی شہرت ان کے فرضی معاشقوں اور چند ایک حقیقی معاشقوں میں ڈھیر ساری رنگ آمیزی کے سوا کچھ نہیں ہے۔زبان و بیان پر دسترس اور قدرت رکھنا الگ خوبی ہے تاہم عشق کے باب میں جوش کو سنجیدگی سے لینا مناسب نہیں لگتا۔ممتاز مفتی کے ہاں اس موضوع پر اہم اقتباس مل سکتے ہیں لیکن جو اقتباس درج کیا گیا ہے وہ کوئی علمی یا فکری نکتہ پیش نہیں کرتا بلکہ کسی مزاحیہ مضمون کا اقتباس لگتا ہے۔فرماتے ہیں۔

''محبت میں چار مرحلوں سے گزرنا ضروری ہے ورنہ آپ کے کردار کی تکمیل نہیں ہوگی۔

۱۔کسی سے ٹوٹ کر محبت کرنا۔

۲۔کامیابی ایسی کہ محبوب دل و جان سے تمہیں اپنا لے، تخت پر بٹھا کر مور چھل کرے۔

۳۔پھر لات مار کر تخت کے نیچے گرا دے، تذلیل کرے۔

۴۔اور آخر میں آپ محبوب سے بے نیاز ہو جائیں۔زخم مندمل ہو جائے، یوں جیسے کبھی لگا ہی نہ تھا۔''

(ص ۵۷۔۵۸)

میں نے اپنے افسانہ ''روشن نقطہ'' میں عربی کی ایک روایت سے عشق کے چار مراحل درج کیے تھے۔

''محبت کے چار سفر ہیں۔کامیابی کے لئے یہ سفر ضروری ہیں

محبّ سے محبوب کی طرف۔محبوب سے محبّ کی طرف

محبّ سے محبّ کی طرف۔محبوب سے محبوب کی طرف''

یہ یک طرفہ محبت سے دو طرفہ محبت ہو کر پھر ''رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے ای رانجھا ہوئی'' کا مقام ہے۔

لگتا ہے ممتاز مفتی نے اس کی پیروڈی لکھ دی ہے۔

عشق کے بارے میں مختلف مفکرین کی آراء دینے کے بعد عباس خان نے دو مثالیں عملی زندگی سے دی ہیں۔ کنہیالال گابا (کے ایل گابا) انڈیا کے معروف بیرسٹر، صحافی اور پھر بزنس مین رہے ہیں۔ ان کی خودنوشت سوانح عمری کا ایک طویل حصہ اس میں شامل کیا گیا ہے اور یہ کافی غور طلب اور دلچسپ حصہ ہے۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ تینوں عورتیں مسلمان تھیں۔ انہوں نے اپنے خاندان سے، اپنے سماج سے ٹکر لی۔ شدید مشکلات سے گزرے لیکن عشق کی دھن میں شادی تک پہنچے۔ پہلی بیوی حسن آراء سے تین بچے ہو جانے کے باوجود اٹھارہ سال کے بعد علیحدگی ہوگئی۔ دسری بیوی سرور جو پہلے مخدوم غلام میراں شاہ (آف بھاولپور، صادق آباد) کی بیوی تھیں۔ اور ان کے دو بچے رانی اور حسین بھی مخدوم صاحب سے تھے۔ سرور کو جب مخدوم غلام میراں شاہ نے اپنے پاس بلایا تو وہ کے ایل گابا سے طلاق لے کر مخدوم صاحب کے دونوں بچوں سمیت ہندوستان سے پاکستان چلی گئیں۔ یہ جدائی ۲۶ اپریل ۱۹۵۱ء کو ہوئی۔ کے ایل گابا کی تیسری شادی شجاعت النساء سے ہوئی۔ اس روداد سے ظاہر یہ ہوا کہ جن شادیوں کے لیے انسان اپنا ایمان اور خاندان تک چھوڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ سماج سے ٹکرا کر ہر طرح کی مصیبتیں سہتا ہے۔ لیکن عشق میں کامیابی کے بعد پھر طلاق ہو جاتی ہے۔

دوسری مثال ظہیر مسانی کی کتاب سے لی گئی ہے۔ اس میں ایک ہندو خاتون اور پارسی مرد کے عشق کی داستان ہے جو خاندان اور سماج سے ٹکر لے کر کامیاب ہوئی مگر بعد میں تباہی کا شکار ہوگئی۔

ایسے واقعات درج کرنے کے بعد عباس خان لکھتے ہیں۔

''عشق و محبت کے بارے میں ارباب بصیرت اور ارباب دل کے مشاہدات و تجربات آپ نے دیکھ لئے۔ کیا ان سے ثابت ہوتا ہے کہ عشق و محبت اٹل سچائیاں ہیں؟ ۔قطعاً نہیں۔'' (ص ۸۸)

فرد اور معاشرے کی کشمکش کو ایک الگ باب میں بیان کرتے ہوئے عباس خان نے زمین پر برف کے زمانے سے شروع ہو کر پتھر کے ادوار تک جائزہ لیا ہے۔ زرعی معاشرے کے قیام و استحکام سے ہوتے ہوئے آج کے زمانے تک پہنچتے ہیں۔ اس سے اگلے باب میں کرۂ ارض کی تخلیق کے نظریات پر بات کرتے ہوئے تاریخ کو ادھر ادھر سے الٹ پلٹ کر دیکھتے ہیں۔ مختلف مذہبی و دیگر فکری تحریکوں سے متعارف کراتے ہیں۔ یہاں ابن رشد اور ابن خلدون سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں عباس خان نے دھرتی پر زندگی کی ابتدا کا کھوج لگانے کی بھی کاوش کی ہے۔ کچھ ڈارون کے خیالات کے حوالے

سے اور کچھ مختلف مذاہب کے تصورات کی رو سے۔ اس سے اگلے باب میں مرد اور عورت کی تفریق کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں جدید فیمینزم تحریک تک بات ہوئی ہے۔

یہاں اپنی ایک غلطی کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنے سفرنامہ ''سوئے حجاز'' میں لکھا تھا کہ گلیلیو اپنی سائنسی سچائی کے باوجود جھوٹا اور بے ایمان قرار پایا تھا۔ اس نے جان بچانے کے لئے معافی نامہ بھی لکھ دیا لیکن اس کے باوجود اسے سزائے موت دے دی گئی۔ میں اس بات کو ایسے ہی سمجھتا تھا لیکن اب ''سچ'' کے مطالعہ کے دوران معلوم ہوا کہ گلیلیو کو سزائے موت دینے کے بجائے گھر پر نظر بند کر دیا گیا تھا اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی تھی۔ عباس خان کے شکریہ کے ساتھ میں اپنی غلطی اور اپنے مغالطہ کو یہاں درست کرتا ہوں۔

اگلے باب میں فلسفے کے حوالے سے سچ کو جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔ علم الاعداد کی کرشمہ سازی کی ایک جھلک بھی دکھائی گئی ہے۔ یونانی فلسفیوں سے لے کر کانٹ، ڈیکارٹ، ہیگل سے ہوتے ہوئے دوسرے مغربی مفکرین تک کی فکریات کے ذریعے فلسفہ کو چھانا گیا ہے۔ اس میں ایک طرح سے یونان سے لے کر اب تک کے سارے فلسفیانہ نشیب و فراز کا مختصر ترین خلاصہ آ گیا ہے۔ اگلے صفحات پر عباس خان نے کائنات کی معرفت اور انسان کی خودشناسی کو فلسفے، مذہب اور سائنس کا آغاز قرار دیا ہے۔ اور پھر آج کی تازہ ترین سائنسی پیش رفت کے طور پر ہگز بوسون (گاڈ پارٹیکل) کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ تاہم یہ بہت ہی سرسری سا ذکر ہے۔ میں اپنی تفہیم کے مطابق اس تجربہ سے منسلک ایک دو اہم نکات کو بھی یہاں درج کر دینا چاہتا ہوں۔ یہ اقتباس میرے ایک مضمون سے لیا گیا ہے۔

''مذکورہ سب پارٹیکل کو ''گاڈ پارٹیکل'' نام دے کر سائنس دانوں نے مجھ جیسے ''نان سائنس'' بندے کے لیے سہولت فراہم کر دی۔ مجھے ایسے لگتا ہے کہ یہ سب پارٹیکل مذہبی زبان میں حکمِ خداوندی تھا، وہ آیا اور اس کا آنا ''کُن'' کا اعلان تھا۔ چنانچہ اس کے ساتھ ہی سترہ میل لمبی دائرے کی شکل میں بے حد محدود سطح کا سہی لیکن تخلیقِ کائنات کا منظر ایک بار پھر دہرا دیا گیا۔

کُن کا اک لفظ اسیروں پہ کہیں سے اترا
آسماں ہوگئے تخلیق قفس کے اندر

عجیب اتفاق ہے کہ ۲۰۰۳ء میں سوئٹزرلینڈ میں وہ سرنگ بننا شروع ہوئی، جس میں یہ تجربہ کیا گیا۔ تب میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا کوئی تجربہ ہونے جا رہا ہے، لیکن اُسی برس ایک غزل ہوئی جس میں

میرا یہ شعر بھی شامل تھا۔ یہ حسنِ اتفاق میرے لیے ذاتی مسرت کا باعث ہے۔

ایک بھارتی خاتون سائنس دان نے جو اس سارے منظر کو دیکھنے والوں میں شامل تھیں، بعد میں کہا کہ ''گاڈ پارٹیکل'' ہمیں دوبارہ دکھائی نہیں دیا لیکن ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے ہم کسی کھیت میں کوئی سوئی تلاش کر رہے ہوں۔ لیکن چونکہ اس کی ہستی ہے، اس لیے ہم اسے ڈھونڈ رہے ہیں، چاہے اس میں کتنا وقت ہی کیوں نہ لگ جائے۔

''گاڈ پارٹیکل'' کی صورت میں ایک ہلکی سی جھلک دکھائی دی ہے تو ہمارے عظیم سائنس دان بھی ،اپنی اصطلاحات کے دائرے میں رہتے ہوئے سہی خدا کی تلاش میں نکل کھڑے ہیں۔ مجھے تو یہ سارے سائنس دان اس وقت کے صوفی لگنے لگے ہیں۔ نام اور نوعیت کے فرق کے باوجود جستجوئے الٰہی کا یہ جذبہ اپنی جگہ دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی۔ سائنس دانوں کی پہلی کوشش یہ ہے کہ گاڈ پارٹیکل کے ذریعے یہ معلوم کیا جا سکے کہ مادے کو حجم کیسے ملا؟ پھر مادے کو توانائی اور توانائی کو مادے میں تبدیل کر لینے کا کوئی آسان رستہ تلاش کرنا مشکل نہ رہے گا۔

یہاں تک لکھتے ہوئے میں سچ مچ حیرت اور خوشی سے بھر گیا ہوں۔ اگر مذکورہ کامیابیاں حاصل ہو گئیں تو سامنے کی بات یہ ہے کہ سچ مچ میں روشنی کی رفتار سے سفر کرنا ممکن ہو جائے گا۔ یہ روشنی کی رفتار سے سفر کر سکنے کی بات مذہبی عقائد اور قصے کہانیوں سے ہوتی ہوئی عملی صورت اختیار کرنے کے قریب آ گئی ہے۔ **لا تنفزون الا بسُلطٰن**۔ تم ''سلطان'' کے بغیر زمین و آسمان کے کناروں سے نہیں نکل سکتے۔

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(مضمون ''ادب، سائنس اور الٰہیات'' از حیدر قریشی۔ بحوالہ ''ہمارا ادبی منظر نامہ''۔ ص ۴۷۶۔۴۷۷)

عباس خان اپنی کتاب ''سچ'' میں سلسلۂ گفتگو کو آگے بڑھاتے ہوئے مذاہبِ عالم پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہندومت، بدھ مت، جین مت، سکھ مت، مجوسیت، شنٹومت، تاؤمت، یہودیت، مسیحیت، اور اسلام کے بارے میں مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ ان مذاہب کی تعلیمات کا بھی ہلکا سا ذکر کیا گیا ہے۔ مذاہب کی دنیا سے آگے چل کر عباس خان نے ''زندگی کے ہر شعبے میں سچ سے متعلق تضادات'' کو بیان کرتے ہوئے ادب کے شعبے میں اپنا اپنا سچ منوانے کی جنگ کی بات ہے۔ ایڈگر ایلن پو، بادلیئر، حافظ شیرازی، غالب اور سعادت حسن منٹو کی شہرت کے نشیب و فراز کے اشارے دیئے گئے ہیں۔ اس سے

آگے چلتے ہیں تو ماضی و حال میں جھانکتے ہوئے علوم و فنون کے منفی کردار کا ذکر کرتے ہیں۔ روسو کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

''علوم و فنون کا منبع گناہ اور بدی ہے۔ مثلاً فلکیات کی ابتدا توہمات سے ہوئی۔ فصاحت و بلاغت کی ابتدا چاپلوسی، چالبازی، نفرت اور خواہشات سے ہوئی۔ ریاضی نے لالچ سے اور طبیعات نے فضول حیرت سے جنم لیا۔ جبکہ اخلاقیات کا منبع غرور ہے۔ مختصر یہ کہ ہر علم کی ابتدا برائی سے ہوئی ہے۔ علوم کا مقصد بھی گھٹیا ہے۔۔۔۔ اس سے دولت کی ہوس بڑھتی ہے اور سماجی وقار کی عمارت اخلاقی بنیادوں کے بجائے معاشی بنیادوں پر کھڑی کی جاتی ہے۔'' (ص۔۱۷۷)

روسو نے جو بات اکھڑپن کے ساتھ درشت انداز میں کہی ہے اسے ہمارے صوفی شاعر بڑے آرام سے اور رسان سے یوں بیان کر چکے ہیں۔

علموں بس کریں او یار اکو الف تیرے درکار

اور پھر الف کو بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے اور ارشاد ہوتا ہے۔

اک نقطے وچ گل مکدی اے

پھڑ نقطہ، چھوڑ حساباں نوں کر دور کفر دیاں باباں نوں
چھڈ دوزخ، گور، عذاباں نوں کر صاف دلے دیاں خواباں نوں
گل ایسے گھر وچ ڈھکدی اے اک نقطے وچ گل مکدی اے

دراصل یہ حضرت علیؓ کے اس فرمان کا عکس ہے۔ ''علم ایک نقطہ تھا جسے جاہلوں نے بڑھا دیا ہے۔''

مزید آگے چل کر عباس خان نے ایک طرف مذہب کے مثبت کردار کی تعریف کی ہے مگر ساتھ ہی مذہب کا فرقوں میں تقسیم ہو کر ہر فرقے کی جانب سے مذہب پر اجارہ داری کے منفی رویے کی نشان دہی کی ہے۔ انہوں نے مذاہب کے حوالے سے رابندر ناتھ ٹیگور کا ایک عمدہ اقتباس پیش کیا ہے۔

''انسان مذہب کے لئے اپنا مال لٹا دے گا، اپنی جان دے دے گا اور جنگیں لڑے گا لیکن مذہب کے مطابق زندگی بسر نہیں کرے گا۔'' (ص ۱۸۲)

شاید مجھے بھی اس حقیقت کا کچھ کچھ ادراک ہونے لگا تھا جب میں نے اپنے انشائیہ ''اپنا اپنا سچ'' میں یہ لکھا تھا۔

''شاید یہ معاملہ کچھ ایسے ہی ہے کہ جب کوئی خود کو سچا کہتا ہے تو گویا اپنے خوبصورت ہونے کا

اعلان کرتا ہے لیکن پھر ساتھ ہی دوسروں کو بدصورت بھی قرار دیتا ہے۔ اصولاً کسی کو اپنی خوبصورتی کے ثبوت کے لئے دوسروں کی بدصورتی کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہونی چاہئے۔ اگر آپ خوبصورت ہیں تو کسی کی بدصورتی کی نشاندہی کئے بغیر بھی آپ خوبصورت ہیں، لیکن اگر آپ بدصورت ہیں تو بے شک سارے جہان کی بدصورتی ثابت کر دیجئے اس سے آپ کا خوبصورت ہونا ثابت نہیں ہو سکے گا۔ چونکہ ہم اصلاً سچائی کی بات کر رہے ہیں اس لئے مختلف گروہوں اور افراد کی سچائیوں کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ ہر کسی کا اپنا اپنا سچ ہے اور ہر کسی کو اپنے اپنے سچ کی حفاظت کرنی چاہئے۔ نظریاتی سچ کی حفاظت نظریات پر عمل پیرا ہونے سے ہوتی ہے۔''

کتاب کے آخر تک آتے آتے عباس خان نے اپنے معاشرے کی مروجہ سچائیوں کو عمدگی کے ساتھ بے نقاب کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

''ادھر انسانی آبادی میں اضافہ طوفانی شکل اختیار کر چکا ہے۔ صفائی اور معاشرتی نظم وضبط کا فقدان ہے۔ تعلیم برائے نام ہے۔ قانون کے خلاف کام کرنا سب سے بڑی بہادری سمجھا جاتا ہے۔ امن عامہ کا تصور صرف کتابوں میں ملتا ہے۔ رشوت، اقربا پروری، خورد برد، ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری اور ملاوٹ بنیادی حقوق بن چکے ہیں۔ جمہوریت کا مطلب ہے ہر شے پرچا ہے نجی ہے چاہے سرکاری، ڈاکہ زنی۔ عورت پاؤں کی جوتی ہے۔ تکبر وغرور بڑائی کی دلیل ہیں۔ مذہب کو مذہب کے نام پر مجروح کیا جاتا ہے۔ وقار بدمعاشی سے حاصل ہوتا ہے۔ مغربی ممالک کی آسائشوں کی طرف حسرت سے دیکھنا۔ وہاں رہائش کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دینا۔ وہاں کی رہائش کو ترقی کی معراج سمجھنا۔

کچھ سچائیاں مشترکہ ہیں۔ ایک دوسرے کا خوف، جنگیں، اسلحے کی دوڑ، ملکی مفادات، اقلیتوں کی بدحالی، تہذیبوں کا ٹکراؤ، منشیات، عورتوں کا غیر اخلاقی مقاصد کے لئے اغوا، قزاقی، کمزور کے ذرائع پر بے جا تصرف، سیاسی پناہ، غیر قانونی انتقال آبادی، سرحدی تنازعات، نسلی امتیاز، معاشی ناکہ بندی، گمراہ کن اشتہار بازی اور جاسوسی۔

سچ شخصی ہے، خاندانی ہے، قبائلی ہے، قومی ہے اور بین الاقوامی ہے۔ سچ لمحاتی ہے، ایک دن کے لئے ہے، ایک ہفتے کے لئے ہے، ایک ماہ کے لئے ہے، ایک سال کے لئے ہے اور بغیر مدت کے ہے۔ انسانی فطرت کے سامنے یہ یوں آیا اور یوں گیا۔

جھوٹ نے سچ کا روپ بھی دھارا ہے۔ محبت کرنے والوں میں یہ فن کہلاتا ہے۔ وکلاء کے لئے

پیشہ اور سیاست دانوں کے لئے ضرورت۔ اداروں کے سربراہ اسے انتظام کا نام دیتے ہیں اور ماتحت اسے بہانہ کہتے ہیں۔۔۔۔ مزید براں کسی وقت اور کسی مقام پر ایک کا سچ دوسرے کے لئے جھوٹ کا درجہ رکھتا ہے یا جھوٹ سچ کا۔ اب تو خود انسان کا بھروسہ نہیں۔ اس کی سرشت اور تشخیص خطرے میں ہے۔ جینز کے شعبے میں کام کرنے والے سائنس دان اسے کچھ سے کچھ بنا سکتے ہیں۔'' (ص ۲۰۱۵۔۲۰۱۶)

سچ کو سمجھنے کے لیے ایک اور زاویے سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ یہاں پہلے اپنے انشائیہ ''یہ خیر وشر کے سلسلے'' سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

''میرا اپنا خیال ہے کہ ہر سچ میں کچھ نہ کچھ جھوٹ اور ہر جھوٹ میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص تاروں بھرا آسمان دیکھ کر کہے کہ میں اس وقت آسمان پر موجود اتنے سارے ستارے دیکھ رہا ہوں، تو یہ بات بالکل سچ ہوگی۔ اس کے باوجود اس میں غیر ارادی جھوٹ بھی شامل ہوگا۔ کیونکہ حقیقتاً جن ستاروں کی روشنی ہم تک پہنچ رہی ہوتی ہے وہ اس وقت کی نہیں ہزاروں برس پہلے کی ہوتی ہے۔۔۔۔ مکمل سچائی تو صرف خدا تعالیٰ کی ہستی ہے۔ باقی سب جزوی سچائیاں ہیں اس لئے اپنے جزو پر نازاں ہو کر کسی دوسرے پر انگلی اٹھانے والے کو معلوم ہونا چاہئے کہ اسی وقت اس کی اپنی باقی ساری انگلیاں خود اُسی پر اٹھی ہوتی ہیں۔''

اور اب اپنے انشائیہ ''اپنا اپنا سچ'' کا اختتامی اقتباس پیش کر دیتا ہوں کہ اس میں پہلے انشائیہ والی بات کی توسیع موجود ہے۔

''سچی بات یہ ہے کہ ہر نظریہ ایک جزوی سچائی ہے۔ کامل سچائی صرف اور صرف وہ حقیقتِ عظمیٰ ہے جو خالقِ کائنات ہے۔ جو اس کائنات میں جاری وساری بھی ہے اور اس سے باہر بھی ہے جو ہر شے پر محیط ہے۔ اس کامل سچائی کا اپنی اپنی بساط کے مطابق صرف اندازہ کیا جا سکتا ہے، احاطہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وہ لامحدود ہے۔ جب ایک بوند روشنی کا مالک جگنو سورج کی اصل تپش کا اندازہ نہیں کر سکتا اور ایک قطرہ سمندر کی وسعت اور گہرائی کا ادارک نہیں کر سکتا تو ہم **سارے انسان اس عظیم ہستی، اس لامحدود سچائی کا ادراک کیسے کر سکتے ہیں جس کے لئے کامل سچائی کا لفظ بھی نامکمل لگتا ہے۔**''

کتاب کے آخر میں عباس خان نے مختلف نوعیت کے بارہ سوال اُٹھائے ہیں۔ یہ ایسے سوالات ہیں کہ ان پر اپنا موقف دینے کے لئے پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ شاید عباس خان کا کوئی اور قاری یہ ہمت کر گزرے۔ یہاں پہلے ان کا درج کردہ آخری سوال پیش کر رہا ہوں۔

''۱۲۔ کیا اقوام متحدہ کو ایک مقتدر عالمی پارلیمنٹ میں نہیں بدلا جا سکتا؟'' (ص۔۲۲۲)

انڈیا اور پاکستان نے جب ایٹمی دھماکے کئے تھے، تب میں نے ایٹمی جنگ کے بعد کی فضا کے موضوع پر لکھے ہوئے اپنے تین افسانے، اپنے پیش لفظ کے ساتھ ''ایٹمی جنگ'' کے عنوان سے شائع کر دیئے تھے۔ یہ افسانے ''حوا کی تلاش'' (مطبوعہ ۱۹۸۱ء)، ''گلاب شہزادے کی کہانی'' (مطبوعہ ۱۹۸۲ء) اور ''کاکروچ'' (مطبوعہ ۱۹۹۲ء) تھے۔ یہ مختصر سی کتاب اردو اور ہندی دونوں اسکرپٹس میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے پیش لفظ کا آخری حصہ یہاں درج کرتا ہوں کہ اس میں بالواسطہ طور پر عباس خان کے بارھویں سوال پر میرا موقف کافی حد تک بیان ہو گیا ہے۔

''انڈیا اور پاکستان کے ایٹمی دھماکوں کے سیاسی پس منظر سے قطع نظر، میرے لیے یہ نئی صورتحال قدرے اطمینان کا موجب بن رہی ہے کہ دونوں طرف یہ احساس ہونے لگا ہے کہ کسی ایک کی ہلاکت کا مطلب لازمی طور پر دوسرے کی بھی ہلاکت ہے۔ اس بات کو اچھے انداز میں کہا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ انڈیا اور پاکستان کا جینا مرنا اب ساتھ ساتھ ہے۔ غور کریں تو یہ ساتھ جینا اور ساتھ مرنا تو محبت کا مقام ہے۔ تو پھر کیوں نہ ہم سب مل کر محبت کے اس مقام کو پہچانیں!

انسان کی انسان سے محبت کو صرف برِ صغیر تک ہی کیوں محدود رکھا جائے۔ کرّۂ ارض، اس بے پناہ کائنات میں ایک بے حد چھوٹی سی دنیا ہے۔ اس دنیا میں ساری جغرافیائی اکائیاں اپنی اپنی جگہ ایک سچ ہیں۔ لیکن کرّۂ ارض خود ایک بڑی جغرافیائی اکائی بھی ہے۔ اس دھرتی کے سارے انسان اپنے قومیتی، علاقائی اور مذہبی تشخص کے ساتھ۔۔۔ اپنے اپنے تشخص کو قائم رکھتے ہوئے پوری دھرتی کو ایک ملک بنا لیں اور اس ملک کے باشندے کہلانے میں خوشی محسوس کرنے لگیں تو شاید ایٹمی جنگ کے سارے خطرات ختم ہو جائیں۔ لیکن کیا ایسا ممکن ہے؟

پوری دھرتی کو ایک ملک بنانے کا خواب اور وحدتِ انسانی کی آرزو شاید بہت دور کی منزل ہے۔ یہ دوری قائم رہے یا ختم ہو جائے، اس کا انحصار تو ساری دنیا کے ملکوں کے باہمی اعتماد اور یقین پر ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے شاید یہ کسی دیوانے کا خواب ہو، پھر بھی آیئے ہم سب مل کر دعا کریں۔

دنیا میں محبت کے فروغ کی دعا!

دھرتی پر نسلِ انسانی کے قائم رہنے کی دعا!''

اب اس وقت کا امکانی سچ یہی دکھائی دیتا ہے کہ انسان یا تو ایٹمی جنگ کا شکار ہو کر پتھر کے دور

میں واپس جانے والا ہے یا پھر خلائی دور میں جانے والا ہے۔ اگر گاڈ پارٹیکل سائنسی سطح پر ہاتھ آ گیا تو روشنی کی رفتار سے سفر کرنا ممکن ہو جائے گا۔ سقراط اور نیطشے نے سچ کے بارے میں جو متضاد آراء دی ہیں، مجھے لگتا ہے دونوں باتیں ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

ثبات والا رُخ سقراط کے سچ کا اٹل ہونا درست قرار دیتا ہے تو تغیر کی حقیقت نیطشے کے ''افراد، مقامات اور زمانوں کے ساتھ بدلنے والے سچ'' کی تصدیق کرتی ہے۔

میں عباس خان کا شکر گزار ہوں کہ ان کی فکر انگیز کتاب ''سچ'' کے مطالعہ نے مجھے فکری طور پر متحرک کیا، مزید غور و فکر کی طرف مائل کیا۔

یہ غور و فکر ابھی جاری ہے!

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۵۔ دسمبر ۲۰۱۶ء۔ **عباس خان نمبر**۔

اردو فکشن کی عظیم شخصیت معروف و منفرد
افسانہ نگار، ناولٹ و ناول نگار، افسانچہ نگار

جوگندر پال وفات پا گئے

اردو کے علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر نہایت رنج و غم کے ساتھ پڑھی جائے گی کہ اردو ادب کی ممتاز شخصیت اور اردو فکشن میں بالکل منفرد نوعیت کے افسانہ نگار، ناولٹ نگار اور ناول نگار جوگندر پال آج ۲۳ اپریل ۲۰۱۶ء کو انڈیا کے وقت ساڑھے گیارہ بجے وفات پا گئے ہیں۔ خدا ان کی روح کو سکون عطا فرمائے۔ بھابی کرشنا پال، ان کے دونوں صاحبزادوں سدھیر اور سنیت اور صاحبزادی سکریتا اور دیگر پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔ آمین

جوگندر پال ۵ ستمبر ۱۹۲۵ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں ہندوستان جانا پڑا۔ وہاں سے انہیں نیروبی جانا پڑا اور پھر وہ ہجرتوں کے دکھ سہتے چلے گئے۔ انہوں نے اپنی زندگی کی ساری ہجرتوں کو نئے جنم کی صورت میں بیان کیا تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی ایک شاہکار تحریر ''خودوفاتیہ'' کا ایک اقتباس یہاں درج کر دیتا ہوں۔

''یقین کیجئے کہ مجھے اپنے پچھلے چاروں جنم ہو بہو یاد ہیں۔ پہلے میں سیالکوٹ میں پیدا ہوا اور بائیس برس تک جیا۔ پھر انبالہ میں میری پیدائش ہوئی اور ابھی میں کوئی ڈیڑھ برس کا ہی تھا کہ میرا انتقال ہو گیا اور میں نے نیروبی میں آنکھ کھولی۔ اورنگ آباد میں میرے چوتھے جنم کے دوران میرے ایک دوست صفی الدین صدیقی نے مجھے بتایا کہ تمھارے پُرکھے ضرور کبھی نہ کبھی یہیں آ بسے ہوں گے اور یہیں ڈھیر ہوئے ہوں گے ورنہ تم سمندر پار سے ایک یہیں کیوں آتے؟۔۔۔۔۔۔۔۔ اجنتا ایلورا کی بعض تصویروں میں ڈھیروں عام لوگوں کے اجتماع بھی شامل ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہر اک کے چہرے پر نظریں گاڑ کر سوچتا یہی میرا پہلا پُرکھا تو نہیں جو قدروں سے قطع نظر صرف پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے بڑی معصومیت

سے کرشن یا کنس کے ساتھیوں میں شامل ہو گیا تھا اور اب اپنے اس پانچویں جنم میں دلی آ پیدا ہوا۔''

جوگندر پال کا تخلیقی کام اتنا زیادہ، اہم اور قابلِ قدر ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے نئے سرے سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ جدید فکشن میں سب سے اہم اور بڑے فکشن رائٹر کا فیصلہ کرنے کے لیے سابقہ فیصلوں پر ایماندارانہ نظر ثانی کی ضرورت ہے۔۔۔ مجھے امید ہے کہ جوگندر پال کی وفات کے بعد ہمارے علمی و ادبی حلقوں میں اس کام کی اہمیت کا ادراک کرتے ہوئے محنت اور دیانت کے ساتھ ایسا کرنے کی کاوش کی جائے گی۔ سرِ دست یہاں جوگندر پال جی کو یاد کرتے ہوئے ان کے آخری ناول ''پار پرے'' پر اپنا مختصر سا مضمون اور ان کے ساتھ لی گئی اپنی چند یادگار تصویریں احباب کے ساتھ شیئر کر رہا ہوں۔

یہ خبر urdu_writers@yahoogroups.com سے ۲۳/اپریل کو ریلیز کی گئی۔۔ حیدر قریشی
(جرمنی سے)

انٹرنیٹ پر یہ خبر ریلیز ہوتے ہی اسی روز ان تین ویب سائٹس نے اس خبر کو شائع کر دیا۔ (ح۔ق)

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Misc&article=1685

---

http://punjnud.com/Aarticles_detail.aspx?ArticleID=143&
ArticleTitle=Joginder%20Paul%20Wafat%20Pa%20Gaey

---

http://punjnud.com/Aarticles_detail.aspx?ArticleID=144
&ArticleTitle=Joginder%20Paul%20Ka%20Novle%20Paar%20Pary

---

https://themuslimtimes.info/2016/04/23/india-eminent-urdu-writer-joginder-paul-passed-away/

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۳۔ جون ۲۰۱۶ء

جوگندر پال: اردو فکشن کی شان

جوگندر پال سے میرا تعلق ادبی محبت کا تعلق ہے۔ اپنی ادبی زندگی کے اوائل میں ان کا سب سے پہلا افسانہ جو میں نے پڑھا، اس کا نام تھا ''بھوک پریت''۔ یہ افسانہ نقوش لاہور کے کسی خاص شمارے میں شامل تھا۔ ان سے پہلے انتظار حسین اور انور سجاد کو تھوڑا بہت پڑھا تھا۔ انتظار حسین نسبتاً اچھے لگے تھے ۔لیکن جوگندر پال کی بات ہی کچھ اور تھی۔ میرے لیے وہ واقعتاً خود ایک دیومالائی کردار تھے۔ ان کی کہانیاں ان کے اندر گم تھیں اور وہ اپنی کہانیوں کے اندر گم تھے۔ بلراج کومل پہلی بار پاکستان آئے تو ان سے ملاقات کے دوران معلوم ہوا کہ وہ جوگندر پال کے سمدھی ہیں تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ میں ان سے صرف جوگندر پال کی باتیں کر رہا تھا اور انہیں کے بارے پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے بعد میں اپنے پاکستان کے سفر کی روداد میں میرے اس والہانہ پن کا کچھ ذکر بھی کیا تھا۔ یہ روداد ''اوراق'' لاہور میں شائع ہوئی تھی۔

پھر یوں ہوا کہ خود جوگندر پال پاکستان کی (اپنے آبائی علاقے کی) سیاحت نہیں بلکہ زیارت کرنے آ نکلے۔ میری تو لاٹری نکل آئی۔ ان کے لاہور پہنچنے کے ٹائم ٹیبل کے مطابق میں بھی لاہور پہنچ گیا۔ پھر دو دن ان کے ساتھ رہنے کا موقعہ ملا۔ جو ادبی تعلق قائم تھا، مزید مستحکم ہوا۔ ان کی شخصیت کی سادگی اور بے نیازی ان کی شان تھی اور ان دونوں خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی ان کی شخصیت میں ایک طلسماتی آن بان تھی۔ اردو افسانے کا ایک دور پریم چند سے شروع ہو کر راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر اور منٹو پر مکمل ہوتا ہے اور دوسرا دور انتظار حسین، انور سجاد اور رشید امجد سے شروع ہوتا ہے۔ جوگندر پال ان دونوں ادوار کے سنگم پر اپنے پورے تخلیقی وجود کے ساتھ سر بلند کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ پریم، چند سے منٹو تک ترقی پسند اور حقیقت پسند افسانہ نگاروں کے ساتھ ان کے عہد کی تکمیل کرتے دکھائی دیتے ہیں تو وہیں نئے افسانے کے آغاز پر نئے افسانے کے پیش رو کے طور پر اسے بڑھاوا دیتے دکھائی دیتے

ہیں۔ ترقی پسند افسانے اور جدید افسانے دونوں کے ساتھ پورے ادبی وقار کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اپنے پورے اور اونچے ادبی قد کے ساتھ کھڑا ہونے والا یہ تخلیق کار اردو کی ادبی تاریخ کا بے حد اہم کردار ہے۔ ایسا اہم کردار جسے ابھی اس کا عہد پوری طرح جان نہیں سکا۔ یہ زمانی سنگم کئی تخلیق کاروں نے دیکھا لیکن اس منفرد مقام کو جوگندر پال کے علاوہ کوئی نیا کہانی کار حاصل نہیں کر سکا۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

میں نے اوپر جوگندر پال کی سادگی اور بے نیازی کا ذکر کیا ہے۔ ان کی بے نیازی دکھاوے کی نہیں تھی تھی، وہ اندر باہر سے واقعتاً بڑے ہی بے نیاز ادیب تھے۔ وہ نقاد جو سمجھتے ہیں کہ تخلیق کار ان کے در پر حاضری دیتا رہے تو وہ اس کی تعریف کریں گے، جوگندر پال نے ایسے بڑے نقادوں کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ اپنی دانست میں ان بڑے نقادوں نے جوگندر پال کو بری طرح نظر انداز کیا لیکن جوگندر پال کو اپنے لکھے ہوئے پر جو اعتماد تھا وہ کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ آج وہ نام نہاد نقاد خود ادبی موت کا شکار ہوتے دکھائی دے رہے ہیں۔

جوگندر پال سے میرا تعلق سراسر ادبی نیاز مندی کا تعلق تھا اور ہے۔ اسی لیے میں نے اور فرحت نواز نے ۱۹۸۵ء میں ''جدید ادب'' کا جوگندر پال نمبر شائع کیا تھا جو تب تک انڈیا کے کسی زندہ ادیب کا پاکستان سے شائع ہونے والا پہلا نمبر تھا۔ اسے میں اپنے لیے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ ہمارے ہاں بعض شاعروں/ادیبوں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا ہے کہ کسی بڑے ادیب کی وفات پر اس کا ذکر اس انداز سے کیا جائے کہ تعزیتی رپورتاژ مرنے والے کی توصیف سے زیادہ نوحہ لکھنے والے کی عظمت کو اجاگر کرنے لگے۔ حقائق کی بنیاد پر ایسا کچھ لکھا جائے تو بھی کوئی حرج نہیں، لیکن تھوڑے سے سچ میں بہت سارا جھوٹ ملا کر اپنی عظمت جتانے والوں نے عظیم بننے کے لیے یہی طریقہ واردات اختیار کر رکھا ہے۔ قراۃ العین حیدر، امرتا پریتم، وزیر آغا، احمد فراز جیسے بڑے لکھنے والوں کی وفات پر ان سے زیادہ خود کو بڑا ظاہر کرنے والوں نے نام آوری کا روگ **پال** کر ادب کا **ستیاناس** کر کے رکھ دیا ہے۔ ایسے ہی ایک ادبی وارداتیے نے جوگندر پال کے ایک مضمون کے ایک حصہ میں ایک ہی جنم میں چار جنموں کی بات پڑھ کر اپنی زندگی کا پی آر نامہ ایک جنم میں چار جنموں کا قصہ بنا لیا۔ لیکن بے ساختہ تخلیقی انداز اور گھڑی ہوئی عظمت کا فرق از خود ظاہر ہوا جاتا ہے۔

جوگندر پال کے ساتھ میرے ذاتی تعلق کے حوالے سے سچ مچ میں بہت کچھ موجود ہے لیکن

میں صرف اپنے ایک ایسے رپورتاژ کے اقتباس پر اکتفا کروں گا جو انڈیا اور پاکستان میں دونوں طرف جوگندر پال کی زندگی میں شائع ہوا اور جسے انہوں نے پڑھا بھی۔ یہ میرے لیے ایک بڑا اعزاز ہے۔

''جوگندر پال جی کے ہاں پہنچا تو وہ گھر کے دروازے کے باہر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ بڑی محبت کے ساتھ ملے۔ گھر کے اندر جا کر بیٹھے۔ بھابی کرشنا پال کچھ دیر کے لیے کسی کام سے گئی تھیں، کچھ دیر کے بعد وہ بھی آ گئیں۔ جوگندر پال جی کے ساتھ بہت ساری باتیں ہوئیں لیکن مجھے احساس ہوا کہ وہ بات کر کے بھول جاتے ہیں اور پھر اسی بات کو بتانے لگتے ہیں۔ ایک بات پوچھتے، جواب ملنے کے کچھ دیر بعد پھر وہی سوال پوچھنے لگتے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یادداشت کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن ایک اور تجربہ ایسا ہوا کہ بہت اداس کرنے والا بھی تھا اور خوشی کا ایک رنگ بھی اس میں شامل تھا۔ میرے سامنے ایک دوست کا فون آیا۔ ان کا نام راجکمار ملک تھا، میں نے تھوڑی سی بات کر کے فون جوگندر پال جی کو دے دیا۔ ان سے کچھ دیر بات کرتے رہے۔ بات ختم کر کے فون واپس کیا تو بھابی کرشنا نے ریسیور لے لیا، انہیں ریسیور دیتے ہوئے کہنے لگے ''حیدر قریشی کا فون تھا''۔ اس پر بھابی کرشنا نے بتایا کہ پہلے بھی کئی بار ایسا ہوا ہے کہ فون پر کسی اور سے بات کرتے رہتے ہیں اور جب بات ختم ہوتی ہے تو کہتے ہیں حیدر قریشی کا فون تھا۔ میں دہلی شہر میں جوگندر پال جی کو آج کے عہد کے ادبی تخلیقی سطح کے دلی کا دل سمجھتا ہوں، اور مجھے یہ دیکھ کر ایک لحاظ سے خوشی ہوئی کہ میں ادب کی دلی کے دل میں اس حد تک بستا ہوں۔ تاہم یہ دکھ کی بات بھی تھی کہ ایسا ذہین تخلیق کار عمر گزرنے کے ساتھ اپنی یادداشت کھو رہا تھا۔ دراصل بعض باتیں ان کے اندر کھب کر رہ گئی تھیں ورنہ باقی ساری باتیں معمول کے مطابق ہی کر رہے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر وزیر آغا کی باتیں، اکبر حمیدی کی باتیں، رشید امجد اور منشا یاد کا ذکر، اور بھی بہت ساری باتیں معمول کے حساب سے کر رہے تھے، بس چند باتیں اور سوال ایسے تھے جنہیں وقفے کے بعد پھر بتانے یا پوچھنے لگتے تھے۔ دوپہر کا کھانا جوگندر پال جی کے ہاں کھایا۔ وہیں چند تصویریں بنائیں۔ جوگندر پال جی کے سٹڈی روم میں، ڈرائنگ روم میں اور ڈائننگ ٹیبل سے تھوڑا سا ہٹ کر۔۔۔ تصویریں بنائیں۔ بھابی کرشنا پال بہت زیادہ کمزور ہو گئی ہیں، تاہم ان کی یادداشت ذرا بھی کمزور نہیں ہوئی۔ اردو فکشن کے جدید تر اور اہم ترین فکشن رائٹر جوگندر پال جی سے زندگی میں ایک بار پھر ملنا میری خوش بختی تھی۔ یہ ایک یادگار ملاقات تھی، خوشی اور اداسی کی مختلف کیفیتوں سے بھیگی ہوئی ملاقات۔ چار بجے کے قریب ان کے گھر سے جانے کی اجازت طلب کی۔ وہ نہ صرف گھر سے باہر تک بلکہ گلی کی سڑک کے آخری سرے تک چھوڑنے آئے۔ انہیں خدا

حافظ کہا اور میری گاڑی مندا کنی انکلیو سے غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔''

(رپورتاژ ''زندگی کا یادگار سفر''۔ مشمولہ ''کھٹی میٹھی یادیں'' مطبوعہ ۲۰۱۳ء)

جوگندر پال کی وفات کی خبر ملتے ہی میں نے اردو رائٹرز ایٹ یاہو گروپس ڈاٹ کام فورم سے اسے ریلیز کیا۔ میری خبر جن احباب تک پہنچی انہوں نے تعزیتی ای میلز بھیجیں۔ ۲۳ اپریل کو جب جوگندر پال کی فیملی کے لوگ آخری رسومات ادا کر کے گھر پہنچے تو میں نے انہیں دوبارہ فون کیا اور سکریتا کے نام اپنی ای میلز کا بتایا جو میں انہیں بھیج چکا تھا۔ ان ای میلز میں امریکہ، آسٹریلیا اور ڈنمارک کی تین ویب سائٹس کے لنک تھے جہاں میری جاری کردہ خبر کو نمایاں کیا گیا تھا۔ اسی روز زاہدہ حنا کی جانب سے اسلام آباد کے ایک سیمینار میں جوگندر پال کی وفات پر تعزیتی قرارداد پیش کی گئی اور ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ انڈیا سے نذیر فتح پوری مدیر اسباق پونہ کو یہ خبر میرے ذریعے معلوم ہوئی اور پھر انڈیا کے کئی ادیبوں کو نذیر فتح پوری نے اس افسوس ناک خبر سے آگاہ کیا۔ جو تب تک اس سے بے خبر تھے۔ انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کی برق رفتاری کے باوجود میری جاری کردہ خبر جس طرح ادبی دنیا تک پہنچی اور اس پر جس طرح ادیبوں کی طرف سے ردِعمل آیا، اس سے اتنا احساس ضرور ہوا کہ جوگندر پال کو زندگی کے آخری سفر میں ہم نے اچھے سے الوداع کہہ دیا ہے۔ اپنا یہ تعزیتی شذرہ جوگندر پال کے ایک افسانچے پر مکمل کرتا ہوں۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے، اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ ہاں، اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں، میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو۔۔۔ اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی پیدا ہونا ہے۔ ہاں بابو، میں اسی لیے بار بار جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کر لوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے۔ نہیں، اچھا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے، اسی لیے تو زندگی کو زوال نہیں، بابو۔''

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۳۔ جون ۲۰۱۶ء

گلزار۔فلم سے ادب تک

گلزار کی شاعری پر بات کرنے سے پہلے میں ان کی شخصیت کے بعض ایسے پہلوؤں پر بات کرنا چاہوں گا جو مجھے دور سے لیکن صاف صاف دکھائی دیئے ہیں۔ممکن ہے یہ سچ مچ میں ایسے نہ ہوں لیکن مجھے گلزار ایسے ہی دکھائی دیئے ہیں تو ان کے بارے میں مجموعی تاثر بھی اس سارے پس منظر سے بنا ہے۔

گلزار کی شاعری اور شخصیت دونوں میں ایک انوکھی سی کشش ہے۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری کے ایک ممتاز گیت کار جن کے گیتوں کی اپنی لفظیات اور اپنا ذائقہ ہے۔

''ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو'' سے لے کر ''سُرمیلی اکھیوں والے۔۔۔'' تک گلزار کے گیت خود بول اُٹھتے ہیں کہ ہم گلزار کی تخلیق ہیں۔ ویسے تو گلزار کا شمار ان چند اہم گیت کاروں میں ہوتا ہے جن کے گیتوں میں ایک ادبی شان ہمیشہ سے موجود رہی ہے، تاہم گلزار اپنے نئے بلکہ جدید لب و لہجے کے باعث اپنے گیتوں کی الگ پہچان بھی قائم کرتے ہیں۔ میں اپنے بچپن سے گلزار کے فلمی گیت سنتا آ رہا ہوں۔ میری شعری تربیت میں جہاں بہت سارے عوامل کا اپنا اپنا حصہ شامل ہے، ویسے ہی خوبصورت اور معیاری فلمی شاعری بھی میری شعری تربیت کا ایک سبب بنی ہے۔ اور اس خوبصورت اور معیاری فلمی شاعری میں ساحر لدھیانوی کی شاعری ترقی پسند حوالے سے اور گلزار کی شاعری جدید حوالے سے میرے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہی ہے۔ ویسے اور بھی بہت سارے پرانے فلمی شعراء کے گیتوں نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار رکھا ہے۔ گلزار کے انداز سے ملتی جلتی شاعری مجھے دو اور گیت کاروں کے ہاں بھی نمایاں طور پر دکھائی دی ہے۔ کمال امروہوی اور جاں نثار اختر کے فلم **شنکر حسین** اور فلم **رضیہ سلطان** کے بعض گانے۔ جاں نثار اختر ہی کا فلم **نیلا پربت** کا شاہکار گیت۔ یہ سب گلزار کے فلمی گیتوں سے ملتے جلتے لگتے ہیں۔ بہر حال میں ان فلمی شعراء سے جو کچھ بھی سیکھ سکا ہوں، اس کا برملا اقرار کرتے ہوئے مجھے خوشی ہو رہی ہے اور

ان سارے لوگوں میں ساحر لدھیانوی اور گلزار دو مختلف ذائقوں کے حوالے سے مجھے بہت زیادہ پسند رہے ہیں۔

گیت نگاری سے ہٹ کر فلم میکنگ کے مختلف شعبوں میں گلزار کی کارکردگی میں بھی ایک تخلیقی وفور دکھائی دیتا ہے۔ ''ہوتو تو'' جیسی تجرباتی اور ''چپکے چپکے'' جیسی پاپولر سماجی فلموں سے لے کر ''آندھی'' اور ''موسم'' جیسی شاہکار فلموں تک گلزار کے تخلیقی وفور کو بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ ''آندھی'' اور ''موسم'' کو تو بحیثیت فلم ڈائریکٹر گلزار کی پہچان قرار دیا جا سکتا ہے۔ دونوں فلموں کے گیت اپنی اپنی جگہ خوبصورت ہیں، لیکن فلم ''موسم'' کے دو گیتوں نے تو ایک عرصہ تک مجھے اپنے سحر میں گرفتار رکھا ہے۔

چاکلیٹی ہیروشمی کپور پر فلمایا گیا شوخ گیت ''لال چھڑی میدان کھڑی'' ایک عمر کے نوجوانوں کے لحاظ سے، اُس عمر میں مجھے بھی اچھا لگتا رہا ہے۔ لیکن جب گلزار کی فلم ''موسم'' میں ''چھڑی رے چھڑی کیسی گلے میں پڑی'' کو سنا اور دیکھا تو شمی کپور کی چھڑی بھول گئی۔

چھڑی رے چھڑی کیسی گلے میں پڑی
پیروں کی بیڑی، کبھی لگے ہتھکڑی
سیدھے سیدھے راستوں کو تھوڑا سا موڑ دے دو
بے جوڑ روحوں کو ہلکا سا جوڑ دے دو
جوڑ دو نہ ٹوٹ جائے سانسوں کی لڑی
چھڑی رے چھڑی کیسی گلے میں پڑی

لگتا ہے سانسوں میں ٹوٹا ہے کانچ کوئی
چبھتی ہے سینے میں بھینی سی آنچ کوئی
آنچل سے باندھ لی ہے آگ کی لڑی
چھڑی رے چھڑی کیسی گلے میں پڑی

اس گیت کی لفظیات صرف گلزار جیسے شاعر سے ہی تخلیق کا روپ دھار سکتی تھی۔ گیت کی پکچرائزیشن بجائے خود گلزار کا تخلیقی کمال ہے۔ گیت کے آخر میں ہیرو، ہیروئن چھڑی کو ایک دوسرے سے چھین رہے ہیں۔ اسی چھینا جھپٹی میں ہیروئن چھڑی چھین کر دور پھینک دیتی ہے۔ ہیرو چھڑی کو اُٹھانے

کے لیے جھکتا ہے اور جب چھڑی کو اُٹھا کر سیدھا کھڑا ہوتا ہے تو اس کی جوانی کی عمر کے بیس سال گزر چکے ہوتے ہیں۔ سیاہ بال سفیدی میں ڈھل رہے ہوتے ہیں۔ یہاں گلزار فلیش بیک کی تیکنیک کو میکانکی انداز سے نہیں بلکہ واقعتاً ایک باکمال تخلیق کار کے تخلیقی انداز سے بروئے کار لائے ہیں اور جوانی اور بڑھاپے کے دونوں زمانوں کو یکجا کر دیا ہے۔

اسی فلم میں گائی گئی ایک غزل، اپنی سچوئیشن کے پس منظر سے ایسے ابھرتی ہے کہ جیسے دل کو مٹھی میں لے لیتی ہے۔

رُکے رُکے سے قدم رُک کے بار بار چلے
قرار لے کے تیرے در سے بے قرار چلے
صبح نہ آئی کئی بار نیند سے جاگے
تھی ایک رات کی یہ زندگی، گزار چلے

(گلزار کے شعری مجموعہ میں غزل کا یہ شعر یوں درج ہے:

سحر نہ آئی کئی بار نیند سے جاگے تھی رات رات کی یہ زندگی گزار چلے)

فلم **موسم** اور **آندھی** کے گیتوں کی تفصیل میں جانے لگوں تو شاید ایک الگ مضمون بن جائے۔ لیکن صرف ان دو گیتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ گلزار کا ایک شاندار کام مرزا غالب کی ٹی وی سیریل ہے۔ غالب پر فلموں اور ڈراموں میں تھوڑا بہت کام ہوتا رہا ہے۔ لیکن گلزار کا کام پہلے سارے کام سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ گلزار کی خوش قسمتی ہے کہ انہیں غالب پر اس نوعیت کا کام کرنے کا موقعہ ملا اور غالب کی بھی خوش قسمتی ہے کہ ایک زمانے کے بعد انہیں گلزار جیسے تخلیق کار نے ایک ٹی وی سیریل میں متحرک کر دیا۔

گلزار کی شخصیت میں مجھے ہمیشہ ایک انوکھی کشش دکھائی دی ہے۔ ان کا اپنا سراپا محبوبانہ ہے۔ انہیں مینا کماری (مہ جبیں) سے محبت ہوئی لیکن ان سے شادی نہ ہو سکی۔

ہم تو کتنوں کو مہ جبیں کہتے
آپ ہیں اس لیے نہیں کہتے

میرا خیال ہے کہ مینا کماری کی محبت ہی گلزار کو راکھی تک لائی۔ راکھی کو براہ راست دیکھا جائے تو ایک خوبصورت اور بھرپور ہیروئن ہیں۔ بلیوں جیسی آنکھوں، بھرے ہوئے جسم اور گورے چٹے رنگ کے

باعث وہ بلاشبہ خوبصورت ہیروئنوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ لیکن جب بندہ مینا کماری کی محبت کا اسیر ہو تو پھر مینا کماری جیسا ''مہاندرا'' رکھنے کے باوجود مینا کماری کی ملاحت کے جادو کے سامنے سب کچھ ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے۔ (بعض لوگ اسی لیے عشق، محبت کو حماقت بھی کہتے ہیں) سو گلزار، مینا کماری کے سحر سے کبھی نہیں نکل سکے۔ میری معلومات کے مطابق مینا کماری نوبل انعام یافتہ بنگالی کے مشہور شاعر اور دانشور رابندر ناتھ ٹیگور کی پڑنواسی تھیں۔ (اس کا ایک اشارہ وکی پیڈیا پر مینا کماری کے صفحہ پر ملتا ہے، جبکہ ٹیگور کے صفحہ پر ان کے پانچ بچوں کا ذکر ملنا مگر ان کے نام درج نہ کیے جانا، محققین کے لیے ایک نئی تحقیق کا موجب بن سکتا ہے) بہر حال مینا کماری کو شاعرانہ مزاج اپنے نانا سے ورثہ میں ملا تھا۔ انہوں نے تھوڑی بہت شاعری کرنے کی کوشش کی لیکن ان کی شعری صلاحیتیں پالش نہ ہو سکیں۔ شاید فلمی دنیا کی مصروفیات نے انہیں اس طرف زیادہ توجہ کرنے کی مہلت نہیں دی۔ خود گلزار بھی اتنا وقت نہ نکال پائے کہ مینا کماری شاعرہ کے طور پر کوئی نمایاں کام کر جاتیں۔ ہر بندے کے دل کے معاملات کی اپنی نوعیت ہوتی ہے۔ مینا کماری اور راکھی دونوں کی اہمیت کے باوجود مجھے گلزار ان دونوں کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورت لگے ہیں۔ میں یہاں مرد اور عورت کی تفریق والی خوبصورتی کی بات نہیں کر رہا، بلکہ عمومی انسانی خوبصورتی کی بات کر رہا ہوں۔

اس وقت گلزار کی شاعری کی چھ کتابیں میرے پاس ہیں۔ ''رات پشمینے کی'' (شاعری۔ ۲۰۰۲ء۔ مطبوعہ۔ پاکستان)؛ ''پندرہ پانچ پچھتر'' (نظمیں۔ ۲۰۱۰ء۔ انڈیا)، ''ترویٰنی'' (۲۰۱۲ء۔ پاکستان)؛ ''کچھ اور نظمیں'' (۲۰۱۲ء۔ پاکستان)؛ ''گلزار۔ نظمیں، غزلیں، گیت، ترویٰنی'' (۲۰۱۴ء۔ پاکستان)؛ ''پلوٹو'' (نظمیں۔ ۲۰۱۴ء۔ مطبوعہ انڈیا)۔

یہ ساری کتابیں گلزار صاحب نے بمبئی سے عنایت کی تھیں۔ میں ان سب کو پڑھ چکا ہوں اور گلزار کی شاعری سے لبالب بھرا ہوا ہوں۔ گلزار کی نظمیں ہوں، یا غزلیں، گیت ہوں یا ترویٰنی کا تجربہ، سب میں گلزار کا مخصوص رنگ جھلکتا ہے۔

گلزار کی نظمیں اپنی مقدار کے لحاظ سے ان کی باقی ساری شاعری پر حاوی ہیں، اس لحاظ سے ان کی نظمیں باقی اصناف پر تھوڑی سی فوقیت رکھتی ہیں۔ اس لیے میں ترتیب کے مطابق پہلے گلزار کی نظموں کا مطالعہ کرنا چاہوں گا۔ گلزار کی نظموں میں موضوعاتی تنوع ہے۔ محبت کا موضوع اپنے آپ میں بے حد وسیع ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر بھی گلزار نے مقامی سے لے کر بین الاقوامی سیاست تک کیے جانے والے

فریب کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور اس کے نتیجہ میں ہونے والے فسادات سے لے کر عالمی خونریزی تک کتنے ہی مناظر دکھا کر انسانی المیوں کو اجاگر کیا ہے۔ اپنی بہت ہی نجی دنیا سے لے کر فلمی دنیا اور ادبی دنیا تک کی کئی اہم شخصیات سے اپنے تعلقِ خاطر کو اپنی نظموں کے ذریعے بیان کیا ہے۔ اپنی دھرتی کے مختلف خوبصورت مناظر سے لے کر دنیا بھر میں جہاں جہاں کی سیاحت کی وہاں تک کے خوبصورت مقامات کی بھی اپنی نظموں میں عمدگی کے ساتھ تصویر کشی کی ہے۔

روزانہ کے معمولاتِ زندگی سے لے کر زندگی کے فلسفیانہ افکار تک کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ کائناتی وسعتوں کو حیرت کے ساتھ دیکھتے ہیں مگر اس کے کسی خالق کی ہستی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کے باوجود کہیں کہیں نظموں میں سجدہ کرتے یا سجدے سے سر اُٹھاتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ماضی کو اور جنم بھومی دینہ کو مسلسل یاد کرتے ہیں اور کرتے ہی رہتے ہیں۔ یہ گلزار کی نظموں کے موضوعات کے حوالے سے انتہائی اختصار کے ساتھ میرا مجموعی تاثر ہے۔

جس طرح اپنی جنم بھومی دینہ کے معاملہ میں گلزار بہت زیادہ جذباتی ہیں، ویسے ہی اپنے گزرے ہوئے زمانے کے معاملہ میں بھی حساس ہیں۔ اپنی عمر کے گزر چکے وقت اور گزرتے جاتے وقت کے حوالے سے گلزار کی چند نظموں کی مختلف کیفیات دیکھیں۔

☆☆☆ میں اُڑتے ہوئے پنچھیوں کو ڈراتا ہوا/ کچلتا ہوا گھاس کی کلغیاں/ گراتا ہوا گردنیں ان درختوں کی، چھپتا ہوا/ جن کے پیچھے سے/ نکلا چلا جا رہا تھا وہ سورج۔۔۔۔/ تعاقب میں تھا اس کے میں! / گرفتار کرنے گیا تھا اسے/ جو لے کے مِری عمر کا ایک دن بھاگتا جا رہا تھا/ **(وقت۔۱)**

☆☆☆ شیشم اب تک سہما سا چپ چاپ کھڑا ہے/ بھیگا بھیگا، ٹھٹھرا ٹھٹھرا/ بوندیں پتّہ پتّہ کر کے/ ٹپ ٹپ کرتی ٹوٹتی ہیں تو سسکی کی آواز آتی ہے/ بارش کے جانے کے بعد بھی/ دیر تلک ٹپکا رہتا ہے/ تم کو چھوڑے دیر ہوئی ہے/ آنسو اب تک ٹوٹ رہے ہیں **(آنسو۔۳)**

☆☆☆ منہ ہی منہ کچھ بُڑ بُڑ کرتا، بہتا ہے یہ بڈھا دریا/ پیٹ کا پانی دھیرے دھیرے سوکھ رہا ہے/ دُبلا دُبلا رہتا ہے اب/ کود کے گرتا تھا یہ جس پتھر سے پہلے/ وہ پتھر اب دھیرے سے لٹکا کے اس کو/ اگلے پتھر سے کہتا ہے/ اس بڈھے کو ہاتھ پکڑ کے پار کرا دے **(بڈھا دریا۔۳)**

عمرِ رواں کے رنگ دیکھتے ہوئے اور ان رنگوں میں گھلتے ہوئے گلزار وقت کو ایک اور انداز سے دیکھنے لگتے ہیں:

☆☆☆ منوا کثر پوچھتی ہے دائی ماں سے۔۔۔۔ ''ماں! / کھلونے بھی بڑے ہوتے/ انہیں بھی عمر لگ جاتی۔۔۔۔ تو کیا ہوتا؟'' **(کھلونے)**

☆☆☆ ہم نے دیکھا تھا بہت دیر تلک ڈوبتے سورج کی طرف/ اور جب چلتے ہوئے ہاتھ ملایا تھا، کہا تھا اس نے/ تم نے وعدہ تو کیا ہے کہ یہیں کل بھی ملو گے/ اور مجھ سے بھی کہا ہے کہ گواہی دینا/ میں نہیں آؤں گا، کل دوسرا سورج ہوگا/۔۔۔/ ہم نے دیکھا تھا بہت دور تلک ڈوبتے سورج کی طرف/ دوسرے دن بھی مگر دیکھ کے ہم کو، وہ ہنسا کیوں تھا؟/ **(ہم نے دیکھا تھا بہت دیر تلک)**

گلزار نے اپنے خون کے رشتوں میں سے اپنے ''ابو'' اور بیٹی ''بوسکی'' (میگھنا) کو خاص اہمیت دی ہے۔ اسے میں یوں دیکھتا ہوں جیسے وہ ماضی کی گہری یادوں کے باوجود اپنے مستقبل کو بھی دیکھنے لگے ہیں۔ ہجرت کی داستان بیان کرتے ہوئے ماں اور بہن کا ذکر آتا ہے تاہم بیوی کا ذکر براہِ راست دکھائی نہیں دیتا۔ میرا قیاس ہے کہ گلزار کی محبت کی شاعری کا بیشتر حصہ یا ایک بڑا حصہ اپنی بیوی کے لیے ہے۔ ہجر اور وصال کی متعدد کیفیات اس کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ تو بیوی سے محبت یا جھگڑے کی بات ہو رہی ہے۔ مثلاً یہ نظم دیکھیں:

☆☆☆ رات بھر ایسے لڑی جیسے کہ دشمن ہو مِری!/ آگ کی لپٹوں سے جھلسایا، کبھی تیروں سے چھیدا/ جسم پر دُکھتی ہیں ناخونوں کی مرچیلی کھرونچیں/ اور سینے پہ مِرے، داغی ہوئی دانتوں کی مُہریں/ رات بھر ایسے لڑیں جیسے کہ دشمن ہو مِری!/۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔/ جھنجھناہٹ بھی نہیں صبح سے گھر میں اس کی/ میرے بچوں میں گھری بیٹھی ہے/ اپنی ممتا سے بھرا شہد کا چھتّا لے کر!!/

(رات بھر ایسے لڑی جیسے کہ دشمن ہو مِری!)

میاں بیوی کی محبت اور جھگڑوں میں الجھی ہوئی زندگی کی مزید روداد ان چار نظموں سے بخوبی عیاں ہو رہی ہے۔ یہ نظمیں بیک وقت خوبصورت بھی ہیں اور اداس کرنے والی بھی ہیں۔

☆☆☆ ہے سوندھی تُرش سی خوشبو دھوئیں میں/ ابھی کاٹی ہے جنگل سے/ کسی نے گیلی سی لکڑی جلائی ہے/ تمہارے جسم سے سرسبز گیلے پیڑ کی خوشبو نکلتی ہے/۔۔۔۔۔/ گھنیرے کالے جنگل میں/ کسی دریا کی آہٹ سُن رہا ہوں میں/ کوئی چپ چاپ چوری سے نکل کے جا رہا ہے/ کبھی تم نیند میں کروٹ بدلتی ہو تو بل پڑتا ہے دریا میں/۔۔۔۔/ تمہاری آنکھ میں پرواز دِکھتی ہے پرندوں کی/ تمہارے قد سے اکثر آبشاروں کی بلندی یاد آتی ہے/ **(ہے سوندھی تُرش سی خوشبو۔۔۔)**

☆☆☆وہ شب جس کو تم نے گلے سے لگا کر/مقدس لبوں کی حسیں لوریوں میں/سُلایا تھا سینے پہ ہر روز/لمبی کہانی سنا کر/۔۔۔۔/وہ شب جس کی عادت بگاڑی تھی تم نے/وہ شب آج بستر پہ اوندھی پڑی رو رہی ہے/ **(وہ شب جس کو تم نے گلے سے لگا کر)**

☆☆☆میں اپنے گھر میں ہی اجنبی ہو گیا ہوں آ کر/مجھے یہاں دیکھ کر مری روح ڈر گئی ہے/دبک کے سب آرزوئیں کونوں میں جا چھپی ہیں/لویں بجھا دی ہیں اپنے چہروں کی حسرتوں نے/کہ شوق پہچانتا نہیں ہے۔۔۔۔۔/مُرادیں دہلیز پر ہی سر رکھ کے مر گئی ہیں/۔۔۔۔۔/میں کس وطن کو تلاش کرنے چلا تھا گھر سے/کہ اپنے گھر میں بھی اجنبی ہو گیا ہوں آ کر/

(میں اپنے گھر میں ہی اجنبی)

☆☆☆مجھ کو بھی ترکیب سکھا کوئی یار جلاہے!/اکثر تجھ کو دیکھا ہے کہ تانا بُنتے/جب کوئی تاگا ٹوٹ گیا یا ختم ہوا/پھر سے باندھ کے/اور سرا کوئی جوڑ کے اس میں/آگے بُننے لگتے ہو/تیرے اس تانے میں لیکن/ایک بھی گانٹھ گرہ بُنتر کی/دیکھ نہیں سکتا ہے کوئی/میں نے تو اک بار بُنا تھا ایک ہی رشتہ/لیکن اس کی ساری گرہیں/صاف نظر آتی ہیں میرے یار جلاہے!

(مجھ کو بھی ترکیب سکھا کوئی یار جلاہے!)

میں بار بار بیوی سے محبت اور جھگڑے کی بات کر رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گلزار کی زندگی میں اور کوئی محبت نہیں ہے۔ گلزار کسی محلے کے عام نوجوان بھی ہوتے تو اپنے محلے کی کئی لڑکیوں کے ہیرو ہوتے۔ پھر ان کی عمر کا بڑا حصہ تو بالی ووڈ کی چمک دمک والی زندگی میں گزرا ہے۔ سو ان کی زندگی میں ایک نہیں مختلف نوعیت کی کئی محبتیں آئی ہوں گی۔ مجھے لگتا ہے کہ وصال کی سرشاری کے باوجود گلزار ہجر کی لذت میں زیادہ گم رہتے ہیں۔ وصال صرف یاد کرتے رہنے کا ایک جواز ہوتا ہے، پگھلنے کا سامان کرتا ہے۔ باقی اصل مزہ ہجر میں ہی آتا ہے۔

☆☆☆یاد ہے اک دن/میرے میز پہ بیٹھے بیٹھے/سگریٹ کی ڈبیہ پر تم نے/چھوٹے سے اک پودے کا/ایک اسکیچ بنایا تھا/آ کر دیکھو/اس پودے پر پھول آیا ہے **(سکیچ)**

☆☆☆میں اپنے بزنس کے سلسلے میں/کبھی کبھی اس کے شہر جاتا ہوں تو گزرتا ہوں اُس گلی سے/وہ نیم تاریک سی گلی/اور اسی کے نکڑ پہ اونگھتا سا/پرانا کھمبا/اسی کے نیچے تمام شب انتظار کر کے/میں چھوڑ آیا تھا شہر اس کا/۔۔۔بہت ہی خستہ سی روشنی کے عصا کو ٹیکے/وہ کھمبا اب بھی وہیں کھڑا ہے!/فتور ہے یہ، مگر میں

کھمبے کے پاس جا کر/نظر بچا کے محلّے والوں کی/پوچھ لیتا ہوں آج بھی یہ/وہ میرے جانے کے بعد بھی، آئی تو نہیں تھی؟ **(وہی گلی تھی۔۔۔)**

☆☆☆سبھی دھندلا گیا پھر سے/اندھیرا پھر سے بہنے لگ گیا ہے/پگھل کر پھر کوئی شئے بہہ رہی ہے/ٹپکتا جا رہا ہے قطرہ قطرہ کوئی چہرہ/سبھی کچھ تیرتا ہے اور پھر کچھ دیر میں سب ڈوب جاتا ہے۔۔۔/مری آنکھوں میں شاید پھر سے آنسو بھر گئے ہیں! **(سبھی دھندلا گیا پھر سے!)**

ایک شاعر کی حیثیت سے گلزار کو کبھی خیال اور الفاظ کے چناؤ کی کشمکش میں نظم کی تخلیق کا عمل دُکھی کرنے لگا تو ان سے یہ نظم تخلیق ہو گئی:

☆☆☆ایک خیال کو کاغذ پر دفنایا تو/اک نظم نے آنکھیں کھول کے دیکھا/ڈھیروں لفظوں کے نیچے وہ دبی ہوئی تھی!/۔۔۔سہمی سی، اک مدھم سی، آواز کی بھاپ/اُڑی کانوں تک/کیوں اتنے لفظوں میں مجھ کو چنتے ہو؟/رہا ہیں کس دی ہیں مصرعوں کی/تشبیہوں کے پردے میں ہر جنبش تہ کر دیتے ہو!/۔۔۔اتنی اینٹیں لگتی ہیں کیا ایک خیال دفنانے میں؟/ **(ایک خیال کو۔۔)**

جس شاعر کو اپنے تخلیقی عمل کے دوران خیال اور الفاظ کے چناؤ کی کشمکش اتنا مضطرب کر رہی ہو، اسے نقادوں کے ہاتھوں اپنی نظموں کا تجزیہ کیسا لگے گا؟ اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اندازہ لگانے کی ضرورت نہیں ہے گلزار نے سکہ بند نقادوں کی طرف سے نظموں کے کھوکھلے تجزیوں پر اپنی رائے ایک نظم میں یوں بیان کر دی ہے۔

☆☆☆نظم کا تجزیہ کرتے کرتے،/پورا گلاب ہی چھیل دیا/مصرعے الگ، الفاظ الگ/ڈنٹھل سا بچا، نہ کھانے کو، نہ سونگھنے کو!/۔۔۔۔۔/خوشبو کچھ ہاتھ پہ مسلی گئی/کچھ مٹی میں گر کے گرد ہوئی/نظم پڑھوں تو وہ بھی اب/خالی برتن سی بجتی ہے!! **(نظم کا تجزیہ کرتے کرتے۔۔۔۔)**

اپنے شعری مجموعہ ''پلوٹو'' کے شروع میں گلزار لکھتے ہیں:

''پلوٹو: پلوٹو سے پلینیٹ کا رُتبہ تو حال ہی میں چھِنا ہے، سائنسدانوں نے کہہ دیا:/''جاؤ۔۔۔ہم تمہیں اپنے نو گرہوں میں نہیں گنتے۔۔۔تم پلینیٹ نہیں ہو!''/میرا رُتبہ تو بہت پہلے چھِن گیا تھا، جب گھر والوں نے کہہ دیا:/''بزنس فیملی میں یہ 'میراثی' کہاں سے آ گیا!''/خاموشی کہتی تھی۔ تم ہم میں سے نہیں ہو!/اب 'پلوٹو' کی اداسی دیکھ کر، میرا جی بیٹھ جاتا ہے۔ بہت دور ہے۔۔۔۔ بہت چھوٹا ہے۔۔۔میرے پاس/جتنی چھوٹی چھوٹی نظمیں تھیں۔ سب اُس کے نام کر دیں۔/بہت سے لمحے چھوٹے، بہت چھوٹے

ہوتے ہیں۔اکثر کھوجاتے ہیں۔مجھے شوق ہے انہیں جمع کرنے/کا/موضوع کے اعتبار سے،اس مجموعے میں بہت سی نظمیں غیر روایتی ہیں۔۔۔لیکن۔۔۔وہ کیا بری بات/ہے؟/ **گلزار"**

لیکن مجھے اس مجموعہ میں پلوٹو کے بارے میں کوئی نظم نہیں ملی۔البتہ ان کے ایک اور شعری مجموعہ''پندرہ پانچ پچھتر''میں **پلوٹو** کے عنوان سے یہ ایک نظم ملتی ہے:

☆☆☆سینکڑوں بار گئے تھے میں نے/جیب میں نو ہی کنچے تھے/ایک جیب سے دوسری جیب میں رکھتے رکھتے/اک کنچہ کھو بیٹھا ہوں/نہ ہارا نہ گرا کہیں پر/'پلوٹو' میرے آسمان سے غائب ہے۔

(سینکڑوں بار گئے تھے میں نے)

تاج محل کے حوالے سے ساحر لدھیانوی کے بعد کوئی نئی نظم لکھنا اچھا خاصا آزمائش کا بلکہ ابتلا کا مقام بن سکتا ہے۔ساحر لدھیانوی نے اس موضوع کو مس کیا تو ترقی پسند گھن گرج کے ساتھ خون کو گرما دینے والی نظم لکھ ڈالی۔گلزار نے تاج محل کو جدید لب و لہجے میں پانی پہ رکھا ہوا آنسو بنا دیا ہے۔کوئی غم وغصہ نہیں،کوئی نعرہ نہیں(غم وغصہ اور نعرہ کی گونج کے باوجود ساحر لدھیانوی کی نظم شاندار فن پارہ ہے)،بس ایک اداس سی کیفیت ہے جس میں قاری اپنی یادوں کے ساتھ مزید اداس ہوتا چلا جاتا ہے۔

☆☆☆تاج ایک لَے ہے،ڈولتی ہوئی/تاج''سم''ہے درد کا/چاندنی میں ایک بلبلہ سا تیرتا ہوا/نیلی کانچ رات میں۔۔۔/کسی نے اک خیال رکھ دیا ہے یہ/تاج استعارہ ہے/۔۔۔۔۔/پانی پر رکھا ہوا/یہ صرف ایک آنسو ہے/ایک اداس یاد ہے/ **(تاج محل)**

صندل/چندن کے بارے میں میری معلومات زیادہ نہیں ہے۔بچپن میں صندل کا شربت پینا یاد ہے۔ایک بار ایک کوٹھی میں جانا ہوا تھا تو اس کے چندن کے دروازوں کی خوشبو سے گزرتا ہوا اندر پہنچا تھا۔یہاں جرمنی میں صندل کی خوشبو بھی کبھی کبھار استعمال کی ہے۔گیتوں کی حد تک''چندن سا بدن،چنچل چتون''بہت اچھا گانا لگتا ہے۔اپنے ادبی معرکوں کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے میں نے ایک غزل کہی تھی ؎

جب اُس نے خاک اُڑانے کا ارادہ کرلیا ہے — تو ہم نے دل کے صحرا کو کشادہ کرلیا ہے
نہیں، اُس جیسی عیّاری تو ممکن ہی نہیں تھی — زمانے سے ذرا بس استفادہ کرلیا ہے
چلو حیدرؔ غنیمت ہے یہ صندل کی مہک بھی — کہ یاروں نے تو لکڑی کا برادہ کرلیا ہے

معرکوں کے مختلف مراحل کی تفصیل میں جانے کا یہ محل نہیں ہے لیکن ان تین اشعار سے تین مختلف مقامات

کا اندازہ ضرور کیا جاسکتا ہے۔اپنا معاملہ صندل کی لکڑی کے برادے والا رہا ہے۔اس تمہید طولانی کا مقصد دراصل گلزار کی اس مختصر نظم تک لانا تھا:

☆☆☆اُس کے گیٹ پہ'چندن' کا اک پیڑ کھڑا ہے/جب بھی اس کے گیٹ میں داخل ہوتا ہوں/اک شاخ اُوپر سے جھک کر آنکھ پہ آجاتی ہے/جتنی بار ہٹایا ہے/کان پہ ایک خراش بچی ہے/۔۔۔۔۔/چندن کے بدن میں خوشبو ہے/چندن پر پھول نہیں آتے!! **(اُس کے گیٹ پہ)**

مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ چندن کے درخت پر پھول نہیں آتے،البتہ چندن کا پورا درخت مہکتا ہے۔

گلزار کی تین نظمیں ایک ساتھ پیش کرتا ہوں۔یہ نظمیں الگ الگ ہوتے ہوئے بھی جیسے زندگی کی داستان کو مربوط کرکے بیان کررہی ہیں۔

☆☆☆ٹہنی پر بیٹھا تھا وہ۔۔۔!/نیچے تھا تالاب کا پانی،اور،/تالاب کے اندر آسمان تھا/ڈوبنے سے ڈر لگتا تھا/نہ تیرا،نہ اُڑا،نہ ڈوبا/ٹہنی پر ہی بیٹھے بیٹھے بالآخر وہ سوکھ گیا!/ایک اکیلی شاخ کا پتّہ **(ٹہنی پر بیٹھا تھا وہ۔۔۔)**

☆☆☆پانی کی عادت ہے بہنا، بہتے رہنا/۔۔۔۔۔/پَیر نہیں ٹکتے دریا کے/دوڑ دوڑ کے چٹّانوں سے/جھرنے کودتے رہتے ہیں/آبشار پہاڑ پکڑ کے نیچے اترتا ہے/تھک جاتا ہے دوڑتے بھاگتے بہتا پانی/جھیل میں جا کر نیند آتی ہے پانی کو!!/ **(پانی کی عادت ہے بہنا۔۔۔)**

☆☆☆مجھے مرا جسم چھوڑ کر بہہ گیا ندی میں!/ابھی اسی دن کی بات ہے میں نہانے اترا تھا گھاٹ پر جب/ٹھٹھر رہا تھا۔۔/وہ چھو کے پانی کی سرد تہذیب ڈر گیا تھا/۔۔۔۔/میں سوچتا تھا/بغیر میرے وہ کیسے کاٹے گا تیز دھارا/وہ بہتے پانی کی بے رُخی جانتا نہیں ہے/وہ ڈوب جائے گا۔۔سوچتا تھا!/۔۔۔۔۔/اب اُس کنارے پہنچ کے مجھ کو بلا رہا ہے/میں اِس کنارے پہ ڈوبتا جا رہا ہوں پیہم/میں کیسے تیروں بغیر اس کے!/۔۔۔۔/مجھے مرا جسم چھوڑ کر بہہ گیا ندی میں!!

(مجھے مرا جسم چھوڑ کر بہہ گیا ندی میں)

اردو شاعری میں ترقی پسندوں کی انقلابی شاعری کا اپنا ایک مقام ہے اور اس تحریک کے شروع ہونے سے کہیں پہلے علامہ اقبال نے بھی غریبوں کے حق میں کلمۂ انقلاب بلند کیا تھا۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روٹی — اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

لیکن تمام تر انقلابی نعروں کے باوجود زمینی حقائق کیا کہتے ہیں۔گلزار کی دو نظموں میں دیکھئے۔ایک نظم میں

اقبال کے حوالے سے جبکہ دوسری نظم میں فیض کے حوالے سے نئی صورتِ حال بتائی گئی ہے۔

☆☆☆ذرا علامہ کو کوئی خبر کر دے/کہ جن کھیتوں سے دہقاں کو میسر نہ ہوئی روٹی/کسی نے کھیت میں جا کر جلایا بھی نہیں/گندم کے خوشوں کو۔۔۔۔۔۔/کہیں کوئی نہیں اُٹھا، نہ کوئی انقلاب آیا/۔۔۔۔۔۔/جنازے اُٹھ رہے ہیں گاؤں گاؤں سے/یہ سب کے سب جنازے ہیں کسانوں کے/جنہوں نے قرض کی مٹی چبا کر خوشی کر لی **(ذرا علامہ کو کوئی خبر کر دے)**

☆☆☆قفس اُداس ہے یارو۔۔!/ہری مرچی کا اک ٹکڑا پڑا ہے/کٹوری پانی کی خالی ہے، اوندھی ہو گئی تھی/پرندہ جا چکا کب کا، قفس میں کچھ نہیں ہے!! **(قفس اُداس ہے یارو)**

ایک اور نظم میں گلزار نے انقلاب کے حوالے سے بڑے پتے کی بات کی ہے۔

☆☆☆سلاخوں کے پیچھے پڑے انقلابی کی آنکھوں میں بھی/راکھ اُترنے لگی ہے!/دہکتا ہوا کوئلہ دیر تک جب نہ پھونکا گیا ہو/تو شعلے کی آنکھوں میں بھی/موتیے کی سفیدی اتر آتی ہے **(راکھ)**

اپنے تمام تر جدید لب و لہجے کے باوجود گلزار کے اندر بھی ایک چھوٹا سا انقلابی کہیں نہ کہیں موجود ہے، یہ انقلابی کہیں ترقی پسندوں کے انداز میں اور کہیں علامہ اقبال کی بات سے ملتے جلتے ہوئے الفاظ میں بات کہنا چاہتا ہے لیکن شاید زیادہ ہمت نہیں رکھتا، اس لیے اپنے غصہ کا اظہار کر کے رہ جاتا ہے۔ تاہم برہمی کا ایسا اظہار بھی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ اہمیت رکھتا ہے۔ ان دو نظموں سے میری بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے

☆☆☆کہیں جانا نہیں ہے،/بس یونہی سڑکوں پہ گھومیں گے/کہیں پر توڑیں گے سگنل/کسی کی راہ روکیں گے/کوئی چلّا کے گالی دے گا/کوئی 'ہورن' بجائے گا!/۔۔۔۔/ذرا احساس تو ہو گا کہ زندہ ہیں/ہماری کوئی ہستی ہے!! **(کہیں جانا نہیں ہے۔۔۔)**

☆☆☆میں سگریٹ تو نہیں پیتا۔۔۔/مگر ہر آنے والے سے بس اتنا پوچھ لیتا ہوں کہ ''ماچس ہے؟''/بہت کچھ ہے جسے میں پھونک دینا چاہتا ہوں/مگر ہمت نہیں ہوتی!

(میں سگریٹ تو نہیں پیتا۔۔۔)

خالقِ کائنات کے بارے میں گلزار کے تصورات کو میں ان کے عقیدہ کی آزادی کا حق سمجھتا ہوں، لیکن گلزار کی ایسی نظموں کو پڑھتے ہوئے مجھے کئی بار یہ خیال آیا ہے کہ اپنے عقائد اور تصورات کے ساتھ گلزار نے ''او مائی گاڈ!'' جیسی کوئی فلم کیوں نہیں بنائی؟ مجھے گلزار کی اس موضوع پر لکھی گئی ساری

نظموں سے زیادہ ''او مائی گاڈ!'' جیسی فلم زیادہ دلچسپ اور بڑی تخلیق محسوس ہوتی ہے۔ خدا کرے کہ صحت اجازت دے اور گلزار ہمت سے کام لیں تو اس موضوع کی بنیاد پر ابھی بھی ایک نئی فلم بنا ڈالیں۔

گلزار اپنی نظموں میں اپنی جنم بھومی دینہ کی یاد میں ایک عمر نہیں، ساری عمریں گزار دیتے ہیں۔ جنم بھومی کی اتنی شدید یاد گلزار کے اندر کا دراوڑی رویہ ہے۔ جنم بھومی سے نکالے گئے، ابو کی ناراضی کے باعث گھر سے نکالے گئے، لیکن دینہ کی یاد ہو یا ابو کی یاد دونوں ہی گلزار کے اندر دھونی رما کر بیٹھی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے حال سے گزرتے ہوئے ماضی کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہاں بوسکی کی صورت میں انہیں یادوں کے سحر سے نکل کر مستقبل کی طرف جانے کے لیے مواقع ملتے رہے ہیں۔ گلزار کو بھی اس کا ادراک ہے۔ اس ادراک کی ایک جھلک اس نظم میں دیکھئے:

☆☆☆ابھی نہ پردہ گراؤ ٹھہرو، کہ داستاں آگے اور بھی ہے/ابھی نہ پردہ گراؤ ٹھہرو۔۔۔/ابھی تو ٹوٹی ہے کچی مٹی، ابھی تو بس جسم ہی گرے ہیں/ابھی تو کردار ہی بجھے ہیں/ابھی سلگتے ہیں روح کے غم/ابھی دھڑکتے ہیں درد دل کے/ابھی تو احساس جی رہا ہے/یہ لَو بچا لو، جو تھک کے کردار کی ہتھیلی سے گر پڑی ہے/یہ لَو بچا لو، یہیں سے اُٹھے گی جستجو پھر بگولا بن کر/یہیں سے اُٹھے گا کوئی کردار پھر اسی روشنی کو لے کر/کہیں تو انجام و جستجو کے سرے ملیں گے/ابھی نہ پردہ گراؤ ٹھہرو!

(ابھی نہ پردہ گراؤ۔۔۔)

عام طور پر جو شعراء نظم اور غزل دونوں میں طبع آزمائی کرتے ہیں، ان کی نظموں پر بھی غزلیہ انداز تھوڑا بہت حاوی ہو جاتا ہے۔ لیکن گلزار کی نظمیں اتنی بھرپور ہیں کہ ان کی غزلوں پر بھی نظمیت سی چھائی ہوئی ملتی ہے۔ تاہم جہاں کہیں وہ نظمیت کے اثر سے باہر آتے ہیں، ان کی غزلیں ایک نئی چھب کے ساتھ دکھائی دینے لگتی ہیں۔ ان کی غزل کے اس نوعیت کے چند خوبصورت اشعار یہاں پیش کر رہا ہوں۔

کائی سی جم گئی ہے آنکھوں پر
سارا منظر ہرا سا رہتا ہے

جسم اور جاں ٹٹول کر دیکھیں
یہ پٹاری بھی کھول کر دیکھیں

کوئی اٹکا ہوا ہے پل شاید
وقت میں پڑ گیا ہے بل شاید

خون نکلے تو زخم لگتی ہے
ورنہ ہر چوٹ نظم لگتی ہے

پھول نے ٹہنی سے اُڑنے کی کوشش کی اک تتلی کا دل رکھنے کی کوشش کی
کتنی لمبی خاموشی سے گزرا ہوں ان سے کتنا کچھ کہنے کی کوشش کی

جانے کس کا ذکر ہے اس افسانے میں
درد مزے لیتا ہے جو دوہرانے میں

صبر ہر بار اختیار کیا ہم سے ہوتا نہیں، ہزار کیا
عادتاً تم نے کر دیئے وعدے عادتاً ہم نے اعتبار کیا
ہم نے اکثر تمہاری راہوں میں رُک کے اپنا ہی انتظار کیا

مجھے اندھیرے میں بے شک بٹھا دیا ہوتا
مگر چراغ کی صورت جلا دیا ہوتا

کتاب بند کی اور اُٹھ کے چل دیا
تمام داستان ساتھ لے گیا

تجھ کو دیکھا ہے جو دریا نے ادھر آتے ہوئے
کچھ بھنور ڈوب گئے پانی میں چکراتے ہوئے

ہر ایک غم نچوڑ کے، ہر ایک رس جیے
دو دن کی زندگی میں ہزاروں برس جیے

زمیں سا دوسرا کوئی سخی کہاں ہوگا
ذرا سا بیج اسے دو تو پیڑ دیتی ہے

آ کے ہم آستاں پہ بیٹھ گئے چل چلاؤ کا وقت ہے بھائی
آدمی خود ہی دوڑے جاتا ہے خود ہی چابک بدست ہے بھائی

گرم لاشیں گریں فصیلوں سے آسماں بھر گیا ہے چیلوں سے
پیاس بھرتی رہی مرے اندر آنکھ ہٹتی نہیں تھی جھیلوں سے

سہ مصرعی شاعری میں ہائیکو، ماہیا، ثلاثی اور ترونی کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ گلزار ترونی کے بانی ہیں اور میں ماہیا کا محض خدمت گزار۔ (اردو ماہیا کے بانی ہمت رائے شرما ہیں)۔ مذکورہ بالا چاروں شعری اصناف میں سے ماہیا واحد صنف ہے جس کی جڑیں اپنی دھرتی میں پیوست ہیں اور جس کے ذریعے ہمارا مقامی کلچر از خود اُگ کر آ جاتا ہے۔

اس لحاظ سے ماہیا کے اندر اپنی مقامیت اور اپنی ثقافت کے امکانات کسی بھی دوسری سہ مصرعی صنف سے کہیں زیادہ ہیں۔ یوں تو ہر شاعر کو حق حاصل ہے وہ جس صنف میں چاہے اپنا اظہار کرے۔ تاہم مجھے کبھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر گلزار جیسے ایک دو شاعروں نے ماہیا کو مس کیا ہوتا تو یہ صنف اردو میں کہیں زیادہ مستحکم ہو گئی ہوتی۔ گلزار کی ترونی میں بھی کچھ خاص بات ضرور ہے۔

وہ میرے ساتھ ہی تھا دور تک، مگر اک دن
جو مُڑ کے دیکھا تو وہ دوست میرے ساتھ نہ تھا

پھٹی ہو جیب تو کچھ سکے کھو بھی جاتے ہیں

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

نہ ہر سحر کا وہ جھگڑا نہ شب کی بے چینی
نہ چولھا جلتا ہے گھر میں نہ آنکھیں جلتی ہیں

میں کتنے امن سے گھر میں اداس رہتا ہوں

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

میں بس میں بیٹھا ڈھونڈنے لگا مُڑ کے
نہ جانے کیوں یہ لگا، تم وہیں کہیں پر ہو

تمہارا ''سینٹ'' کسی اور نے لگایا تھا

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

لوگ میلوں میں بھی گم ہو کر ملے ہیں بارہا
داستانوں کے کسی دلچسپ سے اک موڑ پر!

یوں ہمیشہ کے لیے بھی کیا بچھڑتا ہے کوئی

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

ایسے بکھرے ہیں رات دن، جیسے
موتیوں والا ہار ٹوٹ گیا

تم نے مجھ کو پرو کے رکھا تھا

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

جہاں تک گلزار کے فلمی گیتوں کا تعلق ہے، اپنے الگ ذائقہ کے باعث یہ مجھ جیسے بے شمار سننے والوں کو ہمیشہ اچھے لگے ہیں، اچھے لگتے رہیں گے۔ میں نے شروع میں گلزار کے امر گیت ''ہم نے دیکھی ہے ان آنکھوں کی مہکتی خوشبو'' کا اور تازہ گیت ''سُریلی اکھیوں والے۔۔۔۔۔'' کا ذکر کیا

ہے۔ ایسے گیت جن کے درمیان فلم **آندھی** اور **موسم** کے شاہکار گیت ہوں۔ اور ایسے ہی اور بہت سارے گیت ہوں، بندہ کس کس گیت کا ذکر کرے؟ اس کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہوگا کہ ایسے گیتوں کے ساتھ خود ہماری اپنی یادیں بھی وابستہ ہوتی ہیں اور ہر گیت ہماری ایک کہانی اپنے دامن میں لیے ہوتا ہے۔ ہاں یہاں میں یہ وضاحت ضرور کروں گا کہ ہماری ادبی دنیا میں بعض لوگ ادب کے نام پر فلموں کے لیے لکھے گئے گیتوں کو ہی کم تر نہیں قرار دیتے، فلمی گیت لکھنے والے اچھے سے اچھے شاعر کو بھی اچھا شاعر ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہ دراصل ادب کے نام کی آڑ لے کر ہماری بعض ادبی شخصیات کا اپنا احساسِ کمتری ہوتا ہے۔ جس طرح ادبی دنیا میں بے شمار شاعر ہیں۔ ان میں سے بعض بہت عمدہ ہیں، بعض اوسط درجہ کے ہیں، بعض معمولی ہیں اور بہت سارے معمولی سے بھی کم تر درجہ کے ہیں، ایسے ہی فلمی دنیا میں بھی درجہ بندی کی جا سکتی ہے۔ اگر کوئی شاعر اچھا ہے تو وہ فلم کے لیے بھی لکھے گا تو گیتوں میں جان ڈال دے گا۔ اگر کوئی اچھا شاعر نہیں ہے تو بے شک وہ فلموں کے لیے نہ لکھتا ہو، (یا لکھنے کے لیے ترستا رہتا ہو) تو فلمی گیت نہ لکھنے کے باوجود وہ بُرا شاعر ہی رہے گا۔

گلزار فلمی شاعر ہو کر بھی نہایت عمدہ ادبی شاعر ہیں۔ پاکستان اور انڈیا دونوں طرف ادبی لحاظ سے ان کا خاص حلقۂ احباب ان بزرگوں پر مشتمل ہے جن سے میرا مزاج نہیں مل سکا۔ ایسے ادبی احباب کا پس منظر رکھنے والے گلزار کے لیے میں نے یہ مضمون اتنی ادبی چاہت کے ساتھ لکھا ہے تو یہ دراصل گلزار کی شاعری کا جادو ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ گلزار کی نظموں کے کئی پہلوؤں نے نظر انداز کیے ہیں، ان پر ابھی مزید لکھنے کی بہت ساری گنجائش موجود ہے۔ غزلیں اور ترویینیاں بھی ایک ایک الگ مضمون کا مزید تقاضا کرتی ہیں۔ اور گیتوں کے بارے میں پہلے ہی اقرار کر چکا ہوں کہ ان کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہوگا۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ مجھے زندگی کی طرف سے اتنی مہلت نہیں مل پائے گی کہ میں یہ سارے کام کر سکوں۔ سو اسی ایک مضمون کے ذریعے اپنے پسندیدہ شاعر کے بارے میں اپنی بات کر کے اپنی ادبی محبت کا تھوڑا سا قرض ادا کر رہا ہوں!

مطبوعہ ''کولاژ''۔ کراچی۔ **گلزار نمبر**۔ ۲۰۱۵ء

کشور ناہید کا کالم اور اصل حقائق

(ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کے حوالے سے)

اپنی کتاب **ہمارا ادبی منظر نامہ** کے اختتامیہ میں ادبی دنیا کی عمومی صورتِ حال کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کشور ناہید کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا، یہاں پیش کر رہا ہوں۔

''کشور ناہید کی قلمی کاری گری بھی اپنی جگہ کمال کی ہے۔ایک ہی کالم کے تیر سے ایک طرف انتظار حسین کی خبر لیتی ہیں کہ وہ صرف گوپی چند نارنگ کی ہی تعریف وتوصیف کیے جا رہے ہیں تو دوسری طرف گوپی چند نارنگ کے سابقہ احسانات فراموش کر کے ان پر بھی کچھ ان الفاظ میں حملہ زن ہو جاتی ہیں:

''نام پڑ گیا ہر جگہ نارنگ صاحب کا۔مانا وہ بہت گنی آدمی ہیں۔جس کو چاہتے ہیں آج بھی انعام دلوا دیتے ہیں۔دعوت نامہ بھیج دیتے ہیں۔اور جس کو کاٹنا ہو بس اس کی شامت۔خیر بہت کام کرتے ہیں دنیا بھر میں۔محبت اور کام کرنے میں ان کی بیوی منورما بھی کسی سے کم نہیں۔مگر برا ہو شاہد بھنڈاری جیسے لکھنے والوں کا کہ سب کچھ جو کہیں سے لیا ہے، وہ صاف بتا دیتا ہے کہ یہ مستعار کہاں کہاں سے ہے۔''

(کشور ناہید کا کالم ''جستجو کیا ہے''۔مطبوعہ روزنامہ جنگ۔۱۸ نومبر ۲۰۱۱ء)

جب نارنگ صاحب کے ساتھیوں کے ساتھ گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا، کشور ناہید جیسے لکھنے والے سب اپنے اپنے مفادات کی فصلیں کاٹ رہے تھے۔بلکہ تب کشور ناہید نے ایک کالم میں ناحق طور پر شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو بھی ان معاملات کا ذمہ دار قرار دے دیا تھا۔تو اب یکا یک انہیں نارنگ صاحب کی مستعار تحریروں کا خیال کیسے آ گیا؟ اس کالم سے پہلے کا کچھ عرصہ چیک کر لیں۔انڈیا کی ادبی تقریبات میں جہاں نارنگ صاحب کا عمل دخل تھا وہاں کشور ناہید کے دورے رُک گئے تھے۔اور اس کالم کے بعد کا ریکارڈ دیکھ لیں کہ وہ دورے پھر بحال ہو گئے تھے۔تو اخباری کالموں کے سہارے زندہ رہنے والے ہمارے ادیبوں، دانشوروں کی ساری حق گوئی و بے باکی کا حدود اربعہ بس اتنے سے مفادات میں گھرا ہوا جزیرہ ہے۔'' **(ہمارا ادبی منظر نامہ۔ص ۹۷۷۔۹۷۸)**

میں نے کشور ناہید کی حق گوئی و بے باکی کو دعوت ناموں کے مفادات میں گھرا ہوا جزیرہ قرار دیا تھا۔اس کی مزید تصدیق ان کے ایک نئے کالم کے ذریعے ہو رہی ہے۔حالیہ دنوں میں انہیں نہ صرف انڈیا جانے کا موقعہ ملا بلکہ کئی شہروں کی تقریبات میں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔چونکہ یہ سب کچھ درحقیقت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی نظرِ عنایت کے باعث ہوا تھا، اس لیے انہوں نے حق الخدمت کے طور پر ایک کالم لکھا، جس کا عنوان ہی بڑا دھانسو قسم کا ہے ''اردو ادب کے مہادیو۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ''۔ یہ کالم روزنامہ جنگ لاہور۔۳؍اپریل ۲۰۱۵ء میں شائع ہوا ہے۔اگر کشور ناہید نارنگ صاحب کی جائز و ناجائز تعریف وتوصیف تک محدود رہ کر اپنا پبلک ریلشننگ کا سلسلہ جاری رکھتیں تو مجھے اس کا نوٹس لینے کی ضرورت نہیں تھی۔آخر ایک دنیا اسی کاروبار میں مصروف ہے اور ہر ایک کے پاس اس کا جواز بھی موجود ہے۔لیکن اس کالم میں ان کی بیان کردہ دو باتوں کی وجہ سے مجھے اس کا نوٹس لینا پڑ گیا ہے۔ان کی دو باتیں ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہیں۔

۱۔''کوئی دشمن بھنڈر کی طرح ان کے علمی تجربہ پر وار کرے تو وہ ایرے غیرے سے جواب نہیں دلواتے بلکہ خود تحقیق کے ترازو میں تول کر جواب دیتے ہیں''

۲۔''حریفوں نے جب بھی انہیں اُڑانے کی کوشش کی وہ خود پس غبار میں گئے۔''

جب کشور ناہید کو گوپی چند نارنگ صاحب انڈیا کے ادبی دورے نہیں کرا رہے تھے، تب ان کے بقول:

''برا ہو شاہد بھنڈاری جیسے لکھنے والوں کا کہ سب کچھ جو کہیں سے لیا ہے، وہ صاف بتا دیتا ہے کہ یہ مستعار کہاں کہاں سے ہے۔''

اور ایک ہی دعوت نامہ کے نتیجہ میں کئی شہروں کی تقریبات بھگتا کر آئیں تو اسی بھنڈر کو یوں زد پر رکھ رہی ہیں:

''کوئی دشمن بھنڈر کی طرح ان کے علمی تجربہ پر وار کرے تو وہ ایرے غیرے سے جواب نہیں دلواتے بلکہ خود تحقیق کے ترازو میں تول کر جواب دیتے ہیں''۔

بہتر ہو کہ محترمہ خود بتائیں کہ انہوں نے پہلے جھوٹ لکھا تھا یا اب جھوٹ لکھ رہی ہیں؟

کشور ناہید کے مفاداتی تضاد سے قطع نظر واقعاتی طور پر بھی انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔جب نارنگ صاحب پر ترجمہ بلا حوالہ کا الزام آیا تھا، تب انہوں نے ایروں غیروں سے ہی جواب دلائے تھے اور ابھی تک انہوں نے خود اس الزام کا کوئی مدلل تو کیا غیر مدلل جواب بھی نہیں دیا۔حالانکہ وہ

اس موضوع پر بھنڈر کے پہلے مضمون کے جواب میں کچھ لکھ دیتے تو یہ معاملہ شدت اختیار نہ کرتا۔اس سلسلہ میں میری یہ تحریر ریکارڈ پر موجود ہے۔

''ایک بار پھر واضح کر رہا ہوں کہ جہاں تک ترجمہ بلا حوالہ کے الزام کا تعلق ہے،عمران بھنڈر اس معاملہ میں اصل الزام کی حد سے آگے تک نکل گیا تھا اور اپنی اوقات سے باہر ہو گیا تھا لیکن یہ الزام یکسر غلط ہرگز نہیں تھا۔اگر نارنگ صاحب شروع میں ہی دانشمندانہ طریق سے اس پر ردِعمل ظاہر کر دیتے تو بات پہلے مضمون کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی۔لیکن جیسے جیسے ان کا دفاع کرنے والے غیر ادبی طریق سے حملہ آور ہوتے چلے گئے ویسے ویسے ان کا تماشہ بنتا چلا گیا۔''

(مضمون۔ماردھاڑ سے ادبی حقیقتِ حال تک۔بحوالہ:ہمارا ادبی منظر نامہ۔ص۔۱۸۷)

نارنگ صاحب نے ترجمہ بلا حوالہ کے الزام کا خود کوئی معقول جواب دینے کی بجائے اپنے ''ایروں غیروں'' سے کام چلانے کی کوشش کی،یوں ''ترجمہ بلا حوالہ'' کا الزام اُن کے کارندوں کی مار دھاڑ کے ردِعمل میں سرقہ،چوری اور ادبی ڈاکہ سے موسوم ہوتا چلا گیا۔نقصان ان کا اپنا ہی ہوا۔کشور ناہید کے خوشامدانہ کالم کی غلط بیانی نے ایک بار پھر حقیقت کو ظاہر کر دیا ہے۔اگر نارنگ صاحب نے ترجمہ بلا حوالہ کے الزام کا کوئی معقول جواب کبھی دیا تھا تو کشور ناہید پر لازم ہے کہ ان کی اس تحریر کو سامنے لائیں۔نارنگ صاحب کا ایسا کوئی وضاحتی مضمون پیش نہیں کیا جا سکے گا۔

بھنڈر کے بعض حوالہ جات نظر ثانی کا تقاضا ضرور کرتے ہیں،لیکن ان کے پیش کردہ بیشتر حوالے فکر مند کرنے والے ہیں۔بھنڈر نے تہذیب،شائستگی اور ادبی سلیقے کے ساتھ اپنا کیس پیش کیا ہوتا تو بعد میں اس کی وہ عبرت ناک حالت نہ ہوتی جو اَب ادب کی تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ایک مقبول روزنامہ میں پیہم لکھنے کی مشقت کرنے کے باوجود اس کی کوئی ادبی تو کیا صحافیانہ حیثیت بھی نہیں بن سکی۔اس کا یہ انجام نارنگ صاحب کی کسی کرامت کا نتیجہ نہیں بلکہ بھنڈر کی اپنی بدزبانی کا نتیجہ ہے۔مجھے بھنڈر کے غیر مہذب لب ولہجہ سے اختلاف تھا اور اختلاف ہے۔لیکن اس کے باوجود نارنگ صاحب پر ترجمہ بلا حوالہ کا الزام یکسر غلط نہیں ہے۔تہذیب،شائستگی اور ادبی سلیقے کے ساتھ یہ بات نارنگ صاحب کے نیاز مند اور معروف نقاد ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے بھی نہ صرف تسلیم کی ہے بلکہ اسے اپنے تحقیقی مقالہ کا حصہ بنایا ہے۔میں اپنے مضمون **''ماردھاڑ سے ادبی حقیقتِ حال تک''** میں ناصر عباس نیر کا ایک اقتباس انگریزی اور اردو متن کے ساتھ پیش کر چکا ہوں۔یہاں اسی اقتباس کے بعد کی عبارت بطور ثبوت پیش کر رہا

ہوں۔اسے کسی مخالف کی نہیں بلکہ گھر کے اندر کی گواہی شمار کیا جا سکتا ہے۔

(ساختیات،پس ساختیات اور مشرقی شعریات،ص۳۱)

اور

(Catherine Belsey, Critical Practice, P 4)

کا اقتباس پہلو بہ پہلو دینے کے بعد ناصر عباس نیر لکھتے ہیں۔

''یہ مثال اس کتاب سے لی گئی ہے،جسے اردو میں ساختیات اور پس ساختیات کی بائبل کا درجہ دیا گیا ہے۔(۸) ہر چند مصنف نے کتابیات میں ان کتابوں کو ستارے کے نشان سے ممیّز کیا ہے اور حاشیے میں لکھا ہے کہ ان کتابوں سے بہ طور خاص استفادہ کیا گیا ہے،مگر مذکورہ مثال کی روشنی میں،یہ استفادہ نہیں راست ترجمہ ہے۔استفادے اور ترجمے کے مطالب بین ہیں،لہٰذا ان پر مزید روشنی ڈالنے کی ہرگز ضرورت نہیں۔جن کتابوں سے ترجمہ کیا گیا ہے،ان کا حوالہ اس متن میں موجود نہیں،جو ترجمہ ہے۔اس طرح ان ترجمہ شدہ حصوں کو مصنف نے اپنے خیالات بنا کر پیش کیا ہے۔یہ عمل علمی دیانت داری کے مسلمہ اصولوں سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہے۔

ساختیات،پس ساختیات اور مشرقی شعریات،کے بیش تر مندرجات جن کتابوں سے ترجمہ ہیں یا جن کی تسہیل کی گئی ہے،وہ ساختیات اور پس ساختیات کے بنیادی ماخذ نہیں ہیں۔

(اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر۔ باب۷۔ص۲۵۱۔)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر حوالہ(۸) کے تحت حاشیہ میں لکھتے ہیں:

حواشی:۸- اس کتاب کے بیش تر مقالات بعض انگریزی کتابوں سے براہ راست ترجمہ ہیں،مثلاً باب اوّل کا پہلا حصہ کیتھرین بیلسی کی مذکورہ کتاب،باب اوّل کا حصہ تنقیدی دبستان اور ساختیات،رامن سیلڈن اور پیٹر وڈوسن کی کتاب Contemporary Literary Theory کے صفحات ۳ تا ۶ کا ترجمہ ہیں۔دوسرے باب کے آخری صفحات جوناتھن کلّر کی کتاب Structuralist Poetics کے صفحات ۶ تا ۷ کا ترجمہ ہیں۔کتاب ۲ کا پہلا باب ''رولاں بارت،پس ساختیات کا پیش رو کے صفحات ۱۶۱ تا ۱۶۴،جان سٹروک کی کتاب Structuralism and Since کے صفحات ۵۳ تا ۶۰ کا ترجمہ ہیں۔''

(''اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات'' از ڈاکٹر ناصر عباس نیر۔باب۷۔ص۲۸۳)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر کا ایک اور بیان بھی دیکھ لیں۔کیتھرین بیلسی نے آلیتھوسے کے حوالے سے جو لکھا

ہے۔انگریزی حوالے کے بعد ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

۔۔۔۔۔۔''اس طور نئی تھیوری میں آئیڈیالوجی کو (i) فرد کے حقیقی تجربے سے جوڑا گیا ہے۔ (ii) فرد کا اختیاری نہیں، لازمی و غیر اختیاری معاملہ قرار دیا گیا ہے (iii) مانوس اور تشکیک سے مبرا ''سچائی'' سمجھا گیا ہے۔اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آئیڈیالوجی زبان کے اندر لکھی ہوئی ہے۔زبان کو وسیلہ اظہار بناتے ہوئے آئیڈیالوجی فرد کے شعور اور ادراک میں، قطعاً غیر محسوس انداز میں شامل ہو جاتی ہے۔**گوپی چند نارنگ نے آئیڈیالوجی کی اسی تھیوری کو قبول کیا اور اپنی تحریروں میں جا بجا اسے اپنے موقف کے طور پر پیش کیا ہے۔'' (اردو تنقید پر مغربی تنقید کے اثرات۔ڈاکٹر ناصر عباس نیر۔ باب ۷۔ص ۲۷۶)**

سو اب بھنڈر کی بدتہذیبی اور بدزبانی کو ایک طرف بھی کر دیں تو ترجمہ بلاحوالہ کا جو الزام نارنگ صاحب پر لگا ہوا ہے، وہ ان کے اپنے گھر کے اندر کی گواہی کے مطابق بھی ختم نہیں ہوتا۔اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس بارے میں نارنگ صاحب خود ہی اپنا موقف بیان کر دیں۔ورنہ سب کچھ ادب کی تاریخ میں محفوظ ہو چکا ہے۔تھوڑا عرصہ گزرنے کے بعد جب کوئی دعوت نامہ دینے والا اور دعوت نامہ لینے والا نہیں ہوگا، تب دستیاب شواہد اور حقائق کی بنیاد پر وقت خود اپنا فیصلہ سنائے گا۔

کشور ناہید کا دوسرا بیان بجائے خود کنفیوژن کا شکار ہے۔لکھتی ہیں۔

''حریفوں نے جب بھی انہیں اُڑانے کی کوشش کی وہ خود پس غبار میں گئے۔''

غالباً محترمہ یہ فرما رہی ہیں کہ جب بھی کسی نے نارنگ صاحب پر کوئی الزام لگایا نارنگ صاحب کا کچھ نہیں بگڑا البتہ الزام لگانے والے اپنی مخالفت کے غبار میں خود ہی گم ہو کر رہ گئے۔

اگر یہ بیان خود کشور ناہید صاحبہ کی پہلی مخالفت والی بات (**''جستجو کیا ہے''۔مطبوعہ روزنامہ جنگ۔۱۸ نومبر ۲۰۱۱ء**) کے تناظر میں ہے تو بالکل درست ہے۔وہ ایک دعوت نامہ کی طلب میں نارنگ صاحب کی مخالفت میں جہاں چلی گئی تھیں وہاں سے انہیں غائب ہونا پڑا۔یعنی اپنے ہی غبار میں گم ہو گئیں۔لیکن جن لوگوں نے ترجمہ بلاحوالہ کے مسئلہ کو علمی و ادبی رنگ میں بیان کیا، اُن میں سے کوئی بھی کسی غبار میں گم نہیں ہوا۔ناصر عباس نیر مطلع ادب پر موجود ہیں۔میں اپنی ۹۹۶ صفحات کی کتاب **ہمارا ادبی منظر نامہ** کے ساتھ پورے شواہد اور حقائق کے ساتھ کتابی صورت میں بھی اور انٹرنیٹ پر بھی موجود ہوں۔کسی مار دھاڑ کے بغیر علمی و ادبی زبان میں مکالمہ کے لیے ہمہ وقت حاضر ہوں۔(جیسے اب حاضر ہو گیا ہوں)۔البتہ جب سے اس جھگڑے میں نارنگ صاحب کے ''ایرے غیرے'' ٹائپ کارندوں نے گرد اُڑائی تھی، تب سے نارنگ

صاحب اپنی مجلسی زندگی سے غائب سے ہو کر رہ گئے ہیں۔کینیڈا سے کراچی تک کی بعض تقریبات میں انہیں بار بار ترجمہ بلاحوالہ کے الزام کا سامنا کرنا پڑا تھا، نتیجہ یہ نکلا کہ بے حد احتیاط کے ساتھ منعقد کی جانے والی تقریبات سے بھی نارنگ صاحب غائب ہونے لگے۔اسی پس منظر میں نارنگ صاحب کے عزیز دوست ظفر اقبال نے مزاحیہ انداز سے ان کا کتبہ ان الفاظ میں شائع کیا تھا۔

''**گوپی چند نارنگ**: حضرات حیدر قریشی اور عمران شاہد بھنڈر کی طرف سے مغربی مصنفین کی تحریروں سے سرقے کے جھوٹے سچے تابڑ توڑ الزامات کے بعد ایسے دل گرفتہ ہوئے کہ تارک الدنیا ہو گئے۔یار لوگوں نے ڈھونڈ تو نکالا اور دوبارہ دنیاداری کی طرف مائل کرنے کی کوشش بھی کی لیکن جو روگ دل کو لگا بیٹھے تھے آخر جان لیوا ثابت ہوا۔آخری رسوم میں شمولیت کے لیے پاکستان سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر سیدھے شمشان گھاٹ پہنچے اور ارتھی کے کنارے کھڑے ہو کر حاضرین کے سامنے اپنا معرکتہ الآراء مضمون ''مابعد جدیدیت'' پڑھا جو سور گباشی کے علاوہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔''خبر نامۂ شب خون'' کی طرف سے بھجوائے گئے پیغامِ تعزیت میں کہا گیا کہ ایسی ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔کیونکہ ایک آدمی کے لیے روز روز پیدا ہونا کوئی معمولی کام نہیں ہے۔حکومت کی طرف سے ساہتیہ اکیڈمی کا نام تبدیل کر کے نارنگ ساہتیہ اکیڈمی رکھ دیا گیا۔

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا''

(دال دلیا از ظفر اقبال۔روزنامہ دنیا لاہور۔۲۰ اگست ۲۰۱۴ء)

صرف یہی نہیں، خود کشور ناہید جس حالیہ ہندیاترا پر گئی تھیں، اس دوران ایک تقریب ہندی، اردو ساہتیہ ایوارڈ اکیڈمی لکھنو کے زیر اہتمام لکھنو میں بھی ہوئی تھی۔یہ تقریب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ صاحب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں تھی لیکن اس تقریب میں بھی ڈاکٹر نارنگ صاحب دکھائی نہیں دیئے۔حالانکہ وہاں تو سب ان کے اپنے ہی لوگ تھے۔سو پس غبار ہو جانے والی بات کہیں اور جا رہی ہے۔رہے نام اللہ کا!

کشور ناہید کا کالم ''جستجو کیا ہے؟'' دراصل انتظار حسین کی خودنوشت پر تبصرہ تھا۔تبصرہ کیا تھا غم و غصہ کا اظہار تھا۔مختلف لوگوں کے نام لے لے کر لکھا کہ انتظار حسین نے ان کا ذکر نہیں کیا یا بہت کم کیا ہے، جبکہ اس مخالفانہ کالم کا اصل غم یہ تھا کہ انتظار حسین نے کشور ناہید کو ایک طرح سے نظر انداز کر دیا تھا۔سو کالم

نگاری کی دھونس جما کر جہاں کشور ناہید دعوت نامے حاصل کر لیتی ہیں، وہیں اس انداز میں بھڑاس نکال کر اپنا دل کا بوجھ بھی کم کر لیتی ہیں۔

ہند یاترا کے بعد نارنگ صاحب کی شان میں اتنا توصیفی کالم لکھنے کے دوران کشور ناہید نے بڑے اچھے پیرائے میں نارنگ صاحب سے ایک فرمائش بھی کر ڈالی ہے۔یعنی صرف دعوت نامے کافی نہیں ہیں، کچھ اور بھی چاہئے۔ یہ ''کچھ اور'' کیا ہے؟ کشور ناہید کے اپنے الفاظ میں دیکھ لیں۔

''میری جیسی لکھنے والیاں جنہوں نے اپنے سفید بالوں کو کالا کیا ہوا ہے، وہ بھی نارنگ صاحب کی تاریخیت میں اپنا حوالہ چاہتی ہیں کہ ان میں بھی انسانی تجربے کی صدیاں سمٹی ہوئی ہیں۔''

کشور ناہید کی اس 'خود شناسی' پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہوں اور نارنگ صاحب اور کشور ناہید کے مشترکہ دوست ظفر اقبال کے ایک جملہ پر بات مکمل کرتا ہوں۔ان کے کالم میں یہ جملہ کسی اور پس منظر کے ساتھ کشور ناہید کے لیے لکھا گیا تھا۔موجودہ پس منظر میں بھی یہ جملہ کشور ناہید کے لیے بے حد مناسب ہے۔

''شعر و ادب میں رعائتی نمبر نہیں ہوتے اور جو لوگ یہ نمبر دیتے ہیں وہ خود بھی رعائتی نمبروں کے محتاج ہوتے ہیں۔''

(مطبوعہ دال دلیا از ظفر اقبال۔روزنامہ دنیا لاہور۔۶ر مارچ ۲۰۱۵ء)

نوٹ: جو دوست میری کتاب **ہمارا ادبی منظر نامہ** انٹرنیٹ سے ڈاؤن لوڈ کرنا چاہیں، ان کے لیے اس کے چند لنک درج کر رہا ہوں۔کسی لنک سے بھی کتاب ڈاؤن لوڈ کر سکتے ہیں

http://hamara-adabi-manzarnama.blogspot.de/

http://kuliat-library.blogspot.de/

http://issuu.com/haiderqureshi

https://archive.org/details/HamaraAdabiManzarNamaByHaiderQureshi

---

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۲۱۔ستمبر ۲۰۱۵ء

رضیہ اسماعیل کے مجموعہ ''آدھی چادر'' کے افسانے

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل شاعری کی مختلف اصناف (غزل، نظم، ماہیا، دوہے، وغیرہ) میں اپنے تخلیقی جوہر دکھانے کے ساتھ نثر نگاری میں بھی مسلسل پیش قدمی کر رہی ہیں۔تنقیدی و تعارفی مضامین اور طنز و مزاح پر مشتمل تحریریں وہ ایک عرصہ سے لکھ رہی ہیں۔ان کے بعض شاندار خاکے بھی پڑھنے کا موقعہ ملا ہے، پھر ان کی علمی بحث کے ساتھ شائع ہونے والا کہانیوں کا مجموعہ ''کہانی بول پڑتی ہے''۔یہ ساری شعری و نثری نگارشات میں دلچسپی کے ساتھ پڑھتا آ رہا ہوں۔اب ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے گیارہ افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر شائع ہونے جا رہا ہے۔اس کی ان پیج فائل میرے سامنے ہے۔میں اس مجموعہ کے سارے افسانے پڑھ چکا ہوں اور اب ان کے بارے اپنی رائے دے سکتا ہوں۔پہلے میں ترتیب وار ہر افسانے کا ممکنہ اختصار کے ساتھ ذکر کروں گا اور آخر میں سارے افسانوں پر اپنی مجموعی رائے بیان کر دوں گا۔

''روشنی کا تعاقب'' صوفیانہ خیالات سے لبریز انسان کی خارجی خباثتوں اور داخلی خوبصورتیوں کی دلچسپ کہانی ہے۔فرانز کافکا کی کہانی کی طرح رضیہ اسماعیل مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کے عمل سے ایسے گزرتی ہیں کہ خود دیکھنے کے ساتھ اپنے قارئین کو بھی مٹھی بھر زندگی قریب سے دکھاتی چلی جاتی ہیں۔ایسی زندگی جہاں بہت سارے کہے اور ان کہے سوال ہیں اور سوالوں کے اندر ہی کہیں ان کے جوابوں کی روشنی بھی ہے۔

''کمرے کی کھڑکی ہر روز کھلتی اور بند ہوتی رہی۔مٹھی بھر زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش میں ہر بار نئی رام کہانی، نئی بپتا، نیا منظر نامہ، نئے کردار، نئے سوال، نئے جواب سامنے آ جاتے۔گویا سوچوں کی اَن گنت کھڑکیاں کھل کر کبھی دل، کبھی ذہن تو کبھی روح پر دستک دینے لگتیں۔'' **(روشنی کا تعاقب)**

''ہرنام داس'' تقسیم ہند کے وقت ہونے والے فسادات کے المیہ کو بیان کرتی ہے تاہم اس میں کہانی کار نے اپنے بچپن کی عمر کی سوچ کو جس طرح اظہار کی زبان دی ہے وہ بے حد متاثر کن ہے۔ایسے

ایسے معصومانہ سوال جن کے عقب میں زندگی کی مکاریوں کے کتنے راز چھپے ہوئے ہیں۔

''بس چُپ رہو اور اپنی عمر سے بڑے سوال مت کیا کرو!'' (**ہرنام داس**)

ہرنام داس کے نام کے سحر میں کھوئی معصوم بچی پر جب اپنے والدین کے دکھوں کا راز کھلتا ہے تو تقسیم کے انسانی المیہ کی دوطرفہ المناکی مزید دکھی کرنے لگتی ہے۔

''یہ بات سنتے ہی ہرنام داس کا اداس سا ہیولا دھیرے دھیرے وقت اور تاریخ کے دھندلکوں میں کہیں گم ہوگیا۔'' (**ہرنام داس**)

''سوری'' ویسے تو انگلینڈ میں زندگی گزارنے والوں کی ہلکی پھلکی سی روداد ہے لیکن اس کے پس منظر سے عراق پر امریکی و برطانوی حملہ کا المیہ ابھرتا ہے۔ کہانی کے مرکزی کرداروں سلمان اور سوسن کو اپنا کالج کے زمانے کا جیک یاد آتا ہے۔ بڑی عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کرنے والا جیک فوج میں چلا گیا تھا اور اسے عراق جنگ میں جانا پڑ گیا تھا۔ وہاں سے واپسی کے بعد وہ نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو کر پاگل ہو چکا تھا۔ ایک پرانے دوست کا طویل عرصہ کے بعد سامنے آنا اور وہ بھی دیوانگی کی حالت میں۔ لیکن کہانی کے مرکزی کردار کو احساس ہوتا ہے کہ عراق پر ہونے والے بے جا حملے میں شریک ہو کر جیک کا دیوانہ پن درحقیقت اس کا احساسِ گناہ ہے اور اس احساس کے حوالے سے وہ کہانی کے آخر میں کہتا ہے۔

''میں سوچ رہا تھا کہ کچھ گناہوں کی معافی شاید کبھی بھی نہیں ملتی، چاہے انسان زندگی بھر لفظ ''سوری'' کی تسبیح کرتا رہے۔'' (**سوری**)

''چھنال'' پہلے دیپک کی ماں ساوتری کی زندگی کی اور پھر دیپک اور جیوتی کی زندگی کی ایسی کہانی ہے جس میں گھریلو زندگی اور ہندوستانی دیہاتوں کا پرانا سماج مثالی مشرقی ماحول کی تصویر پیش کر رہا ہے۔

''مکئی کا دانہ'' پاکستانی دیہاتوں کے عمومی ماحول کی ترجمانی کرتا ہے۔ گاؤں کا نمبردار اپنی جاگیر کے زعم میں گاؤں میں محض اس لیے ہسپتال بننے نہیں دیتا کہ گاؤں کے کمی کا بیٹا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ اولادِ نرینہ سے محروم جاگیردار کے ہاں ایک مدت کے بعد بیٹا پیدا ہوتا ہے، لیکن شومئی قسمت بڑی بہن اسے چپ کرانے کی کوشش میں اس کے منہ میں مکئی کا دانہ ڈال دیتی ہے جو بچے کے گلے میں اٹک جاتا ہے۔ گاؤں کے کمپوڈر سے بچہ ٹھیک نہیں ہوتا۔ آخر شہر سے اسی کمی کے بیٹے ڈاکٹر عباس کو بلایا جاتا ہے۔ وہ بچے کو اُلٹا کر کے کمر پر ہاتھ مارتا ہے تو مکئی کا دانہ باہر آجاتا ہے۔ لیکن بچہ تو کبھی کا مر چکا تھا۔ گاؤں کے نمبردار کا وارث دم توڑ چکا تھا اور نمبردار کی رعونت خاک میں مل چکی تھی۔

لُک چھپ جانا

مکئی دادانہ

راجے دی بیٹی

آئی جے.....لُک چھپ جانا.....

کے الفاظ سے شروع ہونے والی کہانی کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے۔

''نمبردار کی بیٹی چندا سر پیٹتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ آج ایک مکئی کے دانے نے راجے کی بیٹی کو لکھ سے لکھ کر دیا تھا۔

ننھا ملک سلطان بوہڑ کی کٹی ہوئی شاخ کی طرح نمبردار کے بازوؤں میں جھول رہا تھا۔

آج نمبردار ملک عزیز کی دسترس میں نہ حیات رہی.....نہ زمانہ رہا.....اور نہ ہی کائنات۔ ایک حقیر سے مکئی کے دانے نے اسے بے نام و نشان کر دیا تھا۔'' (**مکئی کا دانہ**)

''دیوار گریہ'' ایک خوبصورت لڑکی کی دکھ بھری داستان۔ خواتین کے جذبات کی عمومی کہانی۔ تاہم اس میں عمومیت کے باوجود کچھ خاص محسوس ہوتا ہے۔

''میں سوچ رہی تھی کہ ''عورتیں ویسے تو اترن پہننے میں بہت ہتک محسوس کرتی ہیں مگر دوسری عورتوں کے شوہر چرا کر اوڑھتے وقت انہیں کوئی شرم، کوئی ہتک، کوئی بے عزتی محسوس کیوں نہیں ہوتی؟''

جس خوف کی تلوار ہمیشہ سر پر لٹکتی رہتی تھی آخر وہی ہوا۔ بنانے والے نے میرا رنگ روپ سنوارنے میں اتنا وقت صرف کر دیا کہ وہ میری تقدیر لکھنا ہی بھول گیا۔'' (**دیوار گریہ**)

''چیچہ وطنی'' پرانے دیہاتی ماحول کی دلچسپ کہانی ہے۔ بس ایک روداد سی تھی جسے رضیہ اسماعیل کے اندازِ بیان نے انہماک سے پڑھی جانے والی کہانی بنا دیا ہے۔

دو بیویوں کے شوہر محمد خان کی دوسری بیوی بن جانے والی فاطمہ جٹی سے پہلی ملاقات کا منظر دیکھئے۔

''اپنی زمینوں پر یوں ایک اجنبی کو دندناتا ہوئے دیکھ کر فاطو جٹی نے غصے سے دونوں ہاتھ اٹھا کر اُسے رُکنے کا اشارہ کیا۔

گردش ماہ و سال بھی رک گئی..... لمحے سراسیمہ سے ہو گئے۔

کھیتوں میں سرسوں کی مہک نے طوفان اٹھا رکھا تھا۔ ہنستے ہوئے پیلے پیلے پھولوں کی ہنسی وار کر گئی۔

گھڑ سوار نے پوری قوت سے سرپٹ بھاگتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔گھوڑے نے بہت زور سے ہنہنا کر دونوں پاؤں یوں زمین سے اوپر اٹھائے کہ گھڑ سوار گرتے گرتے بچا۔یوں لگتا تھا جیسے اپنے مالک کی یہ بے وقت مداخلت اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

سبکتگین کی طرح رحم کھا کر چوہدری کو بھاگتے ہوئے ہرن کو رہا نہیں کرنا پڑا تھا بلکہ موقعہ پا کر ہرن خود ہی فرار ہو گیا اور چوہدری کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پابند سلاسل کر گیا۔چوہدری اور فاطو جٹی ایک دوسرے کے بالمقابل آ چکے تھے۔فاطو جٹی کی نگاہوں میں چوہدری نے پتہ نہیں کون سے شعلے کی لپک دیکھی کہ سر سے پاؤں تک پگھل گیا۔نہ جانے وہ سمے کا کون سا پل تھا جو چوہدری کو اس سے چرا کر لے گیا۔'' **(چیچہ وطنی)**

''کیہ جاناں میں کون'' بظاہر ایک فرد کے رقص اور قونیہ میں مولانا روم کے پیروکاروں کے مخصوص صوفیانہ رقص کی منظر کشی سے شروع ہونے والی کہانی ہے۔لیکن صوفیانہ رمزوں کے کئی اسرار کی ہلکی ہلکی جھلکیاں دکھلاتی ہوئی یہ کہانی ایک ایسے ادھورے انسان کی المناک کہانی ہے جسے قدرت نے بناتے ہوئے مکمل نہیں کیا، آدھا، ادھورا رہنے دیا۔نہ مرد بنا، نہ عورت۔کہانی صوفیانہ ماحول سے باہر آتی ہے تو ادب کی فضا چھا جاتی ہے۔اس ادھورے انسان کی دلچسپیوں کا سلسلہ رقص، موسیقی، ادب اور فن کے دوسرے سلسلوں سے بھی کسی نہ کسی طور ملتا جاتا ہے۔دراصل یہ خاکہ نما افسانہ ہے جو افتخار نسیم (افتی نسیم) کی زندگی کی کچھ روداد بیان کرتا ہے اور کچھ افسانہ نگار کے احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔افسانہ نگار کو افتی سے گہری ہمدردی ہے، لیکن افتی اپنی اضطراری حرکات سے ہر بار افسانہ نگار کو خود سے متنفر کر دیتا ہے۔اس کے باوجود افسانہ نگار کی ہمدردی اس کے لیے کم نہیں ہوتی۔اس خاکہ نما کہانی کے اختتام کا یہ قدرے طویل اقتباس دیکھیں۔

''میں نے جیسے ہی کتاب بند کی اُس نے ہاتھ آگے بڑھا کر کتاب میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا:"It is for adults only."

پتہ نہیں کب وہ خاموشی سے آ کر میرے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔میں نے اس کے طنز کے اوچھے وار سے لڑکھڑانے کی بجائے سوال کر دیا''اچھا تو تم بالغ ہو؟''

اس نے جواباً طنزیہ لہجے میں ہنستے ہوئے جواب دیا''اس میں کیا شک ہے؟''

''تو دوسروں کی بلوغت کے بارے میں تمہیں کیوں شک ہے؟''میں نے گویا جرح شروع کر دی۔اب کی بار وہ خاموش رہا۔

''ہو سکتا ہے جنہیں تم نابالغ سمجھتے ہو وہ تم سے زیادہ بالغ ہوں اور تمہیں نابالغ سمجھتے ہوں۔''میں نے زہر میں بجھا ہوا تیر پھینکا۔

''میں اور نابالغ؟''اس نے حیرت سے سوال کیا۔

''ہاں تم!''میں نے لفظ تم پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اپنی Sexuality کا اشتہار لگا کر، عورتوں کی طرح سولہ سنگار کر کے ہم جنس پرستوں کے جلسے جلوسوں کو لیڈ کرنا ہی بلوغت کی نشانی ہے؟''اب کی بار حیران ہونے کی باری اس کی تھی کیونکہ وار کافی سخت تھا۔لیکن وہ برافروختہ ہونے کی بجائے خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔جیسے میں نے اس کی توقع کے برخلاف بہت کچھ کہہ دیا ہو۔

اس دن کی ترش گفتگو کے بعد ہمارے درمیان اجنبیت کی اونچی دیوار حائل ہو چکی تھی جو آخری وقت تک قائم رہی۔

اگلے روز کافی مندوبین کی واپسی متوقع تھی۔رات بہت دیر تک جاگتے رہنے کے باعث میں صبح قدرے تاخیر سے اٹھی۔جس وقت میں نیچے کمپاؤنڈ میں آئی تو اس کی گاڑی ایئرپورٹ جانے کے لیے گیٹ سے باہر نکل رہی تھی۔''خدا حافظ کہنے کا موقعہ بھی نہ ملا.....شاید اچھا ہی ہوا.....رات کی گفتگو سے جو بدمزگی پیدا ہوئی تھی اس کے بعد نہ جانے کس طرح سے الوداع کہا جاتا؟''میں نے خود سے کہا۔

اٹلی سے واپسی کے کچھ ہی عرصے بعد خبر ملی کہ وہ ساتویں رنگ کی تلاش میں ہم سب کو چھوڑ کر کہیں بہت دور نکل گیا تھا کبھی نہ واپس آنے کے لیے.....

''بلھا! کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟ کیہ جاناں میں کون؟'' کی سرمدی تکرار ایک بار پھر فضاؤں میں گونج اٹھی تھی۔'' **(کیہ جاناں میں کون)**

''باکا'' غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان گھرانوں کے دو دوستوں کی داستان ہے۔کلکتہ کے ایک خوش حال گھرانے کا نوجوان انڈونیشیا کی آزادی سے پہلے وہاں جاپانی فوج کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔جاپانی فوجی وہاں جاسوسی کے شبہے میں پکڑے گئے قیدیوں کے ساتھ جو سلوک کرتی ہے اس کا حال جان کر رونگھٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔بلکہ بعض واقعات پڑھ کر تو انسان سوچنے لگتا ہے کہ پھر تو امریکہ کے پاس ایٹم بم گرانے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔کلکتہ کے خوش حال گھرانے کا ڈاکٹر یونس جاپانیوں کے مظالم کا شکار ہو کر پاگل ہو جاتا ہے۔اس دوران پاکستان بن جاتا ہے اور ڈاکٹر یونس پاکستان کے کسی پاگل

خانے تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ وہیں اس کے دیرینہ دوست ڈاکٹر نے اسے دیکھا اور پھر علاج کے لیے اپنے گھر پر رکھ لیا۔ کہانی پڑھنے سے پہلے کہانی کا عنوان ''باکا'' پڑھ کر ایسے لگتا ہے جیسے کہانی کے کسی کردار کا نام مبارک ہوگا لیکن آخر میں معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی زبان میں پاگل کو باکا کہتے ہیں۔

''آدھی چادر'' برصغیر کی تقسیم اور قیام پاکستان کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے ایک نوحہ سا لکھا گیا ہے۔ اس میں مشترکہ انسانی قدروں کا ذکر بھی ہے اور شدید سماجی تفاوت کا بیان بھی۔ سماجی سطح پر باہم خیر اور بھلائی کے جذبات رکھنے کے باوجود سماجی تضادات کی کشمکش نے تقسیم کے موقعہ پر خونریزی کے المیہ کو جنم دیا۔ ان ساری یادوں کو کہیں ادب کے حوالے سے، کہیں جذباتی رنگ میں، کہیں مذہبی شان کے ساتھ اور کہیں سادہ سے عام انسان کی طرح بیان کیا گیا ہے۔ تاریخ کے کئی پہلو اس میں نظر انداز بھی ہوئے ہیں تاہم کہانی کی حدود کو ملحوظ رکھتے ہوئے ماضی سے حال تک کو ایک نظر دیکھا گیا ہے اور اچھے مستقبل کی امید بھی کی گئی ہے۔

''قفقس''۔۔۔جیسے ''کیہ جاناں میں کون'' خاکہ نما افسانہ ہے ویسے ہی ''قفقس'' رپورتاژ نما افسانہ ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب کوئی لکھنے والا پختہ کار ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیقات میں مختلف اصناف کی آمیزش ایک خاص فنکارانہ مہارت کے ساتھ آسکتی ہے۔ رضیہ اسماعیل کی بعض تخلیقات میں ایسا دیکھا جاسکتا ہے۔ ''قفقس'' میں پہلے تو انگلینڈ کے بعض ادبی اداروں اور تنظیموں کا بالواسطہ تعارف کرایا جاتا ہے۔ پھر بعض ادبی کرداروں سے ملوایا جاتا ہے۔ مختلف ادبی موضوعات پر بحث کے لیے اچٹتے اشارے دیئے جاتے ہیں۔ پھر ایک ادبی ورکشاپ کا حال سنایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک رپورتاژ کی صورت میں بھی لکھا جاسکتا تھا لیکن رضیہ اسماعیل نے اپنے اندر کے افسانہ نگار سے کام لیتے ہوئے اسے ایک افسانے کا روپ دے دیا ہے۔

ایک پبلک لائبریری کا تعارف کراتے ہوئے رضیہ اسماعیل بتاتی ہیں۔

''برمنگھم میں یورپ کی سب سے بڑی پبلک لائبریری جس کا افتتاح پاکستانی نوبل انعام یافتہ ملالہ یوسف زئی نے کچھ عرصہ پہلے کیا تھا۔ انہوں نے شیکسپیئر میموریل روم میں باقاعدگی سے منعقد ہونے والے ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' (Writers without Borders) کے بارے میں کچھ مواد بھیجا تھا۔'' **(قفقس)**

ادبی گروپ ''رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز'' کا نام بڑا خوشنما ہے۔ لیکن ابھی تک کی عملی سچی بات یہ

ہے کہ تحریریں تو بارڈرز کو کراس کر سکتی ہیں لیکن رائٹرز کو بارڈرز کراس کرنے میں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خصوصاً انڈو پاک کے ادیبوں کو ویزے کی رکاوٹیں، دوسرے ملک میں مشکوک نظروں سے دیکھے جانے کی اذیتیں ایسی ہیں جو بارڈرز کی سخت اہمیت کا احساس بھی دلاتی ہیں اور ادیب کی مجبوری کا بھی۔ صرف انڈو پاک ہی میں نہیں اب تو مغربی دنیا میں آنے والوں کو بھی ویسی ہی مشکوک نگاہوں سے دیکھا جانے لگا ہے۔ اور لگ بھگ ویسے ہی مسائل کا سامنا ہے۔ سو رائٹرز وِدآؤٹ بارڈرز محض کہنے کی بات ہے۔

ادبی ورکشاپ میں گفتگو شروع ہوتی ہے اور ایک ترک رائٹر تک ان الفاظ میں پہنچتی ہے۔

''کیا آپ نے کبھی ادھوری کہانیوں پر غور کیا ہے؟ ادھوری محبتوں کی کہانیاں..... موڑ مڑتی ہوئی کہانیاں..... بین کرتی ہوئی کہانیاں..... روٹھی ہوئی کہانیاں..... ہاری ہوئی کہانیاں..... مگر ہر لمحہ سانس لیتی ہوئی کہانیاں..... کیونکہ کہانی کبھی نہیں مرتی!!!'' اب کی بار ٹرکش رائٹر بول رہا تھا۔'' **(قفقس)**

''قفقس'' میں بنیادی طور پر اس خیال کو پیش کیا گیا ہے کہ جیسے قفقس اپنی آگ میں جل کر راکھ ہوتا ہے اور پھر اسی راکھ سے اس کا نیا جنم ہوتا ہے ویسے ہی جس کہانی کار کی کہانی مکمل نہیں ہوتی وہ پھر اپنی راکھ سے نیا جنم لیتی ہے۔ اور یوں کہانی کہنے کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔ اس حوالے سے رضیہ اسماعیل نے ورکشاپ کے شرکاء کی مختلف آراء دینے کے ساتھ جوگندر پال کے ایک افسانچے کا اقتباس بھی دیا ہے۔

''ذہن کے کسی گوشے سے جوگندر پال کی آواز سنائی دی جو اس خیال کی تائید کر رہی تھی۔'' **(قفقس)**

اس کے بعد رضیہ اسماعیل نے جوگندر پال کے افسانچے کا ادھورا سا اقتباس دیا ہے۔ اگر یہ پورا افسانچہ درج کر دیا جاتا تو ''قفقس'' کا بار بار اپنی راکھ سے جنم لینے کا بھید زیادہ روشن ہو کر سامنے آجاتا۔ یہاں جوگندر پال کا پورا افسانچہ درج کر دیتا ہوں۔

''زندگی تو اٹوٹ ہے، اسے کوئی ایک جنم میں کیسے پورا کرے۔ ہاں، اسی لیے میرا کہنا ہے کہ میں ہی چیخوف ہوں، میں ہی پریم چند، میں ہی منٹو۔۔۔ اور وہ بھی کوئی، جسے ابھی پیدا ہونا ہے۔

ہاں بابو، میں اسی لیے **بار بار** جنم لیتا ہوں کہ اپنا کام پورا کر لوں مگر میرا کام ہر بار ادھورا رہ جاتا ہے۔

نہیں، اچھا ہی ہے کہ ادھورا رہ جاتا ہے، اسی لیے تو زندگی کو زوال نہیں، بابو۔''

مغربی دنیا میں مقیم اردو رائٹرز کے حوالے سے رضیہ اسماعیل نے بڑی سچی اور کھری باتیں کی ہیں۔ایک جھلک یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

''مگر ہم لوگ یہاں کس قدر الگ تھلگ سی زندگی گزارتے ہیں۔کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی جگہ ٹراتے رہتے ہیں۔جب تک ہم مقامی معاشرے میں ربط وضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کریں گے تو Sense of Belonging کبھی بھی پیدا نہیں ہوسکتی اور ہم ناسٹلجیا کا ہی شکار رہیں گے۔'' میں نے بڑے دکھ سے سوچتے ہوئے ساری ڈاک ایک طرف رکھ دی۔

''اسی لیے تو نسلی ہم آہنگی (Racial Harmony) پیدا نہیں ہو رہی اور ہماری نئی نسل انتہا پسندی کی طرف راغب ہو رہی ہے۔''

ذہن کے کسی گوشے نے میری بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''ادب اور ثقافت انسانوں کے درمیان رابطے کا سب سے موثر ذریعہ ہے جس سے انسانی تعصب بہت حد تک دور کیا جا سکتا ہے کیونکہ تعصب کی بنیاد ہی لاعلمی یا کم علمی پر ہوتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں جہالت کہہ سکتے ہیں۔''

ذہن کے اس زبردست تجزیے کو جھٹلانے کی میرے پاس قطعی کوئی گنجائش نہیں تھی۔'' (**تفقس**)

ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے اس مجموعہ کی گیارہ کہانیوں کا یہ مختصر سا تعارف تھا۔ان کہانیوں میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ قاری کو پوری طرح اپنی طرف متوجہ رکھنے میں کامیاب ہیں۔آپ ایک افسانہ پڑھنا شروع کریں تو اسے ختم کیے بغیر کتاب رکھنے کو دل نہیں مانے گا۔ایک اور خوبی یہ ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول اور علاقہ کی بات کر رہی ہوتی ہیں عام طور پر وہیں کا پورا ماحول اور پوری لفظیات کہانی میں سرایت کر جاتی ہے۔ہندوستان کے دیہات کا ماحول ہو یا انگلینڈ کا شہری ماحول، پنجاب کے صوفی شاعر ہوں یا قونیہ کے صوفی رقاص۔پاکستان کا دیہاتی منظر ہو یا امریکہ و جاپان کا کوئی بیان، رضیہ اسماعیل کہانی کے بیانیہ ہی میں نہیں اس ماحول میں بھی پوری طرح ڈوبی دکھائی دیتی ہیں۔کہانی کے زمانے اور ماحول کا پوری طرح کہانی میں سرایت کر جانا رضیہ اسماعیل کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔یہ مہارت طویل ریاضت

کے بغیر نصیب نہیں ہوتی۔

بیشتر کہانیوں میں انسانی المیوں کے مختلف روپ سامنے آتے جاتے چلے جاتے ہیں۔مختلف کرداروں کی انفرادی نوعیت کے زندگی کے گہرے صدمات سے لے کر، تقسیم برصغیر کے وقت ہونے والا قتل و غارت، عراق میں ہونے والی ہولناک جنگ، دوسری جنگ عظیم کے زمانہ کے بعض خوفناک واقعات۔یہ سب المیے جو اِن افسانوں میں بیان کیے گئے ہیں موثر پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔پھر ان سب کے مقابلہ میں انسانی اقدار کو اجاگر کرتے ہوئے صوفیانہ روایات سے عمدہ استفادہ کیا گیا ہے اور اس دھرتی کے انسانوں کے لیے امید کی روشنی دکھائی گئی ہے۔سو براہِ راست کسی نوعیت کی پیغام رسانی نہ کرتے ہوئے بھی رضیہ اسماعیل کے افسانے آج کے گلوبل انسان کے مسائل کو ماضی کے مختلف علاقوں کے مسائل کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔پھر وہ انہیں دیکھتے اور دکھاتے ہوئے ہمیں انسانی مستقبل کے انسان کے لیے پیار اور محبت کی وہ روشنی دکھاتے ہیں جو دنیا کو امن کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر رضیہ اسماعیل کے افسانوں کا مجموعہ ''آدھی چادر'' علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی اور قبولیت حاصل کرے گا اور عوامی سطح پر بھی اسے مقبولیت ملے ہوگی۔انشاءاللہ!

رضیہ اسماعیل کے افسانوں کے مجموعہ ''آدھی چادر'' میں شامل

بشریٰ رحمٰن کی ماہیا نگاری

اردو ادب وصحافت کی دنیا میں بشریٰ رحمٰن ایک ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ادبی دنیا میں انہوں نے فکشن کے ذیل میں ناول، ناولٹ، افسانہ نگاری میں اپنے فن کا کمال دکھایا تو نان فکشن میں سفر نامہ نگاری میں ان کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔صحافت وسیاست کی دنیا میں اپنی نمایاں پہچان بنائی۔کالم نگاری کی تو کالموں کے مجموعے کتابی صورت میں بھی شائع کرائے۔سیاسی وسماجی سطح پر بے شمار تقریبات، کانفرنسوں اور سیمینارز میں شرکت کی۔سیاست کی دنیا میں داخل ہوئیں تو اسمبلیوں تک پہنچیں اور ان ایوانوں میں بھی ان کی آواز گونجنے لگی۔ساری سیاسی وسماجی تقریبات میں انہوں نے جو تقاریر کیں، ان کا ایک بڑا حصہ بھی بعد میں کتابی صورت میں شائع کیا گیا۔یوں انہوں نے جہاں ادب وصحافت کو ایک خاص سطح پر یک جا کر دیا وہیں انہوں نے تحریر وتقریر کو بھی ہم آمیز کر دیا۔بہت کم خوش نصیب ہوتے ہیں جنہیں تحریر وتقریر پر یکساں قدرت حاصل ہوتی ہے۔

نثر میں فکشن اور نان فکشن میں لگا تار لکھنے کے ساتھ نسبتاً کم سہی لیکن بشریٰ رحمٰن نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی۔شاعری میں نظم وغزل کے ساتھ انہوں نے اردو ماہیے بھی کہے۔ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ''صندل میں سانسیں جلتی ہیں'' شائع ہو چکا ہے۔اور اب ان کے ماہیوں کا مجموعہ ''جوگن بن گئیں آنکھیں'' شائع ہونے جا رہا ہے۔

بشریٰ رحمٰن کی ماہیا نگاری میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو لوک روایت کی اوٹ سے مسلسل اپنی جھلک دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ان کے ماہیوں میں حج، عمرہ اور روضۂ رسولؐ کی نسبت سے ارضِ حجاز سے ان کی محبت وعقیدت جھلکتی ہے تو دوسری طرف ارضِ پاک سے ان کی غیر متزلزل وابستگی سامنے آتی ہے۔بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم سے لے کر یہاں کے عوام تک ان کی محبت ان ماہیوں سے چھلکتی جاتی ہے۔سیاست کے خارزار میں آنے کے بعد انہیں جو مثبت ومنفی تجربات ہوئے، ان کا بیان بھی کہیں کہیں جھلک دکھلاتا ہے۔اس نوعیت کے چند ماہیے دیکھیں۔پہلے دینی جذبے۔

ست رنگی زردہ ہے
رب کا جہاں گھر ہے
وہاں کالا پردہ ہے

کیا خوب صدائیں ہیں
مکے میں ہر سو
جنت کی ہوائیں ہیں

دل درد کی دولت ہے
آ کے ذرا دیکھو
یثرب ہے کہ جنت ہے

قائدِ اعظم محمد علی جناح سے لے کر اُن کے بعد کی سیاست اور سیاسی قیادت کے حوالے سے بشریٰ رحمٰن کے یہ ماہیے پاکستانی عوام کی ایک بڑی اکثریت کے دل کی آواز لگتے ہیں۔

دل برِ اعظم ہے
میرا لیڈر تو
بس قائدِ اعظم ہے

لیڈر رہی نصیب نہیں
نعمتیں ساری ہیں
میرا ملک غریب نہیں

یہ کیسی سیاست ہے
سفلہ راج کرے
اور روتی شرافت ہے

اک جوڑا موروں کا
حاکم ہیں جتنے
یہ ٹولہ ہے چوروں کا

کرسی کی کہانی ہے
جیل کے اندر بھی
کیا شام سہانی ہے

یہ ماہیے بشریٰ رحمٰن کی ان موضوعات سے خاص وابستگی کو ظاہر کرتے ہیں۔تاہم بشریٰ رحمٰن کے ماہیوں کا بنیادی اور عمومی موضوع وہی ہے جو ماہیے کا بھی عمومی موضوع ہے یعنی محبت۔

محبت کا مضمون کہیں مشاہدہ کی سطح پر اور کہیں تجربہ کی سطح پر بشریٰ رحمٰن کی ماہیا نگاری میں بے حد نمایاں ہے۔انسانی زندگی میں محبت کے تجربات میں جو نشیب و فراز آتے ہیں۔ہجر، وصال، دھوکہ، فریب، دلداری، وفاداری، بے وفائی، ظالم سماج، معاشرتی حیثیت میں تفریق، سماجی قدروں اور محبت کی خواہشات کے درمیان پائی جانے والی کشمکش، غرض محبت سے جڑے ہوئے ایسے کتنے ہی معاملات بشریٰ رحمٰن کی ماہیا نگاری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ان ماہیوں میں تجرباتی سطح پر اتنی لچک سے ہلکا پھلکا فائدہ اٹھایا گیا ہے جتنی پنجابی ماہیے کی زبان میں لچک ملتی ہے۔تاہم بشریٰ رحمٰن نے اردو کے مزاج کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔محبت کے موضوع سے متعلق بشریٰ رحمٰن کے چند ماہیے یہاں پیش ہیں۔پہلے محبت کی وہ کیفیات جو اول اول مسحور کرتی رہتی ہیں۔

اتنی ہی کہانی ہے
بہتے پانی پر
لہراتی جوانی ہے

پھولوں کا سرہانہ ہے
تھوڑا ادھر دیکھو
اک سپنا سجانا ہے

پگھڑ میرا گُٹ ماہیا
مجھ کو پتنگ بنا
میری چاہت لُٹ ماہیا

محبت کی اسی کیفیت سے گزرتے ہوئے کہیں گلوں، شکووں کا دور آنے لگتا ہے۔تاہم اس میں بھی محبت کی اہمیت قائم رہتی ہے۔ایسے چند ماہیے دیکھیں۔

ہم بندے سادے ہیں
صاف بتا دونا
اب جو بھی ارادے ہیں

کوئی سا گر بہتا ہے
میری آنکھوں میں
اک رت جگا رہتا ہے

پیروں میں پائل ہے
دل نہ دُکھا ماہیا
دل پہلے ہی گھائل ہے

کھڑکی میں چندا ہے
عشق نہیں آساں
یہ روح کا پھندہ ہے

کوئی بولے یاناں بولے
ہم نے نبھائی ہے
تیرے بھید نہیں کھولے

گلوں،شکووں کے ساتھ جب زندگی کے حقائق اور محبت کے معاملات میں الجھاؤ زیادہ واضح ہونے لگتے ہیں تو جیسے عشق ومحبت فلسفیانہ رنگ میں ڈھلنے لگتے ہیں۔

بچے کا بستہ ہے
عشق کی راہوں کا
تاریک سا رستہ ہے

انگور کا دانہ ہے
ہنسنا بھی تو یہاں
رونے کا بہانہ ہے

تم کیسی پہیلی ہو
زندگی! بتلاؤ
دشمن ہو؟ سہیلی ہو؟

دُنیا کو بتانا ہے
پیار، محبت تو
جینے کا بہانہ ہے

سونے کا ہے دروازہ
حسن کے چہرے پر
ہے عشق بھرا غازہ

دریا ہے گلابوں کا
جیون کیا ماہیا

قصہ ہے سرابوں کا

یہ موضوعاتی نشان دہی محض میری اپنی تفہیم ہے،اس کی مزید پرتیں ہوسکتی ہیں جنہیں دوسرے قارئین شاید مجھ سے زیادہ بہتر سمجھ سکیں۔بشریٰ رحمٰن کے ماہیوں میں گھریلو رشتے مائیکے سے لے کر اولاد تک،اور بھائیوں سے لے کر سسرال تک محیط ہیں۔ان ماہیوں میں ان کے مشاہدات و تجربات صاف دکھائی دیتے ہیں۔اسی طرح عام زندگی کے مسائل اور دکھ سکھ بھی کسی نہ کسی رنگ میں بشریٰ رحمٰن کے ماہیوں میں اپنی جھلک دکھلاتے ہیں۔حالیہ چند برسوں میں الیکٹرونک میڈیا کا ٹی وی چینلز سے کمپیوٹر تک اور سمارٹ فون سے سوشل میڈیا تک پھیلاؤ جس طرح حیرت انگیز بلکہ زلزلہ انگیز تبدیلیاں لے کر آیا ہے اور ان تبدیلیوں کا سلسلہ کہیں رُکتا دکھائی نہیں دے رہا۔بشریٰ رحمٰن اس سارے منظر کو حیرت کے ساتھ دیکھ رہی ہیں،اس سے حسبِ توفیق استفادہ بھی کر رہی ہیں اور اسے سمجھنے کی کوشش بھی کر رہی ہیں۔اسی دوران کہیں ان کے دل سے بے ساختہ یہ آواز آتی ہے جو ہم جیسے بہت سارے پُرانے ہوتے ہوئے لوگوں کے دل کی آواز لگنے لگتی ہے۔

مجھے بیر نہیں کوئی
نئے زمانے کا
سر پیر نہیں کوئی

بشریٰ رحمٰن کے ماہیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوئی ہے۔ان کی ماہیا نگاری شروع سے ہی اردو ماہیا کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرتی آ رہی ہے۔اب یہ ماہیوں کا مجموعہ ''جوگن بن گئیں آنکھیں'' شائع ہونے جا رہا ہے تو اس کا مجموعی تاثر زیادہ بہتر طور پر اردو ماہیے کے فروغ اور اس کی تقویت کا موجب بنے گا۔مجھے امید ہے کہ بشریٰ رحمٰن کی دوسری مختلف النوع تخلیقات اور تصنیفات کی طرح ان کے ماہیوں کا یہ مجموعہ بھی اردو دنیا میں قبولیت اور مقبولیت حاصل کرے گا۔انشاءاللہ۔

بشریٰ رحمٰن کے ماہیوں کے مجموعہ ''جوگن بن گئیں آنکھیں'' کے لیے لکھا گیا۔

استعارہ مِری ذات کا

فرحت نواز کو شعروادب کی دنیا میں پھر سے متحرک کرنے کے لیے میں نے جب اپنا مضمون ''فرحت نواز کی نظمیں'' لکھا تھا تب ایسا کرنا میری صدق دلانہ کاوش تو ضرور تھی لیکن مجھے خود اندازہ نہ تھا کہ اس کے نتیجہ میں فرحت نواز اتنے مختصر سے عرصہ میں اپنا شعری مجموعہ شائع کر لیں گی۔سو اب جو یہ مجموعہ شائع ہو رہا ہے تو مجھے اس کی اشاعت کی خبر سے دلی خوشی ہو رہی ہے۔

لگ بھگ ربع صدی کے عرصہ پر محیط فرحت نواز کی شاعری میں محبت کی مختلف النوع کیفیات کو عمومی طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔اِدھر ہمارے بعض دانشوروں نے شاعری میں محبت کے موضوع کو بہت کمتر درجہ کی چیز قرار دے رکھا ہے۔محبت کا موضوع اتنا ہی پرانا ہے جتنا پرانا آدم وحوا کا قصہ،اور اتنا ہی نیا ہے جتنا ہم سب کی زندگیوں میں چاہنے اور چاہے جانے کا جذبہ موجود ہے۔فرحت نواز کی محبت کی شاعری ان کے ذاتی تجربوں کی زائیدہ ہے،اس وجہ سے یہ روایتی محبت کی شاعری نہیں رہتی۔اس میں ایک اور یجنل سی خوشبو موجود ہے۔تاہم محبت سے ہٹ کر بھی ان کی شاعری میں موضوعاتی تنوع ملتا ہے۔ماں، باپ، شوہر، بچے، بھائی، بہن،ان کی شاعری میں اپنے اپنے حقیقی روپ میں دکھائی دیتے ہیں۔ویمن ڈے پر لکھی گئی ان کی دو نظمیں اور امن کی فاختہ کے نام تین نثری نظمیں عالمی حوالے سے ان موضوعات کو نبھا رہی ہیں۔وطنِ عزیز میں دہشت گردی کی شدید لہر کو فرحت نواز نے گہرے دکھ کے ساتھ اپنا موضوع بنایا ہے۔جبکہ معاشرے میں کسی اختیار اور طاقت کے بَل پر فرعونیت کا مظاہرہ کرنے والی قوتوں کو بھی فرحت نواز نے مختلف انداز سے اپنا موضوع بنایا ہے۔اتنے موضوعاتی تنوع کے باوجود ان کی شاعری میں محبت کا موضوع سب پر فوقیت رکھتا ہے۔کیونکہ وہ قومی اور عالمی دونوں سطح پر انسانی معاشرے میں امن اور محبت کے فروغ کی متمنی ہیں۔

عام طور پر جب کسی شاعر یا ادیب کا کوئی تخلیقی مجموعہ شائع ہوتا ہے تو اس کے معاً بعد

اس کے ہاں ایک ٹھہراؤ یا عارضی خاموشی آجاتی ہے۔جیسے تخلیق کار کچھ ستا رہا ہے، کچھ دیر کے لیے دَم لے رہا ہے۔تاہم فرحت نواز کے ہاں مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ **استعارہ مری ذات کا** کی اشاعت کے معاً بعد ان کے شعری اظہار میں ایک دَم پھوٹ بہنے والے چشمے جیسی کیفیت نمایاں ہوگی۔اسی مجموعہ میں شامل ان کی نئی شاعری سے اندازہ کر رہا ہوں کہ ان کے تخلیقی اظہار میں مزید بہاؤ آئے گا۔ان کی تازہ نظموں،غزلوں میں بیس سال کے سکوت کا ٹوٹنا جلترنگ کی جھنکار اور چہکار جیسا لگ رہا ہے۔اور ان میں مجھے فرحت نواز کے اگلے شعری مجموعے کی شاعری کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

کتاب میں شامل تاثرات

فرحت نواز کی حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ شاعری

لگ بھگ بیس سال کے بعد فرحت نواز کی ادبی دنیا میں واپسی ہوئی ہے تو ان کی اچھی پذیرائی ہوئی ہے۔ عکاس کے شمارہ نمبر ۲۲ میں اس پذیرائی کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اس دوران ایبٹ آباد سے نازیہ خلیل عباسی نے اصرار کیا ہے کہ فرحت نواز کی شاعری کے ان پہلوؤں کا بھی ذکر کیا جائے جن پر ابھی بات نہیں کی گئی۔

بے شک فرحت کی نظموں اور غزلوں پر کافی بات ہو رہی ہے لیکن ان کی حمد و نعت اور دعائیہ شاعری پر زیادہ بات نہیں ہوئی۔ نازیہ خلیل عباسی کے شدید اصرار کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں فرحت نواز کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری سے بات شروع کرتا ہوں۔

فرحت نواز نے اپنے شعری مجموعہ ''استعارہ مری ذات کا'' کے شروع میں ''میرے پیارے خدا'' کے عنوان کے ساتھ ایک حمدیہ نظم پیش کی ہے۔ یہ آزاد نظم کے انداز میں لکھی گئی ہے۔ حمدِ باری تعالیٰ کے روایتی انداز سے مختلف انداز اور احساس کے ساتھ لکھی گئی اس نظم کا یہ حصہ ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا کر دیتا ہے۔

''میرا نامۂ اعمال
روشن نہیں ہے ذرا
میں نے نیکی نہیں کوئی کی
میری نیت میں اخلاص آیا نہیں
ایک سجدہ بھی ایسا ادا نہ ہوا
جس میں میری طلب
صرف تو ہی رہا

تو رگِ جاں سے بے شک ہے نزدیک تر
مجھ کو اتنی مسافت بھی مشکل لگی''

رگِ جاں سے نزدیک رہنے والے کو یہ کہنا کہ مجھے اتنی مسافت بھی مشکل (لمبی) لگ رہی ہے، دراصل بندگی میں احساسِ ندامت کا سچا اظہار ہے۔ اپنی ضرورتوں کے لیے دعائیں مانگنا تو ہر انسان کی عادت ہے۔ بقول حفیظ جالندھری ؎

جب کوئی تازہ مصیبت ٹوٹتی ہے اے حفیظؔ!
ایک عادت ہے خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

لیکن فرحت نواز کے ہاں بوقتِ ضرورت خدا کو یاد کرنے کے باوجود اس امر کا شدید احساس پایا جاتا ہے کہ کبھی خدا کو صرف اسی کے لیے بھی یاد کیا جانا چاہئے۔ جب سجدے کا مقصد صرف اسی کی طلب رہی ہو۔

فرحت نواز کے مجموعہ کی دوسری نظم ''دعائیہ'' کے عنوان سے ہے۔

کاش میں تیری عبادت
روز و شب کرتی رہوں

ان سطروں کے ساتھ شروع ہونے والی یہ چھوٹی سی نظم، ان سطروں پر اختتام پذیر ہوتی ہے۔

میرا دنیاوی خداؤں کے لیے نہ سر جھکے
کاش اتنی تو میرے ایمان میں حدت رہے!

یہ معاشرتی سطح کی حق گوئی کی بات ہو سکتی ہے اور سیاسی رنگ میں بھی اس حق گوئی کو دیکھا جا سکتا ہے۔ فرحت نواز کے یہ ماہیے بھی حمد کے ذیل میں آتے ہیں۔

دل دنیا کا لوبھی ہے
بخش دے تو مولا
میری غلطی جو بھی ہے

رکھ تو ہی بھرم مولا!
اپنے گناہ گنوں
یا تیرے کرم مولا!

تُو قدرت والا ہے

میری خطاؤں پر

کیا پردہ ڈالا ہے

فرحت نے چار نعتیں کہی ہیں۔ان میں سے تین نعتیں آزاد نظم کی صورت میں نعتیہ۔۱،نعتیہ۔۲،اور نعتیہ۔۳ ہیں۔چوتھی نعت پابند نظم کی صورت میں ہے۔اس کا پہلا شعر دعا کے رنگ میں حمد کا شعر کہلا سکتا ہے۔

الٰہی دے مجھے توفیق شانِ مصطفیٰؐ لکھوں

قلم زم زم سے دھولوں پھر محمدؐ مجتبیٰ لکھوں

اسی نعت میں یہ شعر آتا ہے۔

مِری اوقات کیا،ان سے محبت کا کروں دعویٰ

ہے رب ان کا محبّ،ان کو حبیبِ کبریا لکھوں

اس شعر کا خیال اسے حمد اور نعت کے درمیان کی سرحد پر لا کھڑا کرتا ہے۔یہ بڑا نازک مقام ہوتا ہے۔معمولی سی لغزش بے ادبی بلکہ شرک تک لے جا سکتی ہے۔لیکن فرحت نواز نے ایسی صورت حال کو پورے ادب اور آداب کے ساتھ دیکھا ہے اور پھر اسے اتنے ہی ادب کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔

نعتیہ کے عنوان سے ان کی تین نظمیں خیال انگیزی کے حوالے سے روایتی نعت کی بجائے ان کی بہت ہی ذاتی کیفیتوں کو بیان کرتی ہیں۔''نعتیہ۔۲'' دیکھیں اور فرحت نواز کی ان ذاتی کیفیات کا اندازہ کریں۔

بتاؤ کوئی ایک ایسا محبّ

جو یہ کہہ دے کہ تم سب

محبت کرو میرے محبوب سے

اور انعام میں

سب کو جنت بھی دے!

یہ فرحت نواز نے بڑے سادہ الفاظ میں اور بڑی ہی سادگی کے ساتھ بڑی گہری بات کہہ دی ہے۔

فرحت نواز کے ماہیوں میں حمد و نعت کی سرحد پر اظہار کا مضمون زیادہ نمایاں ہے۔روئے سخن کبھی ایک طرف جاتا دکھائی دیتا ہے تو کبھی دوسری طرف اور کبھی دونوں طرف۔چند ماہیے دیکھیں اور ان ملی جلی

کیفیات کا اندازہ کریں۔

دَم میرا گُھٹ جائے

روضہؐ دیکھے بِنا

دنیا نہ چُھٹ جائے

روضۂ رسولؐ دیکھنے کی خواہش ہے،اس لیے نعتیہ بات ہے لیکن خدا سے دعا ہے کہ روضہ کی زیارت نصیب کر دے۔

دل کو کچھ ہوتا ہے

حال سنا کر جب

حاجی کوئی روتا ہے

حج کے ارکان میں خدا اور رسولؐ دونوں کا ذکر رہتا ہے۔

محشر میں کھڑے ہوں گے

پَیر گناہوں کی

دلدل میں گڑے ہوں گے

روزِ محشر میں حاضری تو بارگاہِ خداوندی میں ہو گی لیکن شفاعت کے لیے ساقیٔ کوثرؐ کی طرف بھی دیکھ رہے ہوں گے۔

جی بھر کے رونا ہے

دل کی سیاہی کو

''زم زم'' سے دھونا ہے

یہاں خدا اور رسولؐ دونوں سے ان کے مقامات کے حساب سے التجائیہ کیفیت ہے۔لیکن ایک ہی بیان میں دونوں کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔حمد اور نعت کی سرحد دراصل اس مقام کا ادراک بھی ہے ،جہاں رسولؐ کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ کہلاتا ہے،جہاں رسولؐ کے آگے آگے بے ادبی کے ساتھ چلنا اللہ کے آگے آگے چلنا قرار پاتا ہے۔فرحت جہاں جہاں ایسے مقامات سے گزری ہیں کامیاب گزر گئی ہیں۔

حمد و نعت کے یہ مضامین براہِ راست حمدیہ و نعتیہ کلام سے ہیں۔ان کے علاوہ اپنی بعض نظموں میں بھی فرحت نے ایسے مضامین کو بیان کیا ہے۔اس کی ایک عمدہ مثال ان کی نظم ''دعا'' ہے۔بظاہر یہ ماں

کی محبت میں کہی گئی نظم ہے لیکن اس کا دعائیہ پہلو اسے بارگاہِ الٰہی میں لا کھڑا کرتا ہے۔

سوہنے ربا!
میری ماں کو اتنا عرصہ زندہ رکھنا
میں اس کو اتنا خوش کر دوں
جس سے میرا رجنت میں جانا
غیر یقینی نہ رہ جائے
مجھے یقیں ہے
جنت کی نہروں میں ہر دَم بہنے والا دودھ
یقیناً ماں کے دودھ ایسا ہی ہوگا!

اسی طرح فرحت نواز کی ایک اور نظم ہے ''بن باس میں ایک دعا''۔ بظاہر یہ نظم ہندوستانی روایت کے مطابق سیتا اور رام چندر جی کے کرداروں کی یاد دلاتی ہے لیکن نظم کے آخری حصہ میں دعائیہ انداز اس نظم کو بھی فرحت نواز کی شاعری کے دعائیہ حصہ میں لے آتا ہے۔

اور خدا سے ایک دعا ہے
میرے بن باسی کو اتنی دیر نہ ہو کہ
جسم کے اندر خواہش کا لوبان سلگ کر بجھ جائے
اور پیاس چمک کر مٹ جائے
میرے مالک!
میرے بن باسی کو اتنی دیر نہ ہو کہ دنیا مجھ کو
پھر دوبارہ شک سے دیکھے، پھر ویسا بہتان لگے!

فرحت نواز کی حمدیہ، نعتیہ اور دعائیہ شاعری بہت مختصر سی ہے لیکن مقدار میں کم ہونے کے باوجود یہ شاعری ان کے جذبات اور احساسات کا سچا اظہار ہے۔ ہر چند پہلے میرا اس موضوع پر کچھ لکھنے کی طرف دھیان نہیں گیا لیکن یہ مضمون لکھا گیا ہے تو اچھا لگ رہا ہے۔

---

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=1700

نذیر ناجی صاحب کا خاص کالم

نذیر ناجی صاحب نے ایک ہی موضوع پر لکھے گئے اپنے ایک ہی کالم کی تین اقساط میں روایتی کالم نگاری سے ہٹ کر علمی مکالمہ کی راہ نکالی تھی۔ انہیں پڑھنے کے بعد میں نے ان کی خدمت میں یہ خط نما ردِعمل بھیجا تھا۔ قارئین کرام نذیر ناجی صاحب کے زیرِ گفتگو کالم کی تین اقساط ان تین لنکس پر مطالعہ کر سکتے ہیں۔

http://dunya.com.pk/index.php/author/nazeer-naji
/2015-10-04/12839/44324739#.Vhyw6ytsF1g

---

http://dunya.com.pk/index.php/author/nazeer-naji
/2015-10-06/12860/56319882#.VhyxkitsF1g

---

http://dunya.com.pk/index.php/author/nazeer-naji
/2015-10-07/12872/58120410#.VhyxtCtsF1g

یہ کسی بحث یا مناظرہ کا مقام نہیں ہے، صرف اپنے اپنے طور پر مزید غور و فکر کر کے سنجیدہ علمی مکالمہ کی گنجائش پیدا کرنا مقصود ہے۔ **(ح۔ق)**

محترمی ایڈیٹر صاحب روزنامہ دنیا لاہور

سلام مسنون

''نظریہ اور جغرافیہ دونوں کو خدا حافظ'' کے زیرِ عنوان نذیر ناجی صاحب کے تین کالم (مطبوعہ روزنامہ دنیا 4,6,7 اکتوبر 2015) مسرت آمیز حیرت کے ساتھ پڑھے۔ صحافت کے خارزار میں کھو جانے والا تخلیق کار اپنے سارے فکری سرمایہ کی خوشبو کے ساتھ ان کالموں میں دکھائی دے رہا ہے۔ ان کالموں میں نذیر ناجی صاحب کی زندگی بھر کی سوچ اور زندگی بھر کا مطالعہ جیسے ہم آمیز ہو گیا ہے۔ سائنس، فلسفہ (یہ

بھی سائنس ہی کی ذیلی شاخ ہے)، میٹافزکس کے امتزاج نے بعض فکری گرہیں کھولی ہیں تو مزید غور وفکر کے لیے بعض اچٹتے اشارے بھی دے دیئے ہیں۔انہوں نے اس سارے فکری تناظر میں تخلیقی عمل کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے۔یوں ان کے ہاں ادب، سائنس اور الٰہیات کا ایک دلچسپ امتزاج دیکھنے کو ملا ہے۔لیکن چونکہ بنیادی طور پر وہ اپنی صحافیانہ ذمہ داری نبھا رہے تھے اس لیے سارے غور وفکر کا رُخ سیاسی وسماجی سطح پر آج کے انسانی مسائل کی طرف موڑ دیا۔یہ بھی کارِ خیر ہی ہے اور مختلف علوم کے امتزاج کی برکت بھی کہ ان کے ذریعے آج کے عالمی سیاسی ومعاشرتی مسائل کے حل ڈھونڈنے کی کاوش کی گئی ہے۔ایسی باتوں پر مقامی یا عالمی مقتدر قوتیں اپنا دماغ نہیں کھپاتیں، وہ اپنی طاقت کے نشہ میں مست ہوتی ہیں۔تاہم معاشرے میں کسی نہ کسی سطح پر مزید غور وفکر کی تحریک ضرور ملتی ہے۔

مجھے ان تین کالموں کے مطالعہ کے دوران کئی مقامات پر کہیں ہلکے سے اختلاف کی گنجائش محسوس ہوئی تو کہیں اسی منظر کا دوسرا رُخ دیکھنے (سوچنے) کا موقعہ ملا۔تاہم یہ اختلافی پہلو بھی نذیر ناجی صاحب کی سوچ ہی کی توسیع ہیں۔مولانا رومی کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ ''عشق عقل ہی کی اعلیٰ، برتر اور ترقی یافتہ صورت ہے۔'' نذیر ناجی صاحب نے مختلف مفکرین کی آراء سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے عقل استدلالی، عقل وجدانی اور عقل خالص کی جو درجہ بندی پیش کی ہے وہ قابلِ فہم ہے۔اس سب کو اگر دماغ کی ہئیت اور کارکردگی سے منسلک کر دیا جائے تو ان باتوں کا سائنس سے تعلق واضح ہو جائے گا۔انسانی دماغ کا اسی، نوے فیصد حصہ جو بظاہر خاموش پڑا ہوا ہے شاید وہی عقل وجدانی اور عقل خالص کا مرکزی دفتر ہو اور انسانی (روح کی) عقل کو روحِ اعظم کی عقلِ عظیم سے جوڑتا ہو۔

نذیر ناجی صاحب نے روح اور مادے کی دوئی کو رد کیا ہے۔یہ بڑی زبردست بات ہے۔روح مادے کے اندر موجود ہوتی ہے اور مادے کی پرتیں اتارنے لگیں تو ایٹم کے پارٹیکلز کے ابھی تک کے دریافت شدہ آخری سرے تک پہنچتے پہنچتے ہی ''عدم'' دریافت ہونے لگتا ہے۔ناجی صاحب نے اسے روح کہا ہے، وہ بھی تفہیم کے لیے ایک حد تک ٹھیک ہے۔مولانا رومی نے ارتقائے حیات کے جو چار مدارج بیان فرمائے ہیں (جماداتی، نباتاتی، حیوانی اور انسانی)، علامہ اقبال نے بھی انہیں اسی طرح خودی کی تعمیر میں شامل کر لیا۔انہیں علامتی پیرائے میں تو لیا جا سکتا ہے لیکن کرۂ ارض پر حیات کے ارتقاء کے حوالے سے اسے تسلسل کے طور پر لینا شاید ممکن نہیں رہا۔ہاں داخلی تعمیر کے سلسلہ میں ان مدارج کو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن غور کیا جائے تو داخلی سطح پر یہ چار نہیں بلکہ تین مدارج بنتے ہیں۔نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ

اور نفسِ مطمئنہ۔قرآن شریف میں ان تین کیفیات کا ذکر موجود ہے۔بلکہ مجھے تو پہلے پارہ کے آغاز میں حروف مقطعات الم میں بھی ان تینوں نفسی کیفیات ہی کا سرا ملتا دکھائی دیتا ہے۔

نذیر ناجی صاحب نے نور اور نار کا ذکر کیا ہے۔میں ایک عرصہ سے نور اور نار کے فرق کو سمجھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہوں۔ایک دوست نے بتایا کہ نار جلا دیتی ہے جبکہ نور میں سے تپش منہا ہو جاتی ہے۔میں نے عرض کیا کہ جس نور کی ہلکی سی تجلی نے کوہ طور کو جلا کر راکھ کر دیا، اس میں سے تپش کیسے منہا ہو گئی؟ وہ دوست مسکرا کر رہ گئے۔ابھی تک یہی گمان کر پایا ہوں کہ جیسے بجلی سے ہیٹر بھی چلتے ہیں اور فرج اور فریزر بھی، اسی طرح نور اپنے اندر ہر تخلیقی قوت لیے ہوئے ہے۔

نذیر ناجی صاحب کے کالم میں حضرت ابن العربی کے ہاں فصوص الحکم میں اللہ تعالیٰ کی تجسیم میں مونث جہت کا ذکر پڑھ کر مجھے ہندوؤں کے بھگوت پران یاد آ گئے۔اپنی یادوں کے ایک باب میں ان کا ذکر کر چکا ہوں سو وہیں سے اقتباس یہاں درج کر دیتا ہوں۔مونث جہت کے حوالے سے یہ روداد اپنی جگہ غور طلب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

''ہستیٔ باری تعالیٰ جو اس کائنات کی حقیقتِ عظمیٰ بھی ہے اور روحِ اعظم بھی، اصلاً ہم اس عظیم ترین ہستی کو بھی اپنے معاشرتی رویوں کے حوالے سے دیکھتے یا سمجھتے ہیں۔جبکہ وہ ہمارے سارے تصورات اور قیاسات سے بالا ہے۔چونکہ ہمارا معاشرہ مردانہ بالادستی کا معاشرہ ہے اسی لیے خدا کے بارے میں بھی عام طور پر مذکر کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔ہمارے برعکس قدیم ہندوستان کے مادری نظام کے اثرات کے نتیجہ میں ہندوؤں میں دیوتاؤں کے ساتھ دیویوں کا تصور بھی موجود رہا ہے۔شری دیوی، بھگوت پُران میں خالقِ کائنات عورت کے روپ میں ہے۔اس عقیدہ کے مطابق خالقِ کائنات شری دیوی اپنی تنہائی اور شدتِ جذبات سے مضطرب ہوئی تو اس نے اپنی ہتھیلیوں کو رگڑا۔اس کے نتیجہ میں ہاتھوں پر آبلے پڑ گئے، جو پھوٹ بہے تو پانی کا ایک سیلاب آ گیا۔اس پانی سے برہما کی پیدائش ہوئی۔شری دیوی نے برہما سے جنسی ملن کی خواہش کا اظہار کیا مگر برہما نے اسے اپنی پیدا کرنے والی کہہ کر اس عمل سے انکار کر دیا۔تب شری دیوی نے برہما کو فنا کر دیا۔ان کے بعد وشنو کو پیدا کیا گیا اور ان سے بھی وہی خواہش دہرائی گئی، وشنو نے بھی برہما کی طرح انکار کیا اور ان کو بھی برہما جیسے انجام سے دوچار ہونا پڑا۔وشنو کے بعد شنکر کا جنم ہوا۔شنکر اِن معاملات میں کافی معاملہ فہم نکلے۔انہوں نے دو شرطوں کے ساتھ شری دیوی کی بات ماننے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ایک شرط یہ کہ برہما اور وشنو کو دوبارہ پیدا کریں اور ان

کے لیے دو دیویاں بھی پیدا کی جائیں۔ دوسری شرط یہ کہ شری دیوی خود دوسرا روپ اختیار کریں کیونکہ اس روپ میں بہر حال وہ ماں کا مرتبہ رکھتی ہیں۔ چنانچہ شری دیوی نے برہما اور وشنو کو ان کے جوڑوں کے ساتھ دوبارہ خلق کیا اور خود بھی پاروتی کا دوسرا روپ اختیار کیا۔ شنکر اور پاروتی کی داستان ہندوؤں کے عقائد میں آج بھی کئی جہات سے اہمیت کی حامل ہے۔ ہمارے پدری بالا دستی والے معاشروں میں خدا مردانہ صفات کا حامل دکھائی دیتا ہے تو مادری نظام کے قدیم ہندوستان میں خدا کے عورت جیسے روپ کی بات دلچسپ ہونے کے ساتھ اپنے ثقافتی پس منظر میں قابلِ فہم بھی لگتی ہے۔ باقی خالقِ حقیقی تو ہمارے ہر مردانہ وزنانہ تصور سے کہیں بلند و بالا ہے۔ یہاں تک کہ صفات بھی اس کو سمجھنے اور اس تک رسائی کا ایک وسیلہ تو ہیں لیکن اس عظیم تر حقیقت کے سامنے صفات بھی بہت نیچے رہ جاتی ہیں۔ صفات کا معاملہ یوں ہے کہ ذاتِ احد ہونے کے باوجود ہم صفات کے وسیلے سے اسے مخاطب کرتے ہیں۔ مثلاً: ''اے میرے رحیم خدا! مجھ پر رحم فرما'' کہیں گے۔ رحیم خدا کی بجائے قہار خدا کہہ کر رحم نہیں مانگیں گے۔ اسی طرح رزق مانگتے وقت رزاق خدا کہیں گے، جبار خدا نہیں کہیں گے۔ علیٰ ھذا القیاس۔ اب میرے سوچنے کا معاملہ یوں ہو جاتا ہے کہ بُت سامنے رکھا ہو یا ذہن میں بنایا ہوا ہو، اسے بُت ہی کہیں گے۔ کہیں صفاتِ باری تعالیٰ کے معاملہ میں ہم بھی ذہن میں چھپائی ہوئی بت پرستی کا ارتکاب تو نہیں کر رہے؟

اگرچہ بُت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا الٰہ الا اللہ ''

(''کھٹی میٹھی یادیں''۔ باب ''زندگی در زندگی'')

نذیر ناجی صاحب نے تجسیم الٰہی کی نفی کی ہے لیکن اس کے لیے ''شخصیت'' کا لفظ قبول کیا ہے۔ شخصیت میں پھر صرف اللہ کا نام ہی نہیں دوسرے صفاتی نام بھی آتے جائیں گے۔ اور اسی گفتگو کے پس منظر میں جب نذیر ناجی صاحب نے لکھا: ''کائناتوں کی تخلیق سے پہلے خلا کو وجود میں لایا گیا ہوگا'' تو میرا ذہن کسی اور طرف نکل گیا۔ یہاں بھی اپنی ذہنی کشمکش کو اپنی یادوں کے ایک باب سے ہی نقل کر دیتا ہوں۔

'' یہاں مجھے پاکستان سے سائنس کے ایک استاد ایم سلیم کی یاد آ گئی۔ پندرہ سولہ سال قبل ان کی ایک چھوٹی سی کتاب پڑھی تھی۔ ''پُر اسرار کائنات کا معمہ''۔ اس میں کاسمالوجیکل حوالے سے بڑی زبردست معلومات درج کی گئی تھی۔ لیکن میرے مطلب کا سب سے اہم حصہ وہ تھا جس میں خلا کی بعض صفات اور خدا کی صفات کا ذکر کیا گیا تھا۔ میں نے خدا کو سمجھنے میں اس موازنہ سے زبردست استفادہ کیا۔ پہلی سطح پر

یہ موازنہ خدا کے بارے میں ہمارے معین تصورات پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ لیکن میں نے (لا الٰہ ۔۔) نفی کے اس مرحلہ سے گزر کر خدا کے بارے میں ایک برتر تصور (لا الہ الا اللہ) تک رسائی حاصل کی۔ نفی کا مرحلہ بجائے خود ایک دلچسپ سفر تھا۔ خدا کی جتنی صفات ہیں انہیں ہم دو بڑے خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک خانے میں وہ صفات آتی ہیں جو انسان میں چھوٹی سطح پر پائی جاتی ہیں اور خدا میں بہت بڑی سطح پر ان صفات کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ جیسے ربوبیت، رحیمیت، رحمانیت، قہاریت، جباریت وغیرہا۔ ان صفات کے علاوہ ایسی جتنی بھی صفات ہیں جو انسان میں تو نہیں پائی جاتیں لیکن وہ ساری صفات خدا کے ساتھ خلا میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایم سلیم نے مجھے ان صفات کا موازنہ کر کے ایک نئے فکری جہان کی سیر کرا دی تھی۔ چند مثالیں یہاں بھی درج کر دیتا ہوں۔

۱۔ خدا سب سے بڑا ہے۔ اس کی بڑائی کی کوئی حد نہیں ہے۔ خلا بھی ساری کائنات سے بڑا ہے۔ جہاں تک مادی کائنات ہے، خلا موجود ہے اور اس سے سوا بھی خلا ہی خلا ہے۔

۲۔ خدا واحد ہے۔ خلا بھی پوری کائنات میں ایک ہی ہے۔

۳۔ خدا کسی سے پیدا نہیں ہوا۔ خلا بھی کسی سے پیدا نہیں ہوا۔

۴۔ خدا بے نیاز ہے۔ اور بے نیاز کی تعریف یہ ہے کہ اسے کسی کی کوئی ضرورت نہ ہو لیکن سب کو اس کی ضرورت ہو۔ اس مادی کائنات کو اپنے وجود کے قیام کے لئے خلا کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن خلا کو کسی کی نہ کوئی ضرورت ہے نہ پرواہ۔

۵۔ خدا ہر جگہ موجود ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ خلا بھی ہر جگہ موجود ہے اور ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

لیکن شاید اتنا کہہ دینے سے بات واضح نہیں ہوگی اس لئے اس سائنسی نکتے کی آسان لفظوں میں وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے زبانی طور پر بھی اور ان کی خود نوشت سوانح کے ذریعے بھی اتنا تو جان چکا ہوں کہ اگر کروڑوں نوری سال سے بھی زیادہ مسافت پر پھیلی ہوئی ساری مادی کائنات میں سے خلا کو نکال دیا جائے تو سارا مادہ ایک گیند کے برابر یا اس سے بھی کم چیچ بھر رہ جائے گا۔ بعض سائنس دانوں کے نزدیک اسے Compress کیا جائے تو یہ اس سے بھی کم ہو کر سوئی کی نوک پر سما جائے گا۔ اگر کوئی اینٹی میٹر اس سے ٹکرا جائے تو یہ مادہ بھی گاما ریز میں تبدیل ہو کر غائب ہو جائے گا اور باقی صرف خلا رہ جائے گا۔ اور خدا کی بجائے خلا کے لفظ سے بھی غالبؔ کا یہ شعر اپنے مفہوم میں غلط نہیں

رہے گا۔

نہ تھا کچھ،تو خلا تھا، کچھ نہ ہوتا، تو خلا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں، تو کیا ہوتا!

شہ رگ سے قریب ہونے والی بات کی وضاحت رہی جارہی ہے۔اسے بھی آسان لفظوں میں بیان کرنا ضروری ہے۔ایٹم کے اندر جو پارٹیکلز ہیں ان کے درمیان بھی خلا ہے۔پروٹون اور الیکٹرون کے درمیان خلا کو سمجھنے کے لئے یہ جان لیں کہ اگر پروٹون کا سائز ایک فٹ بال جتنا تصور کرلیا جائے تو اس سے الیکٹرون تقریباً دو میل کی دوری پر ہوگا۔اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے وجود کے ہر ذرے میں خلا کس حد تک سرایت کئے ہوئے ہے اور اسی مناسبت سے وہ واضح طور پر ہم سے ہماری شہ رگ سے بھی قریب ہے۔

سو یوں ایک سطح پر فکری طور پر میرا مسئلہ یہ بنا کہ خدا کو اس کی صفات کے ذریعے جانا جائے تو انسانی صفات اور خلا کی صفات جیسی مشترکہ صفات کو چھوڑ کر کوئی ایسی صفت بھی ہونی چاہئے جو صرف خدا ہی کا امتیاز ہو۔اور وہ صفت کونسی ہے؟۔۔۔میری زندگی کا بیشتر عرصہ ایک شوگر مل میں مزدوری کرتے گزرا ہے۔وہاں لیبارٹری میں گرمیوں کے دنوں میں بہت ہی چھوٹے چھوٹے روشنی کے کیڑے آجاتے تھے(ان کیڑوں کے کچھ احوال کے لئے میرا ایک پرانا افسانہ ''پتھر ہوتے وجود کا دُکھ'' پڑھئے)۔ان میں سے کوئی کیڑا اگر پوری شوگر مل کی حقیقت جاننا چاہے تو یہ اس کے بس کی بات نہیں ہے۔انسان کی حقیقت خدا کے سامنے کیڑے اور شوگر مل کی مناسبت جیسی بھی نہیں ہے۔لیکن پھر بھی انسان میں اپنے خالق و مالک کو جاننے کی جستجو تو ہے۔

حضرت علیؓ کا ایک فرمان اس جستجو میں میری رہنمائی کر گیا۔**کمال التوحید نفی عن الصفات**۔۔۔توحید کی حقیقت اور کمال تب ظہور فرماتا ہے جب صفات کی بھی نفی ہو جاتی ہے۔یا یوں کہہ لیں کہ صفات بھی بہت پیچھے رہ جاتی ہیں۔اور اس حقیقتِ عظمیٰ کے سامنے صفاتی نام بھی حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔پھر ایک حدیث شریف میں مذکور ایک دعا کے ذریعے بھی خدا کو جاننے کی جستجو کو تسکین سی ملی۔مسلم شریف کی اس دعا کا متعلقہ حصہ یہاں تبرکاً درج کر دیتا ہوں۔**اللھم ...اسئا لک بکل اسمٍ ھو لک سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او علمتہ احدا من خلقک اواستاء ثرت بہ فی علم الغیب عندک ان تجعل القرآن العظیم ربیع قلبی** اے اللہ

!۔۔۔میں سوال کرتا ہوں تیرے اس نام کے ساتھ جو تو نے اپنے لیے پسند کیا، یا اپنی کتاب میں تو نے اتارا ہے، یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہے، یا اپنے علم غیب میں تو نے اسے اختیار کر رکھا ہے، اس بات کا کہ تو کر دے قرآن مجید کو میرے دل کی فرحت وخوشی۔

گویا خدا کا کوئی ایک ایسا نام ابھی ہے جو بڑی بڑی صاحبِ عرفان ہستیوں کو بھی معلوم نہیں ہے۔''(**''کھٹی میٹھی یادیں''۔باب''رہے نام اللہ کا!''**)

نذیر ناجی صاحب نے اقبال کے حوالے سے تخلیقی گناہ کی جو بات کی ہے، مزے کی لگی ہے۔اسی طرح اقبال کے حوالے سے دوزخ کی اصلاحی کیفیت کا ذکر بھی دلچسپ بلکہ امید افزاء لگا۔اسے میں اپنے طور پر یوں سوچتا ہوں کہ روح خالص سونا ہے۔انسان اپنے گناہوں سے اس میں کھوٹ شامل کرتا جاتا ہے۔سو دوزخ ایسی کٹھالی ہوگی جس میں گناہوں کا سارا کھوٹ نکل جائے گا اور خالص سونے جیسی روح اپنے اصل مسکن میں بھیج دی جائے گی۔باقی واللہ اعلم۔

خدا کا شکر ہے کہ نذیر ناجی صاحب نے اپنی اس تحریر کو ضائع نہیں کیا۔بے ساختہ لکھی گئی اس تحریر میں اگر کہیں ربط باہمی کی کوئی کمی رہ گئی ہے تو وہ بھی نذیر ناجی صاحب کے اخلاص کی مظہر ہے۔حقیقتاً وہ ایسی کمی بھی نہیں ہے بلکہ فکری تسلسل میں ایک موضوع سے دوسری طرف جست بھرنے سے مشابہ ہے۔میں نے ان کے چند چیدہ چیدہ نکات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اگر ہر اہم نکتے پر مکالمہ کرنے لگتا تو شاید ان کے تینوں کالموں سے زیادہ لکھنا پڑ جاتا۔ان کا شکر گزار ہوں کہ ان کے کالموں نے مجھے اپنے سوالات کی روشنی میں مزید غور وفکر کی طرف مائل کیا

نذیر ناجی صاحب کے ان کالموں کا خلاصہ اتحاد آدم اور ارفع مذہب کے جس تصور کو اجاگر کر رہا ہے، وہ آج کے عہد کی ضرورت ہے۔خدا کرے کہ عالمی سطح پر ایسی سوچ توانا ہو سکے اور انسانیت کی سلامتی اور بقا کو لاحق خدشات دور ہو جائیں۔آمین۔

والسلام

حیدر قریشی(جرمنی) ۱۷/اکتوبر۲۰۱۵ء

---

http://punjnud.com/Aarticles_detail.aspx?ArticleID=55&
ArticleTitle=Nazeer%20Naji%20Ke%20Teen%20Column

رضینہ خان کا مقالہ اور چند وضاحتیں

جواہر لال یونیورسٹی دہلی کی ریسرچ اسکالر رضینہ خان نے 12 ستمبر 2015ء کو قومی کونسل اور غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ایک سیمینار میں اپنا مقالہ ''اردو ماہیا اور حیدر قریشی'' (۱) پڑھا تھا۔ انہوں نے تقریب کے بعد اپنا مقالہ مجھے بھی عنایت کیا۔ جسے پڑھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ تاہم تحقیقی زاویے سے ایک دو مقامات پر مجھے ایسے محسوس ہوا کہ بات پوری طرح واضح نہیں ہو پائی۔ سیمینارز میں وقت کی کمی کے باعث مقالہ میں اختصار کی مجبوری بھی اس کا سبب ہو سکتی ہے۔ اور بلا ارادہ تحقیق میں تھوڑی سی کمی رہ جانے کی وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ رضینہ خان میرے افسانوں کے حوالے سے ایم فل کا مقالہ لکھ چکی ہیں (۲)۔ یہ مقالہ میرے تئیں ان کے تحقیقی و تنقیدی اخلاص کا اظہار بھی ہے اور ان کے نگران پروفیسر مظہر مہدی کی علمی و ادبی محبت کا مظہر بھی۔ اس کے لیے میں ان دونوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

اب میں مزید کسی تمہید کے بغیر براہِ راست اپنی وضاحتوں کی طرف آتا ہوں۔ رضینہ خان نے مجھ سے منسوب یہ بات لکھی ہے کہ: ''ہمت رائے شرما نے فلم ڈائریکٹر آر۔سی۔ تلوار کی مئی 1936ء میں ریلیز ہونے والی فلم ''خاموشی'' کے لیے ماہیے لکھے تھے۔'' (مقالہ: رضینہ خان)

میں نے کہیں بھی ایسا نہیں لکھا کہ فلم خاموشی 1936ء میں ریلیز ہوئی ہے۔ 1936ء میں اس پر کام شروع ہوا اور 1937ء میں یہ فلم ریلیز ہوئی۔ ممکن ہے ایک آدھ سال کی مزید تاخیر بھی ہو گئی ہو۔ 1936ء میں ریلیز کیے جانے والی بات کی تصحیح ضروری ہے۔ ویسے یہ معمولی سا سہو ہے۔

رضینہ خان نے مرزا حامد بیگ کے اس الزام کو پیش کیا ہے کہ:

''بک لیٹ ہمت رائے شرما نے خود شائع کر دی یا کم از کم اس بک کے سرورق کے مندرجات خصوصاً ''مئی 1936ء'' کی تاریخ ان کے ذہن کی پیداوار ہو سکتی ہے۔''

لیکن اس کے جواب میں میری وضاحت پورے پس منظر کے ساتھ سامنے نہیں آ سکی۔ اس سلسلہ میں مرزا حامد بیگ کے اس الزام کو بھی سامنے رکھ لیا جائے۔

''اس جعل سازی سے پردہ اُٹھ جانے کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فلم خاموشی کے لیے اردو ماہیے ہمت رائے شرما نے لکھے بھی تھے یا نہیں؟ کیا فلم میں یہ ماہیے شامل کئے گئے؟ اور اگر شامل کیے گئے تو فلم کا گیت کار ہمت رائے کون تھا؟'' (۳)

یہ ساری باتیں میرے پیش نظر تھیں اور تب میں نے اپنے جواب میں جو لکھا تھا اس کے تین اقتباس پیش ہیں۔

''یہ گھٹیا الزام کہ ہمت رائے شرما جی نے فلم ''خاموشی'' کی بک لیٹ جعلی طور پر تیار کی ہے، یا کم از کم اس میں مئی 1936ء کی تاریخ انہوں نے خود لکھوالی ہے، سراسر بہتان ہے اور میں ذاتی طور پر اس کی کھلے لفظوں میں تردید کرتا ہوں کیونکہ میں ان سے خط و کتابت کے علاوہ متعدد بار ٹیلی فون پر بات کر چکا ہوں۔ **وہ طویل عرصہ سے فالج کا شکار ہیں۔ بات کرتے کرتے کئی بار بات بھول جاتے ہیں ذرا سی بات پر بچوں کی طرح بلکنے لگتے ہیں۔ ایسی حالت اور ایسی کیفیت کا حامل کوئی شخص ایسی کاریگری نہیں کر سکتا جو مرزا حامد بیگ نے ان سے منسوب کر دی ہے۔** حامد بیگ نے اگر شرما جی کے تعلق سے میری دوسری تحریریں بھی تحقیقی زاویے سے پڑھ لی ہوتیں تو اس تحقیقی جہالت اور بداخلاقی کے مرتکب نہ ہوتے۔ شرما جی کی علالت اور مذکورہ کیفیت کا میں اپنے مضمون 'اردو ماہیے کے بانی۔ ہمت رائے شرما' مطبوعہ ''انشاء'' کلکتہ شمارہ ستمبر۔ اکتوبر 1998ء اور ''اوراق'' لاہور شمارہ جنوری۔ فروری 1999ء میں ذکر کر چکا ہوں۔ حامد بیگ نے وہ مضمون پڑھ رکھا ہوتا تو جعل سازی کا گھٹیا الزام لگانے میں اتنی دلیری نہ دکھاتے۔

ماہیے کی بحث شروع ہونے سے کئی سال پہلے 1984ء میں ہمت رائے شرما جی کا شعری مجموعہ ''شہاب ثاقب'' شائع ہوا تھا۔ اس میں شرما جی کے وہی دس ماہیے شامل ہیں جو فلم ''خاموشی'' سے منسوب ہیں۔ اسی مجموعہ کے فلیپ پر شرما جی کے تعارف میں یہ الفاظ بھی درج ہیں:

''ہمت رائے شرما ایک باکمال فنکار ہیں۔ 23 نومبر 1919ء کو شرما صاحب نارووال ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ 17 سال کی عمر میں فلم ''خاموشی'' کے گیت لکھے''۔

1984ء میں ہمت رائے شرما جی کو یا ان کے تعارف نگار کو کوئی ایسی غرض لاحق نہ تھی کہ ایسی بات لکھ کر خود کو ماہیے کا بانی بنوانا ہے، کیونکہ تب ماہیے کا کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ ویسے مرزا حامد بیگ جیسے محقق یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شرما جی نے تب سے ہی پلاننگ کر لی تھی۔'' (۴)

''تحقیقی حوالے سے مرزا حامد بیگ اس لئے بھی قابل اعتبار نہیں رہتے کہ وہ ماہیے کی اب تک کی تحقیقی پیش رفت سے ہی غافل ہیں۔ انہوں نے فلم ''باغبان'' بننے کا سال 45-1944ء بیان کیا ہے جبکہ یہ سال 1937ء ہے۔ جب دستیاب معلومات کے باوجود غفلت کا یہ عالم ہے تو پھر تحقیق کرنے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔''(۵)

''ہمت رائے شرما جی کے سارے ماہیے ان کے شعری مجموعہ ''شہاب ثاقب'' میں بھی شامل ہیں اور یہ مجموعہ ماہیے کی حالیہ بحث سے کہیں پہلے (بیس سال کی تاخیر کے باوجود) 1984ء میں چھپ چکا ہے۔ ان حقائق کے ہوتے ہوئے مرزا حامد بیگ کا ایسے سوال اٹھانا ان کی جہالت ہے یا پھر دیدہ دانستہ شرارت ہے کہ:

''فلم ''خاموشی'' کے لئے اردو ماہیے ہمت رائے شرما نے لکھے بھی تھے یا نہیں؟ کیا فلم میں یہ ماہیے شامل کئے گئے؟ اور اگر فلم میں یہ ماہیے شامل کئے گئے تو فلم کا گیت کار ہمت رائے شرما کون تھا؟ جب تک سنیما اسکرین پر یا وڈیو کیسٹ کے ذریعے فلم ''خاموشی'' کے تعارفی ٹائٹلز میں ہمت رائے شرما کا نام نہ دیکھ لیا جائے تب تک یہ معاملہ التوا میں رہے گا''۔

جب ہمت رائے نام ملنے پر بھی آپ نے یہ شرارت کرنی ہے کہ یہ گیت کار ہمت رائے کون ہے؟ تو ٹائٹل پر ان کا نام مل جانے کے بعد بھی آپ کا یہ سوال تو قائم رہے گا۔ سو تادمِ تحریر دستیاب حقائق کی بنیاد پر ہمت رائے شرما جی نے مئی 1936ء سے پہلے، اردو میں سب سے پہلے ماہیے لکھے تھے اور وہی اردو ماہیے کے بانی ثابت ہوئے ہیں۔''(۶)

رضینہ خان نے اپنے مقالہ میں لکھا ہے:

''زمانی لحاظ سے ہمت رائے شرما کو فوقیت دینے کے لئے حیدر قریشی نے ''مسلم انڈینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری'' از احمد سعید ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری۔ ایم اے او کالج لاہور کا حوالہ پیش کر کے اپنے موقف کو مضبوط بنایا ہے۔''(۷)

یہاں بے شک میری توصیف کی گئی ہے لیکن زمانی لحاظ سے ہمت رائے شرما جی کو فوقیت دینے کے حقائق سامعین/قارئین کی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ سو مناسب سمجھتا ہوں کہ مذکورہ حقائق کو بھی یہاں پیش کر دوں۔

''حمید نسیم نے اپنی کتاب ''ناممکن کی جستجو'' کے صفحہ 44 اور 46 پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ

ہے۔ ڈاکٹر تاثیر جنوری 1936ء میں ایم۔اے۔او کالج امرتسر میں پرنسپل بن کر آئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک مشاعرہ برپا کرایا جس میں صوفی تبسم، پنڈت ہری چند اختر، مولانا سالک اور چراغ حسن حسرتؔ کو لاہور سے مدعو کیا گیا۔ اسی مشاعرہ میں حسرت نے اپنے مشہور مبینہ ''ماہیے'' پہلی بار سنائے۔ اس بیان کے مطابق حسرتؔ نے اگر جنوری 1936ء میں ''ماہیے'' سنائے ہیں تو ان کا سالِ تخلیق بھی کم از کم جنوری 1936ء بنتا ہے۔ یوں انہیں زمانی طور پر شرما جی پر فوقیت مل سکتی ہے۔ لیکن ایک اور حوالہ ملنے سے حسرت کا سالِ تخلیق تو 1936ء رہتا ہے لیکن انہیں شرما جی پر زمانی فوقیت نہیں رہتی۔ ہر لحاظ سے شرما جی کو ان پر فوقیت رہتی ہے۔ اور **وہ حوالہ ''مسلم انڈینز آف بائیوگرافیکل ڈکشنری'' از احمد سعید ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری، ایم۔اے۔او کالج لاہور کا ہے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر 327 پر ڈاکٹر تاثیر کے جو کوائف درج کئے گئے ہیں ان میں یہ واضح طور پر درج ہے کہ ڈاکٹر تاثیر نے ایم۔اے۔او کالج امرتسر کے پرنسپل کی حیثیت سے 20 مئی 1936ء کو کام شروع کیا۔ سو اگر انہوں نے آتے ہی مشاعرہ کرایا اور اس سلسلے میں آٹھ دس دن لگ گئے تو مشاعرہ کا مہینہ جون بنے گا۔ اگر حسرت نے جون 1936ء میں ''ماہیے'' سنائے تو یہ ''خاموشی'' کے گیت تخلیق ہونے اور بک لٹ چھپنے کے بعد کی بات ہو جاتی ہے۔ تاہم اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ حسرت نے اپنے ''ماہیے'' 1936ء میں تخلیق کئے تھے اور یہ 1937ء میں فلم ''باغباں'' میں شامل بھی کر لئے گئے تھے۔**

اب ایک طرف تحقیق کا یہ مرحلہ ہے، دوسری طرف ہمارے ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ہیں جو حسرتؔ کے ''ماہیے'' 45-1944ء میں ہونے کا حکم سنا رہے ہیں۔ اور ایسی تحقیق کے زعم میں ہم لوگوں کے کام کو ''تحقیق پر آیا ہوا برا وقت'' کہہ کر طنز بھی فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے ایسے ''محقق'' ہی ایسا حکم صادر کر سکتے ہیں۔ پھر بھی انہیں یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ کسی کے ایک آدھ مضمون کو آدھا ادھورا پڑھ کر اور کسی اور آدھے ادھورے حوالے کی بنیاد پر نام نہاد تحقیق کی جائے تو ہلدی کی گانٹھ ملنے پر پنساری بننے والی مثال فٹ بیٹھ جاتی ہے۔''(۸)

میری ان وضاحتوں کے بعد زیرِ بحث موضوع کے وہ سارے تحقیقی پہلو کھل کر سامنے آ گئے ہیں جو رضینہ خان کے مقالہ میں ضمناً یا اشارتاً بیان ہوئے تھے۔ ان سارے حقائق کے سامنے ہونے کے بعد تحقیق کے طالب علم اور علماء بہتر طور پر نتائج اخذ کر سکتے ہیں۔

آخر میں رضینہ خان کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے دہلی کے ایک اہم سیمینار کے لیے ماہیا کو اپنا

موضوع بنایا۔ان کے مقالہ سے مجھے مزید حقائق کو بیان کرنے کے لیے مثبت تحریک ملی ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اب اردو ماہیا سے دلچسپی رکھنے والے تخلیق کاروں میں تخلیق کاری کی ایک نئی لہر اُٹھے گی۔

حوالہ جات

(۱) ''اردو ماہیا اور حیدر قریشی'' از رضینہ خان۔مطبوعہ۔

(۲) رضینہ خان کا ایم فل کا مقالہ ان لنکس پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/2014/05/blog-post_6154.html

https://archive.org/details/MaqalaM.PhilByRazeenaKhan

(۳) اردو ماہیا میں اولیت کا قضیہ از مرزا حامد بیگ۔مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔

شمارہ مئی 2000ء ۔ص34

(۴) مرزا صاحب کے جواب میں از حیدر قریشی۔بحوالہ ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' ص۔507-506

(۵) ایضاً ص۔507

(۶) ایضاً ص۔510-509

(۷) ''اردو ماہیا اور حیدر قریشی'' از رضینہ خان۔**مطبوعہ۔**

(۸) مرزا صاحب کے جواب میں از حیدر قریشی۔بحوالہ ''اردو ماہیا تحقیق وتنقید'' ص۔509-508

سہ ماہی **اسباق** پونہ۔اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۵ء

تھائی لینڈ کا سفر نامہ

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کا سفر نامہ ''تھائی لینڈ کے رنگ'' حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ہائر ایجوکیشن کمیشن کی جانب سے مختلف یونیورسٹیوں کے ۲۴ پاکستانی اساتذہ کو تھائی لینڈ کے مطالعاتی دورہ پر بھیجا گیا تھا۔تھائی لینڈ میں ایشین انسٹیٹیوٹ آف ٹیکنالوجی اس وفد کا سہولت کار تھا ان اساتذہ میں ہزارہ یونیورسٹی مانسہرہ کے شعبہ اردو کے ڈاکٹر الطاف یوسف زئی بھی شامل تھے۔انہوں نے سفر سے واپسی پر اس سفر کی روداد کو ایک سفر نامہ کی صورت میں قلمبند کیا اور اب یہ کتاب ''تھائی لینڈ کے رنگ'' کے نام سے شائع ہوگئی ہے۔اس سفر نامہ میں دورہ کی مصروفیات کے ساتھ تھائی لینڈ کی تہذیب وثقافت کی مختلف جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔تھائی لینڈ کے ماضی کے احوال سے لے کر حال کی ترقیات تک کا ذکر اس سفر نامہ میں مل جاتا ہے۔خیبر پختونخواہ سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے ایک کمال یہ کیا ہے کہ تھائی لینڈ میں بسا ہوا ایک چھوٹا سا ''کے پی کے'' دریافت کر کے دکھا دیا ہے۔بے شک تھائی لینڈ کا سفر نامہ لکھنے والے دوسرے سفر نامہ نگاروں کے ہاں بھی اس کا کچھ ذکر ملتا ہوگا لیکن مجھے پہلی بار ''تھائی لینڈ کے رنگ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے اس حقیقت کا علم ہوا کہ تھائی لینڈ میں صوبہ خیبر پختونخواہ کے مختلف علاقوں سے گئے ہوئے کئی لوگ نہ صرف وہاں آباد ہیں بلکہ اپنا تشخص قائم رکھتے ہوئے پوری طرح سے اُس سوسائٹی کا حصہ بن چکے ہیں۔

''تھائی لینڈ کے رنگ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری بھی ان کے ساتھ سفر میں شامل ہو جاتا ہے۔آیئے ہم مل کر ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کے سفر میں شامل ہوتے ہیں۔سو تھائی لینڈ روانہ ہونے کے لیے جہاز میں سوار ہو جایئے۔

''جہاز چڑھتے ہی تھائی ائیر ہوسٹس نے جان بچانے کے طریقے سکھانے کے لیے جن اشاروں اور کنایوں کا سہارا لیا اُسی سے ہماری جان نکل گئی۔اُن کی تھائیوں سے نظر ہٹانا ہمارے لیے

جان جوکھوں کا کام تھا۔'' **(ص۲۰)**

تھائی لینڈ میں نیرومن ایک اچھی گائیڈ اور استانی ثابت ہوئیں۔ پہلے ان کے بارے میں اور پھر ان کے توسط سے تھائی لینڈ کے بارے میں اچھی معلومات فراہم کردی گئی ہے۔ مثلاً:

''نیرومن ایشین انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں پروگرام سپیشلسٹ اور علمی و تربیتی ترویجی شعبے کی صدر نشین ہیں۔ جن کی بنیادی ذمہ داری تربیتی کورس کا انتظام و انصرام اور اس کے بہتر نفاذ کے لیے سہولت کاری تھی۔ آٹھ سال سے اس ادارے سے منسلک نیرومن، امریکہ سے ہیومن ریسورس میں گریجویٹ ہیں۔ مزید برآں چنگ مائی یونیورسٹی تھائی لینڈ سے بی ایڈ اور چولالونگ یونیورسٹی سے ایم ایڈ کی سندیں حاصل کررکھی ہیں۔ ساتھ ساتھ امریکن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا کورس ورک لرننگ ٹیکنالوجی کے خصوصی مطالعے کے ساتھ مکمل کیا ہے۔ نیرومن کو بدیسی زبانیں سیکھنے کا ازحد شوق تھا۔ بنکاک سے چنگ مائی سفر کے دوران وہ مجھ سے اکثر پشتو زبان کے الفاظ سیکھتی رہیں۔ اُن کو پشتو لفظ ''منہ'' بہ معنی تشکر خوب بھایا تھا۔ اس لیے دورانِ تربیت مجھ سے اُن کا مکالمہ ''منہ'' پر ہی اختتام پذیر ہوتا۔ نیرومن کا لباس انتہائی سادہ ہوتا تھا۔ تیئس دنوں کی اس ٹریننگ میں انھوں نے صرف تین شرٹس تبدیل کیں جبکہ ہمارے ساتھ آئی ہوئی بعض خواتین ایک دن میں تین دفعہ لباس تبدیل کرتی تھیں۔'' **(ص۲۵۔۲۶)**

''نیرومن نے تھائی لینڈ کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائیں یہاں کی زبان، قومیت اور آب وہوا کے حوالے سے باخبر کیا۔ اُن کی دی گئی معلومات کے مطابق تھائی لینڈ کی پچانوے فی صد آبادی بدھ مت کی پیروکار ہے۔ یہاں کی کرنسی باٹ ہے۔ مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا چار فی صد ہے۔ رقبے میں یہ ملک پاکستان سے تھوڑا کم لیکن آبادی کا تفاوت بہت زیادہ ہے۔ تھائی لینڈ کی آبادی سات کروڑ ہے۔'' **(ص۲۸)**

تھائی لینڈ کی ماہر تعلیم نیرومن اور ہمارے پاکستانی اساتذہ کی موضوعاتی ترجیحات مختلف ہونے لگیں تو ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے اس کا ذکر یوں کردیا۔

''نیرومن سیاسی گفتگو سے پرہیز برت رہی تھیں۔ جبکہ پاکستانی پروفیسر اسی موضوع پر گفتگو کو آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ ہم پاکستانیوں کا سیاسی فشارِ خون دیگر اقوام سے بلند ہے۔ بات کو نیا رُخ دینے میں ماہر نیرومن نے کہا تھائی لینڈ ایک زرعی ملک ہے زراعت سے ہونے والی آمدنی باقی تمام شعبوں سے زیادہ ہے۔ نیرومن نے کئی زرعی اجناس کا ذکر کیا جو یہاں کاشت کی جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ چاول

کاشت ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگوں کی غذا کا بڑا حصہ سمندر سے آتا ہے۔ مچھلی اور دیگر سمندری جانوروں کو پانی میں اُبال کر کھاتے ہیں۔ چکنائی اور مصالحہ جات کو زیادہ پسند نہیں کرتے پھلوں کا استعمال بھی زیادہ ہے سیب، امرود، کیلا، خربوزہ، تربوز، ناریل اور سب سے بڑھ کر انناس بھی فروخت ہوتے دیکھے۔''

(ص۴۸)

نیرومن کے ذریعے تھائی لینڈ کے بارے میں اس قسم کی معلومات بھی میسر آتی ہے۔

''نیرومن نے بتایا کہ تھائی لینڈ میں بادشاہت ہے۔ اس وقت نوویں راما کا دور ہے۔ بادشاہ کے زیرِ سایہ ایک پارلیمنٹ بھی کام کررہی ہے۔ مگر آج کل معطل ہے۔ وزیرِ اعظم معزول ہیں اور ملک میں فوجی حکومت قائم ہے نیرومن کو اپنی معزول خاتون وزیرِ اعظم سے ہمدردی تھی جس نے کچھ فلاحی کام کیے تھے اور خواتین کے حقوق کے لیے بعض عملی اقدامات اُٹھائے تھے۔ عام شہریوں کے لیے قرضہ سکیم شروع کی جس سے عوام مستفید ہورہی ہے۔'' **(ص۲۹)**

''نیرومن کا بادشاہ بھی غالب کے بادشاہ کی طرح موسیقی کا رسیا ہے Saxophone کو مہارت کے ساتھ بجا سکتا ہے۔ اُنیس سال کی عمر میں کئی مشکل اور پکے راگوں کو پیانو اور گٹار پر آسانی اور روانی کے ساتھ بجا سکتا ہے۔ اُن کی بنائی ہوئی دھنوں پر گائے جانے والے نغمے۔ "Love at Sun downs", "Blues", "Candle Light" اور "Falling Rain" لوگ شوق سے سنتے اور محظوظ ہوتے ہیں۔ یہ ساری کہانی تو تاجوری سے پہلے کی ہے۔ بادشاہ بننے کے بعد بھی Jazz کے نام سے ایک بینڈ بنایا اور ریڈیو تھائی لینڈ پر باقاعدگی کے ساتھ پرفارم کرتے اور لوگوں کی ٹیلی فون کالز پر فرمائشیں پوری کرتے تھے۔''

(ص۳۳)

نیرومن سے باتوں کے بعد ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے تھائی لینڈ میں خیبر پختونخواہ دریافت کرنا شروع کیا اور ایسا دریافت کیا کہ لگتا ہے تھائی لینڈ کا وہ علاقہ ہمارے قبائلی علاقہ میں ہی کہیں بسا ہوا ہے۔ تھائی لینڈ میں آباد صوبہ خیبر پختونخواہ کی چند جھلکیاں ان اقتباسات میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

''شلوار قمیص تھائی لوگوں کے لیے کوئی نیا لباس نہیں۔ یہاں صدیوں سے پٹھانوں کا آنا جانا ہے پٹھانوں کی ایک بڑی تعداد یہاں کی شہری ہے۔ یہاں تک کہ جنوبی تھائی لینڈ میں تو ایک صوبے کا نام بھی پٹھانی ہے۔ اسی طرح شمال میں چائنا کی طرف فٹ سانولوک اور چنگ مائی صوبوں میں کثیر تعداد میں پشتون آباد ہیں۔ فٹ سانولوک کے امپریل میاؤ پنگ ہوٹل کے سامنے ایک بہت بڑی پاکستانی مسجد

ہے۔مس اے نے کہا کہ مسجد کے سامنے حلال کھانا آسانی سے مل سکتا ہے۔'' **(ص۵۰)**

''تھائی لینڈ کے جنوب میں پانچ صوبے، نراتی وت، ہدجائے، ستون، یلہ اور پٹھانی خالص مسلم آبادی والے صوبے ہیں۔ پاکستان خصوصاً خیبر پختونخوا کی بہت بڑی آبادی یہاں مستقل آباد ہے۔ وہی بودوباش، اُسی طرح کے گھر، وہی حجرے، حجروں کے اندر دالان میں چارپائیاں، لگتا ہے خیبر پختونخوا میں آ گئے ہیں۔ یلہ صوبے میں ایک بہت بڑی مسجد ہے۔'' **(ص۵۵)**

''بنکاک سٹی کے اندر رام کم پینگ روڈ پر ایک چوڑی گلی میں تھوڑے فاصلے پر اسلامک سنٹر کی ایک عالی شان عمارت ہے جو وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ عمارت تھائی لینڈ میں مسلم آبادی کے اتحاد کی نشانی ہے۔ یہاں پانچ سے چھے ہزار آدمی آسانی سے نماز ادا کر سکتے ہیں۔ عام دنوں میں بھی نمازیوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے مگر جمعہ کے دن تل دھرنے کی جگہ نہیں ہوتی۔ کئی منزلہ اس خوبصورت سنٹر کے بالا خانے میں بین المذاہب ہم آہنگی پر اکثر پروگرام منعقد ہوتے ہیں۔ **(ص۵۷۔۵۸)**

''مسافر کو یہ جان کر خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی کہ یہاں ایک کلب ہے جو تھائی پٹھان کلب کے نام سے مشہور ہے۔ اس کلب کو تھائی لینڈ کے پٹھانوں کا ''لویہ جرگہ'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔۔۔۔۔۔ تھائی پٹھان کلب کے ایک ممبر لالہ ڈینگ ہیں۔ تھائی زبان میں ڈینگ سرخ کو کہتے ہیں لالہ کی عمر ستر سال کے لگ بھگ ہوگی۔ پاکستان بننے سے قبل ان کا خاندان یہاں آباد ہوا۔ لالہ ٹرانسپورٹ کے کاروبار سے منسلک ہیں ان کی تقریباً چار سو ڈبل ڈیکر گاڑیاں بنکاک سے مختلف صوبوں اور قریبی ممالک برما اور لاؤس وغیرہ میں چلتی ہیں۔ رمضان المبارک میں لالہ کی سخاوت اور فراخ دلی دیدنی ہوتی ہے۔ ہزاروں مسلمانوں کو روزانہ افطاری کرواتے ہیں۔ ۲۰۱۰ء کے سیلاب زدگان کی مدد کے لیے لالہ پاکستان بھی آئے تھے۔ مونچھ داڑھی سے بے نیاز لالہ بنکاک کے ایک پوش علاقے میں رہائش پذیر ہے۔''

(ص۵۹)

''تھائی پٹھانوں میں ایک بڑی شخصیت بائی خان کے نام سے مشہور ہے۔ جنوبی تھائی لینڈ کے رہائشی اس خان سے استادِ محترم ڈاکٹر ظہور احمد اعوان کی اچھی دوستی تھی۔ ظہور اعوان صاحب اکثر ہماری کلاس میں بائی خان کا ذکرِ خیر کرتے تھے۔ وہ کہتے کہ اگر بندے میں صلاحیت ہو تو پردیس میں بھی بڑا نام پیدا کر سکتا اور بڑی دولت کما سکتا ہے۔ **(ص۶۲)**

تھائی لینڈ میں اسلامک بنک کی دریافت بھی پڑھنے والوں کے لیے دلچسپی کا موجب بنتی

ہے۔ لیکن تھائی لینڈ اور پاکستان کی اقتصادیات کا موازنہ مختلف ثقافتی نشیب و فراز یا ثقافتی پیچ و خم کے باعث زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایک اقتباس:

''تھائی اسلامک بنک کے مرکزی دفتر میں مالاکنڈ کے رہائشی فہد یوسف زئی وائس پریذڈنٹ پراڈکٹ ڈویلپمنٹ کے طور پر فرائض انجام دے رہے ہیں۔ پچھلے چار سال سے تھائی لینڈ میں مقیم متوازن قد و قامت کے اس خوش شکل پٹھان سے جب میں نے تھائی اور پاکستانی معیشت کے بارے میں سوال کیا تو ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں شرارت لا کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگے کوئی تقابل نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ تھائی لینڈ کا شمار بھی تیسری دنیا میں ہوتا ہے جہاں سوشیوا کا نمک گروتھ میں ابھی بہتری کی گنجائش بھی ہے مگر پاکستان سے اس کا موازنہ خام خیالی ہوگی۔ جب میں نے احساسِ تفاخر کے ساتھ کہا کہ تھائی لینڈ ہم سے اتنا آگے تو نہیں ہمارے تین سو اتین روپے پر اِن کا ایک باٹ ہے۔ میں نے مزاقاً کہا اگر پاکستان کے گلی کوچوں میں ٹھیک طرح سے جھاڑو دی جائے تو تھائی لینڈ بن جائے تو انھوں نے ایک چھوٹی سی مثال دی اور میرا احساس تفاخر کافور ہو گیا۔ کہنے لگے پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر جب دس بلین سے بڑھ گئے تو پاکستانیوں نے اس پر بغلیں بجائیں جبکہ عین اُس وقت تھائی زرِمبادلہ کے ذخائر ۲۰۰ ارب ڈالر سے زیادہ تھے۔ میں سوچنے لگا کہ پاکستان سے تین گنا کم افرادی قوت نے بیس گنا زیادہ دولت کیسے جمع کر لی۔ خیر اس کا جواب تو مجھے بنکاک کی شبینہ بازاری سے مل گیا جہاں صرف ایک شہر میں لاکھ سے زیادہ قحبائیں ہیں۔ ہر ایک کی اوسط آمدنی پانچ سے دس ہزار باٹ شبانہ ہے۔ جس میں سے آدھی حکومتی کاروبار اور آدھی مضروبہ کے آنگن کے کاروبار میں خرچ ہوتی ہے۔''

(ص۳۸)

بنکاک کی شبینہ بازاری کا ذکر کرتے ہوئے تھائی لینڈ کی اقتصادی ترقی کا حال تو بیان ہوتا ہے لیکن ساتھ ہی وہاں جسم فروشی کے کاروبار کے حوالے سے ایسی چشم دید معلومات فراہم کرتے ہیں کہ بندہ سوچتا رہ جائے کہ اس احوال سے عبرت حاصل کی جائے؟، لذت کشید کی جائے؟ یا بنکاک کا سفر ہی کر لیا جائے تاکہ عبرت ہو یا لذت جو بھی حاصل ہو مکمل طور پر حاصل ہو۔ ان اقتباسات سے صورتِ حال کی سنگینی و رنگینی دونوں کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''یہاں کی رنگین راتیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ عریانی کا اشتہار بنی دوشیزائیں سیاحوں کو غمزوں، عشوؤں اور اداؤں سے بوم بوم کی دعوت دیتی نظر آتی ہیں۔ دنیا بھر سے جسم فروش حسینائیں یہاں

دولت لوٹنے اور عزت لٹانے آتی ہیں۔ پاتیہ کی رنگین زندگی سرِ شام شروع ہو جاتی ہیں اور صبح تک جاری رہتی ہے ہوٹلوں میں عریاں ڈانس پارٹیاں اور شراب کی محفلیں ساری رات چلتی ہیں پاتیہ میں حسینائیں سیاحوں سے لپٹ لپٹ کر ریٹ طے کرتی ہیں'' **(ص ۶۰)**

''بنکاک شہر کے کونے کونے میں ''بوم بوم'' کا ورد سنائی دیتا ہے گلیوں، کوچوں، چوراہوں، بازاروں، ہوٹلوں، پلازوں، بسوں، ٹرینوں اور اس کے اڈوں میں تھائی حسینائیں بوم بوم کی صدائیں بلند کرتی نظر آتی ہیں۔ مسافر کون۔م۔راشد کی نظم ''اس پیٹر پہ ہے بوم کا سایہ'' یاد آ گئی۔ گو کہ نظم میں راشد کا اِشارہ اُلّو نما انسانوں کی طرف ہے مگر لگتا ہے یہی بوم مراد ہے کیونکہ تھائی حسینائیں اپنی اداؤں سے لوگوں کو اُلو ہی تو بناتی ہیں۔ یہاں کی راتیں سوتی نہیں بلکہ باٹ اور سونا اُگلتی ہیں شہر میں کوئی ایسا کونا نہیں جہاں مخصوص بے لباسی میں حسینائیں کھڑی نظر نہ آئیں۔۔۔۔۔۔اس جنسی عمل کو یہ خواتین بوم بوم کہتی ہیں۔ یہ لفظ سنتے ہی مسافر کو انڈیا اور پاکستان کا وہ کرکٹ میچ یاد آیا جس میں ہندوستانی کمنٹیٹر روی شاستری نے زیادہ چوکے چھکے لگانے پر شاہد خان آفریدی کو بوم بوم آفریدی کہا تھا۔ روی شاستری اور تھائی حسیناؤں کے ہاتھ کے مخصوص اشاروں کے ساتھ بوم بوم بولنے سے اس لفظ کے معنی اور بھی واضح ہونے لگے۔'' **(ص ۳۹۔۴۰)**

ایک آسٹریلوی بوڑھا اپنی بیوی کی بے وفائی اور بچوں کی بے اعتنائی کا دکھ لیے ہوئے ہے اور ایک تھائی عورت اپنے بچوں کی محبت میں انہیں پڑھانے کے لیے جسم فروشی میں کوئی عار محسوس نہیں کر رہی تھی۔ ایک طرف ''بچوں کی بے اعتنائی'' کا دکھ اور دوسری طرف اپنے ''بچوں سے محبت'' کا جذبہ، دو ''بے جوڑ روحوں کو کیسے تھوڑا سا جوڑ'' دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے اس منظر کو بڑی عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اقتباس دیکھیے۔

''تھائی لینڈ کی ایک مشہور سیر گاہ جو دریا کے ساحل پر واقع ہے میرے لیے دلچسپی کے نت نئے سامان پیدا کرنے کا سبب بنی۔ وہاں میری ملاقات ایک نیم برہنہ بوڑھے آسٹریلوی باشندے سے ہوئی جو ایک تھائی لڑکی سے محض چوما چاٹی میں مصروف تھا۔ دونوں میں عمروں کا تفاوت باپ بیٹی جتنا تھا۔ مسافر نے سوال کیا کہ کیا آپ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں تو دونوں نے نفی میں سر ہلایا۔ آسٹریلوی بوڑھا بولا میری بیوی کئی سال پہلے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہائش پذیر ہے۔ بچے اپنے اپنے گھروں اور کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ مجھے حکومت سے جو ماہانہ گزارہ الاؤنس ملتا ہے اس پر وہاں گزر بسر مشکل

ہے، میں یہاں آ جاتا ہوں۔ بیس دنوں کے لیے ایک لڑکی پندرہ سولہ ہزار باٹ پر بک کرتا ہوں وہ میرے ساتھ جگہ جگہ گھومتی ہے اس کا کھانا پینا میرے ذمے ہوتا ہے۔ اس کے بدلے یہ مجھ سے گپ شپ کرتی ہے خوش رکھتی ہے، مساج کرتی ہے اور بوم بوم بھی۔ اسی سوال کے جواب میں تھائی لڑکی نے کہا ہر رات نئی جاب کی تلاش سے بہتر ہوتا ہے کہ ایک ہی بندے کے ساتھ جاب کی جائے یوں ہمیں بروقت پیسے بھی مل جاتے ہیں۔ جس سے ہمارے گھر کا دانہ پانی بھی آسانی سے نکل آتا ہے اور بچوں کی تعلیم بھی ہو جاتی ہے مجھے حیرت ہوئی جب اس نے کہا میرے دو بچے سکول میں پڑھتے ہیں۔ جب تک وہ پڑھ لکھ نہیں جاتے میں اس پیشے سے وابستہ رہوں گی۔ میں نے سوچا آسٹریلوی بابا کے بچوں کی بے اعتنائی اور تھائی ماں کی بچوں سے محبت نے ان دنوں کو کتنا قریب کر دیا تھا دونوں غرض مند بھی تھے اور ایک دوسرے سے لاتعلق بھی۔ عجیب لاتعلقی کا تعلق نبھائے چلے جا رہے تھے۔ میں نے خاتون سے پوچھا کہ کسی باعزت روزگار کے مقابلے میں تم نے اس جاب کو کیوں اپنایا ہے تو اس نے جواباً کہا اس جاب میں محنت کم اور محنتانہ زیادہ ہے۔ باقی رہی بات باعزت روزگار کی تو مرکزی شاہراہ پر بھیک مانگنے والی ایک خاتون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی I am better than her ساحل پر غیر مرد کے ساتھ نیم برہنہ لیٹی اس خاتون نے پہلی دفعہ مسافر کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ بھیک مانگنا جسم فروشی سے بھی بدتر اور معیوب فعل ہے۔''

(ص ۴۳۔۴۴)

گمان کیا جا سکتا ہے کہ ہمارا قلم صرف دوسروں کے ایسے احوال میں ہی رواں ہوتا ہے۔ لیکن ایسی بات نہیں ہے، ملتے جلتے احوال اپنوں میں بھی کہیں دکھائی دیتے ہیں تو ڈاکٹر الطاف یوسف زئی اس کا ذکر بھی ویسی ہی روانی سے کرتے ہیں جیسی روانی سے تھائی لینڈ کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایک مثال پیش ہے۔

''تھائی لینڈ جانے سے قبل اکثر دوست مشورہ دیتے تھے کہ پینٹ کوٹ سلوا لو تم بین الاقوامی سفر پر جا رہے ہو، لباس بھی بین الاقوامی ہونا چاہیے۔ میں کہتا مجھے پینٹ کوٹ سے بیر نہیں پر طبیعت ادھر نہیں جاتی۔ میں نے اس بات کا ذکر فہد یوسف زئی سے کیا تو کہنے لگے۔ یہاں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں لہٰذا کوئی کسی کو اس نظر سے نہیں دیکھتا کہ کیا پہنا ہے، مجھے مولانا رومؒ کی بات یاد آ گئی کہ میں نے بہت سے انسان دیکھے ہیں جن کے بدن پر لباس نہیں ہوتا اور بہت سے لباس والے دیکھے ہیں جن کے اندر انسان نہیں ہوتا۔'' **(ص ۴۹)**

''لباس پہننے کی ضرورت انسان کو اس لیے ہے کہ جسم کے وہ حصے جو وہ چھپانا چاہتا ہے پردے میں

رہیں مگر ہمارے ساتھ ایک ایسی خاتون بھی تھی جو پابند صلوٰۃ تھی اور پردے کو زینتِ حیات سمجھتی تھی۔ دورانِ ٹریننگ کبھی سر سے دوپٹہ نہیں سرکا۔ بائیں بازو جس سے وہ اور بھی بہت سارے کام لیتی سے اپنی صراحی نما گردن (جس کو دیکھ کر ہمارے کوارڈ نیٹر میر حسن کے رال ٹپکنے لگتے) کو دوپٹے کے پلو پکڑ کر ڈھانپتی تھی مگر شلوار کی بجائے جو جراب نما پاجامہ موصوفہ نے زیبِ تن کیا ہوتا تھا۔اس کی مستور اشیا اور نمایاں ہوتی اور جب بھی وہ پریزنٹیشن کے لیے کھڑی ہوتی تو سائیں عبدالجبار کی نظریں پاجامے سے اُوپر اُٹھتی ہی نہ تھی ہمارے ٹوکنے پر بولے سائیں کیا کروں۔'' **(ص۵۰)**

اوراب اس سفرنامہ کی ''سخن گسترانہ بات'' اس مضمون کے ''مقطع'' میں آپڑی ہے۔آپ تھائی لینڈ کی اقتصادیات سے شروع کریں یا تہذیب وثقافت سے اس سماج کا مطالعہ بالآخر تھائی مساج تک لے آتا ہے اور دنیا کے کسی خطے کے مساج کا ذکر کریں، گفتگو عالمانہ ہو تو اس میں تھائی مساج کا ذکر لازماً آجائے گا اور جب تھائی مساج کا ذکر آئے گا تو تھائی سماج کا ذکر بھی آئے گا۔یوں گویا تھائی سماج اور تھائی مساج ایک دوسرے سے لازم وملزوم کا تعلق رکھتے ہیں۔ڈاکٹر الطاف یوسف زئی نے اس کے تہذیبی وثقافتی سرے گوتم بدھ کے زمانے میں ڈھونڈ نکالے ہیں۔یوں لطافت وکثافت کا انوکھا منظر سامنے آتا ہے۔وہی بات کہ

؎ لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔

ان دو اقتباسات میں جیسے تھائی لینڈ کا پورا ماضی وحال اپنی تہذیبی اونچ نیچ کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔

''بنکاک شہر میں بادشاہ کا محل ہے جو سیکڑوں ایکڑ پر مشتمل ہے۔یہاں بھی بدھا کے مجسّمے اور ان کے سٹوپے کھڑے ہیں جو آبِ زر سے سجائے گئے ہیں۔سٹوپا کے ساتھ ایک اور شخص کا مجسمہ تھا۔میں نے گائیڈ سے پوچھا۔یہ کون ہیں تو اُس نے بتایا کہ یہ بدھا کے ڈاکٹر کا مجسمہ ہے۔جس نے بیماری میں بدھا کا مساج کیا تھا اور وہ تندرست ہو گئے تھے۔میں نے پوچھا یہ جو تھائی لینڈ میں مساج کی شہرت ہے اس کا ربط کہیں بدھا کے اس ڈاکٹر کے طریقۂ علاج سے تو نہیں۔انھوں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا جی بالکل ایسا ہی ہے۔مسافر تھائی لینڈ آنے سے پہلے اس حوالے سے بہت کچھ سن چکا تھا۔آنکھوں دیکھا حال بھی کچھ اس سے مختلف نہیں۔شہر میں بے تحاشا مساج سنٹرز ہیں۔یہاں تک کہ ایئرپورٹ کے اندر بھی یہ سنٹر قائم ہیں۔جہاں تھائی دوشیزائیں گاہکوں کا بُلا بُلا کر مساج کرتی ہیں۔دوسرے ممالک سے آئے سیاح شاید ہی تھائی لینڈ کی کسی اور چیز سے اس قدر لطف اندوز ہوتے ہوں جتنا مساج سے۔مختلف سنٹرز میں

خاندانوں کے خاندان باپ، بیٹی، ماں، بیٹا الگ الگ چارپائیوں پر ایک ہی ہال میں لیٹے تھائی دوشیزاؤں سے باجماعت مساج کروا رہے ہوتے ہیں۔'' **(ص۷۳)**

''تھائی لینڈ میں کئی طریقے مستعمل ہیں جن میں پانچ طریقے زیادہ مشہور ہیں ایک کو آئل مساج کہتے ہیں جس میں جسم پر تیل مَل کر خاص انداز میں مالش کی جاتی ہے۔دوسرا طریقہ ایرو ما مساج کا ہے جس میں جسم پر مخصوص ارومادار خوشبو کا عطر مَلا جاتا ہے۔شبِ زفاف یا حبیبوں کی ملاقات سے پہلے یہ مساج کرایا جاتا ہے۔تھائی مساج کا بھی ایک مخصوص طریقہ ہوتا ہے۔جس کے بارے میں ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ یہ مساج جس طریقے سے ہم تھائی کرتے ہیں دوسروں کو نہیں آتا۔اسی طرح فش مساج بھی کروایا جاتا ہے جس میں پانی کے ٹب میں آدمی کو لیٹا کر یا اس کے جسم کا کوئی حصہ ٹب میں رکھ کر اس پر ایک خاص قسم کی کریم مَلی جاتی ہے پھر اُسی پانی میں سیکڑوں ہزاروں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں چھوڑی جاتی ہیں وہ مچھلیاں جسم پر لگی اس کریم کو چاٹتی رہتی ہیں۔اس سے جسم کا خود بخود مساج ہو جاتا ہے۔فٹ مساج بھی یہاں کا مشہور مساج ہے۔اس مساج میں باقی جسم کے بجائے صرف پاؤں کا مساج کیا جاتا ہے۔یہ مساج کرنے والے دعویٰ کرتے ہیں کہ دورانِ مساج اگر نیند نہ آجائے تو پیسے واپس۔مساج کی اور ایک مشہور قسم Body to Body مساج ہے۔اس مساج میں دوشیزائیں اپنے بدن پر تیل یا ایرو ما عطر مَل کر گاہک کے بدن میں اپنا بدن اس طرح پیوست کرتی ہیں جس سے وہ تیل یا عطر گاہک کے بدن میں جذب ہوتا چلا جاتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کو راحت اور سکون بھی مہیا ہوتا ہے۔میرا خیال تھا کہ من چلے شوقین جوان ہی اس مساج سے لطف حاصل کرتے ہوں گے مگر میں نے بہت سے ایسے بوڑھے بوڑھیاں بھی دیکھے جو اپنے لرزہ براندام جسموں کو ان حسیناؤں کے جسم سے مَس کر کے اپنے جسم میں بجلی پیدا کرنے کی سعی لاحاصل کر رہے ہوتے ہیں۔'' **(ص۷۴۔۷۵)**

ڈاکٹر الطاف یوسف زئی کے اس دلچسپ اقتباس پر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔مجھے امید ہے کہ ''تھائی لینڈ کے رنگ'' کو نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔ادبی طور بھی اور عوامی سطح پر بھی اس سفر نامہ کی پذیرائی ہوگی۔انشاءاللہ۔

نسیم انجم کے دو ناول

''کائنات'' اور ''آہٹ''

نسیم انجم کی نئی کتاب ''دو ناول'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔اس میں ان کا سب سے پہلا ناول ''کائنات'' اور بعد کا لکھا ہوا ایک اور ناول ''آہٹ'' دو ناول شامل ہیں۔کتاب میں شامل پہلا ناول ''کائنات'' ہے۔چونکہ یہ نسیم انجم کا پہلا ناول تھا اس لیے عمر کے حساب سے بھی اور کچھ کرداروں کے حساب سے بھی اس میں جذباتیت راہ پا گئی ہے۔اس میں بیلا اور سحر دو لڑکیاں مرکزی کردار ہیں۔کہانی کے باقی سارے کردار انہیں کے گرد گھومتے ہیں۔دونوں لڑکیوں کی الگ الگ دکھ بھری کہانیاں ہیں۔ زندگی کے متعدد نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے ،بالآخر معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں سہیلیوں کا باپ ایک ہی ہے، گویا دونوں صرف سہیلیاں ہی نہیں بہنیں بھی ہیں۔بیلا کی موت کے المیہ پر یہ ناول اختتام پذیر ہوتا ہے۔محبت اور اس کے دکھ کی کیفیات کے بیان میں دونوں لڑکیوں کا اظہار کچی عمروں والا جذباتی قسم کا رہتا ہے۔ایک عمر اور تجربے کے بعد بھی اس جذباتیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ہوسکتا ہے یہ جذباتی کیفیت زندگی کے دکھوں کے طویل تجربے کی زائیدہ ہو۔تاہم بعض مقامات پر یہ جذباتی آنسو اتنے زیادہ ہو جاتے ہیں کہ لگتا ہے اچھی بھلی گندھی ہوئی کہانی میں ضرورت سے زیادہ پانی ڈال دیا گیا ہے۔ان اقتباسات سے جذباتی کیفیات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

''میک اپ کی گلابی تہہ نے اس کے چہرے پر نکھار اور جاذبیت پیدا کر دی تھی۔دل کی نازک کلیاں پھول بننے کے لئے ہولے ہولے اپنے لب کھول رہی تھیں۔حیا نے اس کے عارضِ سیمیں پر سرخی کی چھاپ کو مستقل کر دیا تھا۔شرم کے بوجھ سے اس کی گھنیری پلکیں جھکی جارہی تھیں۔سپنوں کے خوش رنگ پھول اس کی اطراف میں رقص کر رہے تھے۔تمناؤں کی خوابیدہ کلیاں جاگ اٹھی تھیں۔''

(کائنات)

''وہ ہنستی ہوئی ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔سونی آنکھوں میں اب پریم کے سپنوں کا ڈیرہ تھا۔ بدن کے ظلمت کدہ میں اب روشنی کی جھلمل کرنیں تھیں۔دھنک کے رنگوں کو چھونے کے لئے وہ آکاش کی سمت ہولے ہولے پرواز کر رہی تھی۔چاہنے والے کی چاہت پا کر مسرتوں کا پیکر بن گئی تھی۔ماتم زدہ چہرے پر باہر اور تازگی آ گئی تھی۔ملگجے لباس نے اب اجلے اور صاف ستھرے کپڑوں کی جگہ لے لی تھی۔

دل کی خوشیاں اس کے چہرے پر رقصاں تھیں۔'' **(کائنات)**

وہ سفید پاجامے، براؤن رنگ کی شیروانی اور سلیم شاہی جوتے میں کسی شہزادے سے کم نہیں لگ رہا تھا۔وہ دھیرے دھیرے چلتا اس کے پاس آ گیا۔

ہم سفر کو ہم سفر کا آداب۔

آداب۔اس نے حنائی ہاتھوں کو ماتھے پر لے جا کر جواباً کہا۔

نیناں۔۔۔آپ تصویر سے کہیں زیادہ حسین ہیں۔

شکریہ۔وہ آہستہ سے گویا ہوئی۔ **(آہٹ)**

اس ناول کے کردار اپنے اپنے دکھوں کے ساتھ مربوط طور پر سامنے آتے ہیں۔ناول میں جب کہانی ایک نئے موڑ پر آجاتی ہے وہاں قاری کی دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔عورت کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ مثبت اور مثالی مردانہ کردار بھی موجود ہیں۔یاسر فرشتہ صفت ہے لیکن اس کا یہ کردار بہت مختصر ہے۔

''آہٹ'' کی کہانی ۲۰۰۵ء کے ہولناک زلزلہ کے آس پاس کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے۔نیناں اور یاسر کی محبت کی کہانی ہے۔اس کا ہیرو یاسر بہت محبت کرنے والا اور انسانیت پر یقین رکھنے والا انسان ہے۔''آہٹ'' بھی دکھوں سے بھری ہوئی کہانی ہے۔دکھوں کے ایک طویل دور سے گزرنے کے بعد نیناں کی یاسر سے شادی ہوتی ہے تو اس کی زندگی میں بہار آجاتی ہے لیکن پھر یاسر کشمیر میں تھا جب ۲۰۰۵ء کا زلزلہ آتا ہے۔بے شمار لاوارث لاشیں دفنا دی جاتی ہیں۔یاسر کا کچھ پتہ نہیں چلتا اور نیناں کی زندگی میں پھر دکھ شروع ہو جاتے ہیں۔کہانی کے آخر میں طویل عرصہ کے بعد یاسر بیساکھیوں کے ساتھ اچانک نیناں کی زندگی میں پہنچ جاتا ہے اور پھر وہ دونوں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگتے ہیں۔

ہر تخلیق کار اپنی فکری ساخت کے مطابق اپنے افکار و خیالات کو تخلیقی انداز میں اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔ایسے خیالات سے اختلاف کے باوجود ان تخلیقات کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔تاہم جب اپنے خیالات کو تبلیغی انداز میں بیان کیا جانے لگے تو ان خیالات سے اتفاق کرنے کے باوجود اس تخلیق کی تخلیقیت متاثر ہو جاتی ہے۔کہیں کہیں ایسے لگتا ہے کہ نسیم انجم ان ناولوں میں تبلیغی انداز کی طرف جانے لگی ہیں۔

''آہٹ'' مختصر ناول ہے۔شاید اسے ناولٹ بھی کہا جا سکتا ہے، بلکہ اس پڑھتے ہوئے مجھے افسانہ نگار رام لال یاد آئے۔ان کے بعض طویل افسانے اس ناول کے سائز کے رہے ہیں۔

دونوں ناول کچی عمر کی لڑکیوں کے جذباتی خیالات سے لبریز معاشرتی طرز کے ناول ہیں۔ان پر اگر کوئی ڈرامہ سیریل بنائی جائے تو خاصی مقبول ہو سکتی ہے۔تاہم ادبی طور پر یہ دونوں ناول نسیم انجم کے اپنے ناول نرک معیار تک نہیں پہنچ سکے،اس کے باوجود انہیں بڑی عوامی سطح پر اور خصوصا خواتین میں بھرپور پذیرائی مل سکتی ہے۔

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۲۶۔مئی ۲۰۱۷ء

ایک وضاحت

ایک انٹرنیٹ میگزین کے حوالے سے

لندن سے شائع ہونے والے ایک انٹرنیٹ میگزین میں میرے نام کے ساتھ پتہ نہیں کس کے تین اشعار شائع کیے گئے تھے۔میں نے فوری طور پر میگزین کے مدیر کو وضاحت نامہ بھیجا۔مدیر نے معذرت کی،میرے نام سے کسی اور کے اشعار بھیجنے والے کا کھوج لگانے کا وعدہ کیا۔لیکن پھر نہ اس کا کچھ بتایا اور نہ ہی اس سلسلہ میں کوئی آن لائن وضاحت یا معذرت کی۔اس نوعیت کی کسی شرارت کا ہمیشہ پتہ نہیں چل سکتا۔اس لیے مذکورہ مدیر کے ساتھ اپنی برقی مراسلت کو ریکارڈ پر لا رہا ہوں تا کہ آئندہ بھی کسی طرف سے کوئی ملتی جلتی شرارت کی جائے تو میری طرف سے دوٹوک وضاحت موجود رہے۔میری ہر تحریر میرے اپنے تعمیر کیے ہوئے بلاگس پر محفوظ ہے۔اس کے علاوہ اضافی نوعیت کا جو کچھ بھی ہوگا وہ دانستہ یا نادانستہ کسی شرارت ہی کا نتیجہ ہوگا۔**(ح۔ق)**

میری طرف سے بھیجی گئی وضاحتی ای میل

محترمی مدیر صاحب قندیلِ ادب

سلام مسنون

آپ کی مہربانی سے قندیلِ ادب ای میل کے ذریعے ملتا رہتا ہے۔ابھی مئی ۲۰۱۵ء کا شمارہ ملا ہے تو فہرست میں اپنا نام دیکھ کر حیرانی ہوئی۔پھر میری تصویر کے ساتھ غزل کے نام سے جو تین شعر دیئے گئے ہیں،انہیں دیکھ کر مزید حیرانی ہوئی۔یہ تین اشعار میرے نہیں ہیں۔صرف اشعار ہی نہیں یہ ڈکشن بھی میرا نہیں ہے۔اپنا ریکارڈ دیکھ کر چیک کریں کہ کس دوست نے میرے نام سے یہ اشعار شائع کرائے ہیں۔سہواً ایسا ہوا ہے یا کسی ''کرم فرما'' نے جان بوجھ کر یہ کام کیا ہے۔بہر حال میں ان اشعار سے اپنی بریّت کا اظہار کرتا ہوں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔والسلام

آپ کا مخلص **حیدر قریشی**۔۔۔۔۔۲۹/اپریل ۲۰۱۴ء

مدیر صاحب قندیلِ ادب کی معذرت کی ای میل

On Thursday, April 30, 2015 9:23 AM, Rana Razzaq <ranarazzaq1952@gmail.com> wrote:

sorry, It is mistake.I will care in future

and let me trace who refer me these ashar.thankyou. sorry again.

میری طرف سے بھیجی گئی ایک اور ای میل

To Rana Razzaq

On Thursday, April 30, 2015at 10:36 AM

اگر میرے نام سے بھیجنے والے کرم فرما کا پتہ چل جائے تو مجھے بھی اُن کے اسمِ گرامی سے آگاہ کر دیجئے گا،شکریہ۔ **حیدر قریشی**

جون کے شمارہ میں بھی جب کوئی وضاحت شائع نہیں ہوئی تو پھر یہ میل بھیجی گئی

محترمی مدیر صاحب قندیلِ ادب سلام مسنون

آپ کے رسالہ کے مئی کے شمارہ میں میرے نام سے جو اشعار شائع کیے گئے تھے،اس حوالے سے میں نے آپ کو وضاحت نامہ بھیجا تھا۔آپ نے اس پر معذرت کی تھی اور لکھا تھا کہ میں تلاش کرتا ہوں کہ کس نے یہ اشعار بھیجے تھے۔توقع تھی کہ آپ جون ۲۰۱۵ء کے شمارہ میں کم از کم میری وضاحت شائع کر دیں گے۔لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔پہلے میرا حسنِ ظن تھا کہ ایسا سہواً ہوا ہو گا،لیکن نہ میری طرف سے کوئی وضاحت،نہ آپ کی طرف سے کوئی وضاحت دیکھ کر اب میں سوچنے لگا ہوں کہ کہیں یہ سارا کچھ جان بوجھ کر اور شرارتاً تو نہیں کیا گیا تھا؟اب میں اپنی وضاحت از خود ریلیز کرنے کا حق رکھتا ہوں۔

آپ سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ آئندہ سے میری کوئی تحریر اپنے رسالہ میں مت شائع کریں۔گزشتہ ماہ آپ کی معذرت خواہانہ میل پڑھ کر میں نے قلمی تعاون کیا تھا۔اب جو چیز رہ گئی ہے اسے بھی ڈراپ کر دیں،آپ کا شکریہ اور خدا حافظ۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی۔۔۔۔۴ جون ۲۰۱۵ء

---

۴ جون کو ہی اس ای میل کے جواب میں مدیر قندیل کی طرف سے پھر مختصر سی معذرت لیکن آن لائن معذرت اور وضاحت سے مسلسل گریز

i am sorry, i forget to publish explanation thanks razzaq.

اب جولائی اور اگست ۲۰۱۵ء کے شمارے بھی شائع ہو چکے ہیں اور ان شماروں میں بھی مدیر قندیلِ ادب کی جانب سے کوئی وضاحت یا معذرت شائع نہیں کی گئی۔سو مناسب لگا کہ اس معاملہ میں یہ متعلقہ خط و کتابت شائع کر دوں تا کہ یہ سب کچھ ریکارڈ پر رہے اور اس سلسلہ میں کبھی بھی کوئی ابہام نہ رہے۔

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۲۱۔ستمبر ۲۰۱۵ء

وزیر آغا کی نظم نگاری

(پی ایچ ڈی کا مقالہ)

''وزیر آغا کی نظم نگاری'' ڈاکٹر محسن عباس کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے جسے کتابی صورت میں شائع کیا گیا ہے۔اس سے پہلے انڈو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں میں وزیر آغا کے فن کی مختلف جہات کے حوالے سے متعدد تحقیقی مقالات لکھے جا چکے ہیں۔میری معلومات کے مطابق وزیر آغا پر پی ایچ ڈی کے تین مقالات جبکہ ایم اے اور ایم فل کے سات مقالات لکھے جا چکے ہیں۔اب پی ایچ ڈی کا چوتھا مقالہ ''وزیر آغا کی نظم نگاری'' سامنے آیا ہے۔اس کی ایک اہمیت یہ ہے کہ پاکستان سے وزیر آغا پر پی ایچ ڈی کا پہلا مقالہ ہے۔یہ مقالہ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔کتابیات اور ضمیمہ الگ سے ہیں۔

پہلا باب ''جدید اردو نظم کا تناظراتی مطالعہ'' تین فصلوں پر مشتمل ہے۔اول: جدید اردو نظم۔بنیادی مباحث۔

دوم: جدید اردو نظم کا آغاز وارتقا۔سوم: معاصر نظم کا تناظر اور وزیر آغا۔آخر میں حوالہ جات وحواشی درج ہیں۔

دوسرا باب ''وزیر آغا کی نظموں کا فکری مطالعہ'' بھی تین فصلوں پر مشتمل ہے۔اول: وزیر آغا کی نظموں کا ارضی تناظر۔دوم: وزیر آغا کی نظموں کا ماورائی تناظر۔سوم: وزیر آغا کی نظموں کا امتزاجی تناظر۔آخر میں حوالہ جات وحواشی درج ہیں۔

تیسرا باب ''وزیر آغا کی طویل نظموں کا مطالعہ'' پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔اس حصہ میں وزیر آغا کی پانچ طویل نظموں کا الگ الگ فصل میں تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔یہ پانچ نظمیں اس ترتیب سے فصل وار پیش کی گئی ہیں۔۱۔''آدھی صدی کے بعد''۔۲۔''ٹرمینس''۔۳۔''الاؤ''۔۴۔''اندر کے رونے کی آواز''۔۵۔''اک کتھا انوکھی''۔آخر میں حوالہ جات وحواشی درج ہیں۔

چوتھا باب ''وزیر آغا کی نظموں کا فنی مطالعہ'' چار فصلوں پر مشتمل ہے۔اول: وزیر آغا کی نظموں کا ہیئتی

جائزہ۔دوم: وزیر آغا کی نظموں میں شاعرانہ امیجری۔سوم: وزیر آغا کی نظموں کا علامتی نظام۔چہارم: وزیر آغا کے اسلوب کے نمایاں خصائص۔اور آخر میں حوالہ جات وحواشی درج ہیں۔

پانچواں باب ''وزیر آغا کی نظموں کا اسلوبیاتی مطالعہ'' بھی چار فصلوں پر مشتمل ہے۔اول: وزیر آغا کی نظموں کا صوتیاتی نظام۔دوم: وزیر آغا کی نظموں کا لفظیاتی نظام۔سوم: وزیر آغا کی نظموں کا صرفیاتی و نحویاتی نظام۔چہارم: وزیر آغا کی نظموں کا معنیاتی نظام۔اور آخر میں حسبِ معمول حوالہ جات وحواشی درج ہیں۔

آخری باب ''مجموعی جائزہ، استخراج نتائج'' کے دو حصے ہیں۔۱۔مجموعی جائزہ۔۲۔استخراج نتائج

اس مقالہ کی کتابی صورت کا حرفِ آغاز ڈاکٹر انور سدید کا تحریر کردہ ہے۔انہوں نے ڈاکٹر محسن عباس کے مقالہ کے ایک اقتباس سے ان کے مطالعاتی انداز کی تحسین کی ہے۔بقول ڈاکٹر محسن عباس:

''وزیر آغا نے اپنی نظموں کے ذریعے اِس کے دامن میں تازہ پھول ڈالنے اور اس کو موضوعاتی، ہیئتی، فنی، اسلوبی اور اسلوبیاتی اور داخلی اعتبار سے وسیع تر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔۔۔اور وہ اپنے تمام معاصر نظم نگاروں میں نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔''

آخری فیصلہ کن جملہ کی اہمیت اجاگر کرنے کے بعد ڈاکٹر انور سدید آخر میں لکھتے ہیں۔

''ڈاکٹر محسن عباس نے اپنے اول الذکر فیصلہ کن جملے کو اپنے کمالِ تنقید سے پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے۔بلاشبہ یہ کتاب غیر رسمی اور غیر روایتی تنقید کی ایک عمدہ مثال ہے اور وزیر آغا کی شاعری کی نئی جہات سے آشنا کر رہی ہے۔مجھے ڈاکٹر محسن عباس کے ادبی پیکر میں اردو تنقید کا قطبی ستارہ بننے کی پوری صلاحیت نظر آتی ہے۔میں ان کا خیر مقدم کرتا ہوں۔''

ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے اپنے دیباچہ میں اس مقالہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

''وزیر آغا کی نظم، جدید نظم کی اس روایت میں منفرد اور رجحان ساز ہے، جس کے علمبردار میراجی اور مجید امجد ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ میراجی، مجید امجد اور وزیر آغا جدید اردو نظم کے اس دھارے کے تین ممتاز شعرا ہیں جو دھرتی، فطرت اور ثقافت کے نو بہ نو مظاہر سے مرتب ہوا ہے۔''

ڈاکٹر رشید امجد اس تحقیقی مقالہ کے سلسلہ میں ڈاکٹر محسن عباس کے نگران تھے، کتاب کے پس ورق پر درج ان کی رائے کے مطابق:

''ان کا اسلوب وزیر آغا کے تنقیدی اسلوب کی طرح تخلیقی ذائقہ رکھتا ہے۔انھوں نے وزیر آغا کے

تخلیقی مزاج کو سمجھ کر اور اس کی تخلیقی سطح سے روشناس ہو کر یہ مقالہ لکھا ہے۔ رواں دواں اسلوب کے ساتھ ساتھ تنقیدی و تحقیقی معیار اس کتاب کی وہ انفرادی خوبی ہے جس کی وجہ سے یہ نہ صرف وزیر آغا کے حوالے سے ایک اہم کام شمار ہوگی بلکہ اردو تنقید و تحقیق میں بھی اپنی انفرادیت قائم کرے گی''

یونیورسٹیوں میں ادیبوں کے فن و شخصیت کے حوالے سے لکھے جانے والے مقالات کا کتابی صورت میں شائع کیا جانا مستحسن عمل ہے۔ اس سے معیاری مقالات سامنے آسکیں گے اور غیر معیاری مقالات لکھنے والوں اور لکھوانے والوں کی حوصلہ شکنی بھی ہوگی۔ سو یونیورسٹی مقالات کی ایسی اشاعت کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے کیونکہ اس سے یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق اور اردو ادب دونوں کے معیار کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۱۔ ستمبر ۲۰۱۵ء

سرگودھا میں وزیر آغا شناسی

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم سرگودھا میں ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے ایک جانا پہچانا نام ہیں۔ کتاب کے نام کے مطابق سرگودھا کی علمی و ادبی شخصیات اور ایک عرصہ تک سرگودھا میں رہ کر یہاں سے چلے جانے والے ادباء نے وزیر آغا کے فن کی تفہیم کے حوالے سے جو مضامین لکھے تھے، ان میں سے جو آسانی سے دستیاب ہو سکے ہیں انہیں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ خود ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے تیرہ مضامین شامل ہیں۔ دوسرے مضمون نگاروں میں ڈاکٹر محمد اکرم چودھری، پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، طلعت شہزاد، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر سہیل بخاری، پروفیسر سجاد نقوی، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، راغب شکیب، انجم نیازی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر محمود اسیر، طارق حبیب، پروفیسر یوسف خالد، شاکر نظامی، محمد ادریس مرزا، پروفیسر ریاض احمد شاد، ذوالفقار احسن، اخلاق عاطف، سکندر حیات میکن، ڈاکٹر محمد یار گوندل، صفدر رضا صفی، ڈاکٹر شفیق آصف، نجمہ منصور، ارشد ملک، عابد خورشید، شاکر کنڈان، ممتاز عارف، عبدالعزیز ملک، خالد اقبال، طلعت شہزاد بابر، محمد کامران شہزاد رانجھا، منزہ انور گوئندی، متین اعوان، سید مرتضیٰ حسن، تنویر الرحمٰن، پروفیسر خرم ٹوانہ، تبسم نواز وڑائچ، پروفیسر ارشد جبار پراچہ، خالد محمود خالد، ملک محمد آصف، پروفیسر فریال شاہد، شامل ہیں۔ منظوم خراجِ عقیدت پیش کرنے والوں میں علامہ رشک ترابی، پروفیسر عبدالقیوم رانا، تبسم نواز وڑائچ، صاحبزادہ شمشاد حسین شاہد، ثمینہ گل، مومن ہاشمی، نسیم اقبال بھٹی شامل ہیں۔ نظم و نثر میں لکھنے والے ناموں کی اس جھلک سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وزیر آغا شناسی کا جو کام سرگودھا کی مقامیت میں گندھا ہوا ہے، درحقیقت اپنی مقامیت کی جڑوں سے بین الاقوامی سطح تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ بین الاقوامیت ان عالمی شاعروں اور ادیبوں سے بالکل مختلف ہے جو محض بیرون ملک مقیم ہونے کی بنیاد پر خود کو ''عالمی ادبی شخصیت'' سمجھ بیٹھتے ہیں۔ میں پہلے ہی سے ایسے ''عالمی ادیبوں'' کے ادب کے بارے میں یہ بات لکھ چکا ہوں کہ ان کے مقابلہ میں ''شاہ عالمی'' کا ادب کہیں زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

اس کتاب میں شامل مختلف مضامین سے جہاں وزیر آغا کے فن اور ان کی شخصیت کے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں وہیں سرگودھا کا علاقائی تعارف بھی ہوتا چلا جاتا ہے۔ اپنے بعض مضامین کے باعث اس کتاب کو دستاویزی اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ سرگودھا یونیورسٹی میں وزیر آغا چیئر کا قیام، ریلوے روڈ سرگودھا کا نام وزیر آغا روڈ رکھنے کا سرکاری اعلان، انڈو پاک میں وزیر آغا پر ایم اے، ایم فل اور پی ایچ ڈی سطح کے مقالات کا لکھا جانا، حکومت پاکستان کی جانب سے ''تمغۂ امتیاز'' اور ''ستارۂ امتیاز'' کے ذریعے وزیر آغا کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جانا، سویڈش رائٹرز یونین کی دعوت پر ڈاکٹر وزیر آغا کا دو ہفتوں کے لیے سویڈن جانا اور وہاں ان کی بھرپور پذیرائی ہونا، اس نوعیت کی تفصیل کے ساتھ سرگودھا کے ادبی حلقوں کی تقریبات کا ریکارڈ تک اس کتاب میں یک جا کر دیا گیا ہے۔ مقامی تقریبات کا ریکارڈ ۷ مئی ۱۹۷۱ء سے شروع ہو کر ۲۱ اپریل ۲۰۰۵ء تک ۳۵ برسوں پر محیط ہے۔

مجھے اب سن پوری طرح یاد نہیں ہے لیکن ۱۹۸۶ء سے پہلے کے برسوں میں سے کوئی برس تھا۔ اکبر حمیدی کے انشائیوں کے مجموعہ کی تقریب رونمائی سرگودھا میں ہوئی تھی۔ وزیر آغا کی صدارت میں ہونے والی اس تقریب میں سرگودھا سے غلام جیلانی اصغر، جمیل یوسف، سجاد نقوی، انجم نیازی، پرویز بزمی، ایم ڈی شاد، لطیف قریشی، اور دیگر کئی ادباء شریک ہوئے تھے۔ راولپنڈی سے رشید امجد، رشید قیصرانی، جمیل آذر تشریف لائے تھے، رحیم یار خاں سے فرحت نواز آئی تھیں جبکہ خانپور سے مجھے بھی حاضر ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ خاصی عمدہ تقریب ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ہارون الرشید کے مضمون میں اس کا حوالہ نہیں ملتا جو بہر حال سہو ہے، سہو بلا ارادہ ہے یا بالارادہ، یہ خدا بہتر جانتا ہے، یا خود ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب۔

وزیر آغا کو نوبیل انعام کے لیے نامزد کیا جانا، میرے ذہن میں ایسا ہے کہ یہ تین بار ہوا تھا، تاہم اس کتاب میں ہارون الرشید تبسم نے لکھا ہے کہ وزیر آغا کو دو بار نامزد کیا گیا تھا۔ مجھے لگتا ہے کہ اس معاملہ میں مجھے تین بار کا سہو ہوا ہے، غالباً تبسم صاحب کی دو بار والی بات درست ہے۔ تاہم اس سلسلہ میں پوری تحقیق کر لی جائے تو بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔ مجموعی طور پر یہ کتاب اپنے مقامی تناظر کے باوجود وزیر آغا شناسی کے سلسلہ کی ایک اہم کتاب ہے جس سے قومی اور بین الاقوامی سطح تک استفادہ کیا جا سکے گا۔

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۱۔ ستمبر ۲۰۱۵ء

تسلیم الٰہی زلفی کی فیض شناسی یا خود نمائی؟

نئے عہد کے اہم شاعروں اور ادیبوں کے یومِ پیدائش کے سو سال پورے ہونے پر ان کا صد سالہ جشن منانا ایک اچھی روایت کا آغاز ہے۔ اس سلسلہ میں گزشتہ چند برسوں میں فیض احمد فیض، سعادت حسن منٹو، سجاد ظہیر، میرا جی اور ن م راشد کی صد سالہ تقریبات منائی گئیں۔ فیض اور منٹو کی تقریبات مقبولیت کے لحاظ سے زیادہ شاندار رہیں۔ ان تقریبات کے حوالے سے جہاں بہت کچھ مثبت ہوا ہے وہیں بعض منفی رویے بھی دیکھنے میں آئے ہیں۔ جب کسی شاعر/ادیب کی صد سالہ تقریبات کو سرکاری سرپرستی میسر آجاتی ہے تو لکھنے والے موقعہ کی مناسبت سے دھڑا دھڑ کتابیں لکھنا اور شائع کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس میں (وقتی) شہرت اور منفعت دونوں میسر آجاتے ہیں۔ میں نے فیض صدی کی مناسبت سے اپنے مارچ ۲۰۱۲ء کے لکھے ہوئے ایک مضمون میں ایک منفی پہلو کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا تھا:

''فیض صدی کی مناسبت سے بیشتر ایسے لوگوں نے بھی کتابیں لکھ ڈالیں، جن کے پیشِ نظر فیض صاحب پر کوئی سنجیدہ اور بامقصد کام کرنا نہیں تھا، بلکہ فیض صاحب جیسی فیض رساں شخصیت کی صدی کو اپنی ذاتی شہرت کے لئے بیساکھی کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ چنانچہ ایسے لوگ پورا سال اپنی کتابیں سر پر اٹھائے ہوئے اس طرح خود ہی ان کی تقریبات کراتے رہے کہ لگتا تھا انہوں نے فیض صاحب پر نہیں لکھا بلکہ فیض صاحب نے ان پر کتاب لکھ دی ہے۔ اس قسم کے بعض منفی رویوں کے باوجود مجموعی طور پر فیض صاحب کی ترقی پسند شخصیت کی عظمت کا خلوصِ دل کے ساتھ نہ صرف اعتراف کیا گیا بلکہ اسے مناسب خراجِ تحسین بھی پیش کیا گیا۔''

(فیض صدی کی ایک جھلک۔ بحوالہ ہمارا ادبی منظر نامہ۔ صفحہ نمبر ۳۸۸)

پھر اشفاق حسین کی کتاب ''شیشوں کا مسیحا فیض'' پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

'' **اشفاق حسین** کینیڈا کے متحرک و فعال شاعروں اور ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ فیض احمد فیض

سے ان کی محبت اور عقیدت کو ایک دنیا جانتی ہے۔ ۱۹۷۴ء میں اشفاق حسین کے ایم اے اردو کے مقالہ کا موضوع تھا ''فیض ایک جائزہ''۔ تب سے علمی و ادبی محبت کا جو سلسلہ چلا تھا وہ آج تک قائم ہے۔ اس دوران انہوں نے فیض کے حوالے سے مزید کام بھی کیا۔ اور فیض صدی تک آتے آتے انہیں موقعہ مل گیا کہ ایک طرف اپنے سارے پرانے لکھے ہوئے کو یکجا کریں، دوسری طرف پرانی یادوں اور باتوں کے ذریعے فیض صاحب پر کچھ نیا بھی لکھا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی نئی پرانی پانچ کتابوں کو ایک جلد میں جمع کر کے اس کا نام رکھا ''شیشوں کا مسیحا فیض'' اور یوں فیض صاحب کی صدی منالی۔ 1207 صفحات پر مشتمل یہ علمی و ادبی محبت نامہ ان پانچ کتابوں پر مشتمل ہے۔

فیض شخصیت اور فن،
فیض حبیب عنبر دست،
فیض کے مغربی حوالے،
فیض ایک جائزہ،
فیض تنقید کی میزان پر۔

کتاب ''فیض کے مغربی حوالے'' پہلی بار جنگ والوں نے شائع کی تھی اور یہ ایک ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ یہاں اس کی تلخیص کر کے اس کو صرف 360 صفحات میں سمیٹا گیا ہے۔ اس کے باوجود کتاب مجموعی طور پر 1207 صفحات پر محیط ہوگئی ہے۔ اس کتاب کے دو اثرات تو مجھے بالکل سامنے دکھائی دے رہے ہیں۔ اشفاق حسین اور فیض صاحب کے تعلق کو دیکھتے ہوئے **بعض لوگوں نے فیض صاحب کے ساتھ اپنے رابطہ کی کوئی ایک آدھ کڑی لے کر اس پر اپنے تعلقات کی پوری عمارت کھڑی کر دی۔ جس مقامِ ملاقات پر فیض صاحب جس کاز کو تقویت پہنچانے گئے تھے، وہ کیا تھا اور اس حوالے سے ان کی کارکردگی کیا تھی؟ اس بارے میں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ بس مصنف موصوف سے فیض صاحب کی تعلق داری ہی کتاب کا حاصل نکلتا ہے۔**۔۔۔۔۔۔ مجموعی طور پر ''شیشوں کا مسیحا فیض'' اشفاق حسین کی فیض کے لیے محبت کی ادبی روداد ہے۔ ایسی محبت جو کسی وقتی ضرورت کا نتیجہ نہیں بلکہ جو چالیس برسوں کے ادبی تعلق پر محیط ہے۔'' **(ادبی محبت کا قرض۔ بحوالہ ہمارا ادبی منظر نامہ۔ صفحہ نمبر ۶۲۰۔۶۱۹)**

میرے ان دونوں اقتباسات سے ظاہر ہے کہ میں نے جہاں فیض صدی میں ہونے والے کام کے مثبت پہلوؤں کی تحسین کی وہیں منفی پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی۔ اگرچہ میں نے کسی منفی کردار کا نام

نہیں لیا لیکن منفی طریقۂ واردات کی نشان دہی اس طرح کی ہے کہ منفی کردار خود بخود سامنے آجاتے ہیں۔ ان اقتباسات میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کا نام لیے بغیر ان کے منفی طرزِ عمل کا واضح اشارا دیکھا جا سکتا ہے۔ میرا مقصد بھی اتنا تھا کہ کسی کی ذات کو براہِ راست ہدف بنانے کی بجائے منفی رویوں کی نشان دہی کرنا بہتر ہے۔

چونکہ یہ بات اشفاق حسین کے فیض شناسی کے سلسلہ میں کیے جانے والے کام کے تناظر میں ہوئی تھی، اس لیے عجیب اتفاق ہے کہ بعد میں اشفاق حسین ہی کو توفیق ملی کہ تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی کتاب ''فیض احمد فیض: بیروت میں'' کا مکمل طور پر محاسبہ و محاکمہ کر سکیں۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تسلیم الٰہی زلفی نے فیض شناسی کی آڑ لے کر صرف خود نمائی کا ایسا سفر کیا ہے جو خود فریبی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

جب اشفاق حسین کی کتاب ''فیض بیروت میں: حقیقت یا فسانہ؟'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو ضروری لگا کہ ادبی دنیا کے جن احباب تک میری رسائی ہے ان سب کو اس کتاب سے متعارف کرایا جائے۔ اس کتاب کے صفحہ نمبر ۱۷۔۱۸ پر ایک تصویر کے سلسلہ میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی جعل سازی کو ظاہر کرنے کے لیے غالبؔ کا ایک شعر درج کیا گیا ہے۔

شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

عجیب اتفاق ہے کہ جب اشفاق حسین کی کتاب سامنے آئی اور تسلیم الٰہی زلفی کی غلط بیانیاں ظاہر ہوگئیں تو عین انہی دنوں میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی ایک غزل شائع ہوئی۔ چنانچہ میں نے ان کی اس غزل کے ایک شعر کو بھی اپنی خبر کا حصہ بنا لیا۔ میری طرف سے جاری کی گئی خبر کا متن یہ تھا جو ۲۷ نومبر ۲۰۱۵ء کو ریلیز کیا گیا:

فیض احمد فیض بیروت میں: حقیقت یا فسانہ؟

۲۰ نومبر ۲۰۱۵ء کو ارشد خالد صاحب مدیر عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد نے اشفاق حسین صاحب کی کتاب ''فیض احمد فیض بیروت میں: حقیقت یا فسانہ؟'' کے بارے میں خبر دی تھی۔ اس دوران اردو اخبارات کے ساتھ سوشل میڈیا پر بھی یہ خبر عام ہوگئی ہے۔ اشفاق حسین صاحب نے فیض صاحب کے تعلق سے تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی افسانہ طرازیوں کو جس طرح بے نقاب کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ اگر

اشفاق حسین صاحب کے بیان کردہ حقائق درست نہیں ہیں تو تسلیم الٰہی زلفی صاحب کو ان کا معقول جواب اور جواز پیش کرنا چاہیے۔ادبی دنیا ان کے جواب کی منتظر رہے گی۔

سرِ دست میں یہاں اشفاق حسین صاحب کی کتاب کا برقی ایڈیشن پیش کر رہا ہوں۔فیضیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں دلچسپ حقائق موجود ہیں۔

حال ہی میں امریکہ سے ادبی رسالہ زاویہ کا نیا شمارہ شائع ہوا ہے۔اس میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی غزل میں سے ان کا ایک شعر یہاں درج کر رہا ہوں کہ یہ خاصا حسبِ حال لگ رہا ہے۔

مری عریانیوں پر شور کیوں ہے
اگر اندھوں میں ننگا ہو گیا ہوں

تسلیم الٰہی زلفی صاحب آنکھیں کھول کر دیکھیں،ان کی اپنی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔کیونکہ ان کے اردگرد اندھے بہت کم ہیں اور زیادہ تر کھلی آنکھوں والے ہیں۔

حیدر قریشی

میری اس خبر کے ریلیز ہونے کے بعد ۱۳ جنوری ۲۰۱۶ء کو مجھے تسلیم الٰہی زلفی کی جانب سے ایک ای میل ملی۔اس کا عنوان گالی سے لبریز تھا۔اس میں شریفانہ الفاظ یہ تھے۔''بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے''۔اس کے ساتھ میرے تین پرانے خطوط کا عکس جاری کیا گیا تھا اور مجھے احسان فراموش قرار دیا گیا تھا۔

تسلیم الٰہی زلفی نے فیض صاحب کے حوالے سے جو کتاب لکھی تھی اس پر میری رائے بہت پہلے سے ریکارڈ پر موجود تھی۔میں نے ان کا نام لیے بغیر ان کے منفی رویے کی نشان دہی کی تھی۔اب بھی مجھے تسلیم الٰہی زلفی سے متعلق جو بعض باتیں بتانا پڑیں گی ان کا مجھے افسوس رہے گا لیکن ان خطوط کی اشاعت کے بعد ان میں درج بعض باتوں کو کھول کر بیان کرنا ضروری ہو گیا ہے۔تسلیم الٰہی زلفی ان باتوں کی زد میں آ کر مزید بے نقاب ہوتے ہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں،اس کے ذمہ دار وہ آپ ہی ہیں۔

عرصہ گزرا میں نے اپنے ایک خط میں تسلیم الٰہی زلفی کو لکھا تھا کہ میں چودہ اگست کو اسلام آباد میں تھا وہاں اکبر حمیدی،منشا یاد،جمیل آذر،بشیر سیفی،حامد برگی وغیر دوستوں کے ساتھ سٹنگ رہی تھی۔بشیر سیفی

صاحب نے آپ کی کسی غزل کے بارے میں ایک بات کی تھی جو وہ نسیم سحر صاحب کے ذریعے آپ تک پہنچا بھی چکے ہیں۔میں نے اس سٹنگ میں بھی آپ کا دفاع کیا۔

یہاں یہ بھی وضاحت کر دوں کہ میری زندگی کا بڑا حصہ تنگی میں بسر ہوا ہے جبکہ ۱۹۸۴ سے ۱۹۹۰ء تک کا عرصہ میرے لیے انتہائی تنگ دستی کا عرصہ تھا۔میں نے اسے ایک مناسب حد کے اندر رہتے ہوئے اپنی مختلف تحریروں میں ہلکا سا بیان بھی کر دیا ہوا ہے۔۱۹۸۶ سے بے روزگاری کے ساتھ ۸۰ ہزار روپے کا مقروض ہو گیا تھا۔اس کا ذکر ''کھٹی میٹھی یادیں'' کے صفحہ ۶۳ پر پہلے سے موجود ہے۔جرمنی میں آنے کے بعد بھی میں معمولی سا مزدور ہی رہا ہوں اور اس کا ذکر بھی میری یادوں کی کتاب میں موجود ہے۔ایک اقتباس یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

''جرمنی میں بہت ہی معمولی سی مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلا رہا ہوں۔ایک بار ایک دوست مجھے میری جاب پر ہی ملنے کے لئے آئے۔بعد میں گھر پر ملے تو کہنے لگے،اس دن آپ کو دیکھ کر بہت افسوس ہوا تھا کہ اردو کا اتنا اچھا شاعر اور ادیب اور اتنی معمولی سی ملازمت کر رہا ہے۔میں نے فوراً انہیں کہا کہ بھائی!شاعر اور ادیب تو میں ویسے بھی معمولی سا ہوں لیکن آپ اس ساری صورت حال کو یوں دیکھیں تو آپ کو خوشی ہوگی کہ اتنا معمولی سا مزدور ہے اور خدا نے ایسی صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں کہ چکی کی مشقت کے باوجود اتنا ادبی کام کر رہا ہے۔'' **(''کھٹی میٹھی یادیں''،صفحہ نمبر ۱۷۰)**

تنگدستی کے اُسی دور میں میں نے تسلیم الٰہی زلفی سے قرض لیا تھا۔یہ (غالباً) دو ہزار روپے کا قرض،مجھ پر چڑھے ہوئے اسی ہزار روپے کے مجموعی قرض کا حصہ تھا،وہ قرض میں نے طے شدہ طریق اور میعاد کے مطابق اتار دیا تھا۔تسلیم الٰہی زلفی حلفاً انکار کریں کہ قرض اتارا نہیں گیا تھا تو میں ایک بار پھر وہ قرض اتارنے کو تیار ہوں۔

اب سیدھی سی بات یہ ہے کہ اگر تسلیم الٰہی زلفی فیض احمد فیض صاحب کے بیروت میں قیام کے حوالے سے افسانہ طرازی کرتے ہیں اور فیض صاحب کی زندگی کے ایک اہم عرصہ سے متعلق حقائق مسخ ہوتے ہیں تو کیا حقائق اور افسانہ طرازی کے فرق کی طرف توجہ دلانا جرم ہے؟

تسلیم الٰہی زلفی کے نام میرے ایک خط میں ان کی ایک غزل کا ذکر ہوا ہے۔ہوا یہ تھا کہ ماہنامہ ''نئی قدریں'' حیدرآباد کے کسی شمارہ میں تسلیم الٰہی زلفی کے نام سے ایک غزل شائع ہوئی تھی جو دراصل کسی اور شاعر کی غزل تھی۔''نئی قدریں'' کے ایک اور شمارہ میں کسی صاحب نے اس چوری کا

انکشاف کیا اور شور مچایا۔ سو تسلیم الٰہی زلفی سے منسوب اس چوری پر راولپنڈی اور اسلام آباد کے بعض ادبی احباب بھی شکوک وشبہات کا اظہار کر رہے تھے۔ اتفاق سے اسی دوران نئی قدریں کے ایڈیٹر جناب اختر انصاری اکبرآبادی وفات پا گئے۔ ہر چند غزل ان کے نام سے چھپتے ہی وضاحت آجانا چاہئے تھی کہ یہ کسی نے میرے نام کے ساتھ شرارت کی ہے۔ لیکن تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی طرف سے کوئی وضاحت نہیں دی گئی۔ چوری کے انکشاف کے بعد اگرچہ نئی قدریں بند ہو گیا، لیکن ایک شاعر پر چوری کا الزام لگا ہو تو اپنا موقف اور وضاحت تو کسی بھی رسالے یا اخبار میں شائع کرانا مشکل نہیں تھا۔ بہر حال یہ فضا تھی جہاں میں نے حسنِ ظن سے کام لیا اور کہا کہ ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے جان بوجھ کر کسی اور کی غزل تسلیم الٰہی زلفی کے نام سے شائع کرا دی ہو۔ جہاں بعض دوست تسلیم الٰہی زلفی کو چور شاعر قرار دے رہے تھے میں حسنِ ظن سے کام لیتے ہوئے ان کا دفاع کر رہا تھا۔

کراچی یونیورسٹی میں حصولِ تعلیم کے دوران تسلیم الٰہی زلفی جنگ کراچی میں یونیورسٹی میں ہونے والی سرگرمیوں کی ڈائری لکھا کرتے تھے۔ یہ ۱۹۶۶ء سے ۱۹۶۸ء کے دوران کا زمانہ تھا۔ تب میں نویں اور دسویں جماعت میں ہوا کرتا تھا۔ یہ میری چودہ اور پندرہ برس کی عمر کا زمانہ تھا۔ خانپور میں تب روزنامہ جنگ کراچی آیا کرتا تھا۔ میں اس میں **ٹارزن کی کہانی** اور تسلیم الٰہی زلفی کی ڈائری شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ اسکول کے زمانے میں یونیورسٹی ڈائری پڑھنا شاید میری پڑھنے لکھنے کی خواہش کے باعث تھا۔ اگر تسلیم الٰہی زلفی نے اپنے وہ کالم کتابی صورت میں شائع کرائے ہیں تو آج بھی میں ان کالموں کا مداح ہوں۔ ان کالموں کے ساتھ میری عمر اور میرے زمانے کی اتنی یادیں وابستہ ہیں کہ ان کا دوبارہ مطالعہ مجھے پھر سے اسی جہان اور اسی دور میں لے جانے میں مدد ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر تسلیم الٰہی زلفی نے وہ ڈائریاں کتابی صورت میں شائع نہیں کیں تو مجھے افسوس رہے گا کیونکہ نثر میں ان کی وہی سب سے اچھی تحریر ہوا کرتی تھی۔ بہت بعد میں ان کی جو نثر پڑھنے کا موقعہ ملا اس میں وہ لطف نہیں تھا جو ان کی جامعہ کی ڈائری میں ہوا کرتا تھا۔

ہماری ادبی دنیا میں بہت سارے ایسے ادیب ہیں جو کسی دوسرے ادیب کے بارے میں جو توصیفی رائے رکھتے ہیں، کسی مجلس میں اس ادیب کی موجودگی یا غیر موجودگی میں ذکر آنے پر بھی اس کا فراخدلانہ اعتراف کر لیتے ہیں جبکہ بعض ایسے ادیب بھی ہیں جو کسی سے ادبی سطح پر بہت زیادہ متاثر بھی ہوں تو اسے چھپا کر رکھتے ہیں، بلکہ اس کے تئیں اپنی بے نیازی ظاہر کرتے ہیں۔ میں کسی بھی بڑے یا

چھوٹے بلکہ بہت ہی چھوٹے ادیب کے بارے میں بھی جو اچھی رائے رکھتا ہوں اس کا برملا اعتراف کرنے سے دریغ نہیں کیا کرتا۔ تسلیم الٰہی زلفی کی جامعہ کی ڈائری کے بارے میں میرا اعتراف میری اسی عادت کا ایک ثبوت ہے۔ لیکن اگر تسلیم الٰہی زلفی نے وہ کالم شائع نہیں کیے تو وہ خود ان کی اہمیت سے انکار کر رہے ہیں۔ ویسے اشفاق حسین نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب ۶۷۔۱۹۶۸ میں انہوں نے کراچی کے ایک مقامی کالج میں داخلہ لیا تو اس سال زلفی بی اے کے طالب علم تھے۔ اس زمانے میں مشہور مقرر دوست محمد فیضی جو سندھ میں سابق وزیر بھی رہ چکے ہیں وہ بی اے فائنل کے طالب علم تھے، مشہور ٹی وی پروڈیوسر ایوب خاور اور مقررہ منور غنی جو بعد میں نیشنل بنک کے ایگزیکٹو وائس پریسیڈنٹ رسول احمد کلیمی کی بیگم بن گئیں۔ یہ سب لوگ اسی کالج میں پڑھتے تھے اور زلفی بھی وہیں آرٹس کے طالب علم تھے۔ **(اشفاق حسین کی کتاب صفحہ نمبر ۱۵۶۔۱۵۷)**

جہاں تک تسلیم الٰہی زلفی کی شاعری کا تعلق ہے، جب انہوں نے اپنا شعری مجموعہ بھجوایا تو اس کے مطالعہ سے کوئی اچھی رائے نہیں بن پائی اور ان کی شاعری کے سلسلے میں میرا سارا اشتیاق دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بعد میں ایک دو ایسے مواقع آئے کہ میں ان کی شاعری پر ایک رسمی سا مضمون تو لکھ ہی سکتا تھا لیکن طبیعت اس طرف آئی ہی نہیں۔ ایک تو تسلیم الٰہی زلفی کے مجموعہ کی ''ماٹھی شاعری'' اوپر سے غزل چوری کے اسکینڈل میں تسلیم الٰہی زلفی کا دفاع کرنے کے باوجود شاید مجھے خود بھی کچھ الجھن ہو رہی تھی، اسی لیے پھر ان کے شعری مجموعہ پر تبصرہ لکھنے کا موڈ بھی نہیں بن سکا۔

اب یہ عجیب اتفاق ہے کہ جب ۱۹۸۴ء میں قلمی طور پر تسلیم الٰہی زلفی سے روبرو ہونے کا موقعہ ملا تو ان پر ایک غزل کی چوری کا الزام اسلام آباد کے ادبی حلقوں تک موضوعِ گفتگو بنا ہوا تھا۔ اور اب جو پھر ان سے انٹرنیٹ کے توسط سے روبرو ہونے کا موقعہ ملا ہے تو پوری ادبی دنیا میں ان کی فیض صاحب کے بارے میں کتاب ایک مذاق بنی ہوئی ہے۔ ایک آدھ غزل کی چوری کا مسئلہ ہوتا تو حسنِ ظن سے کام لے کر اب بھی تسلیم الٰہی زلفی کا دفاع کیا جا سکتا تھا لیکن یہاں تو فیض صاحب کے قیامِ بیروت سے متعلق تسلیم الٰہی زلفی کی لکھی ہوئی پوری کتاب ہی بے اعتبار ہو گئی ہے۔ اب بندہ کیا دفاع کرے اور کیسے دفاع کرے؟

اشفاق حسین کی کتاب کے جواب میں محض گالیاں دینے سے تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی بریت نہیں ہونے والی۔ انہیں علمی زبان میں اور سلیقے کے ساتھ ہر سوال اور ہر اعتراض کا سامنا کرنا

ہوگا اور ایروں غیروں سے جواب دلانے کی بجائے خود جواب دینا ہوگا۔ ایسا نہ ہوا تو پھر ان کی کتاب فیض شناسی کے حوالے سے ہمیشہ کے لیے رد کر دی جائے گی۔

فیض صاحب کے بیروت میں قیام کے دوران میرا بھی ان سے تھوڑا سا تعلق قائم ہوا تھا۔ میں نے فیض صاحب کے بارے میں اپنے خاکے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں اس تعلق کا ذکر کیا ہوا ہے۔ یہاں اس کا حوالہ دینا مناسب لگ رہا ہے۔ خاکہ میں، میں نے لکھا تھا:

''تیسرے مارشل لاء کے کچھ عرصہ بعد فیض بیروت چلے گئے۔ مرزا ظفر الحسن سے ان کا پتہ حاصل کر کے ان سے ''جدید ادب'' کے لئے تازہ غزل منگائی:

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں

یہ غزل سب سے پہلے ''جدید ادب'' میں چھپی۔ بعد میں اسے ''افکار'' اور ''سیپ'' نے بھی شائع کیا۔ پھر ان کی نظم ''آج شب کوئی نہیں'' منگا کر شائع کی۔ ''جدید ادب'' سے لے کر جاپان کے پروفیسر کتاؤ کا نے اسے جاپانی میں ترجمہ کیا۔ اس بارے میں فیض نے مجھے خط لکھا کہ پروفیسر کتاؤ کا کو پاکستانی رسائل بہت کم پہنچتے ہیں آپ جدید ادب انہیں بھیجتے رہا کریں۔''

(کتاب میری محبتیں۔ مطبوعہ ۱۹۹۸ء، دہلی ایڈیشن۔ ص ۱۰۳)

یہ خاکہ فیض صاحب کی وفات کے بعد لکھا گیا تھا۔ لیکن اس میں اپنی حیثیت کے مطابق فیض صاحب سے جتنا تعلق بتایا گیا ہے اس کے ثبوت فیض صاحب کی زندگی میں ہی آن ریکارڈ محفوظ ہو گئے تھے۔

۱۔ فیض صاحب کی مذکورہ بالا غزل **جدید ادب** خانپور کے ۱۹۸۰ء کے پانچ سو صفحات کے ضخیم شمارہ میں صفحہ نمبر ۲۱۶ پر موجود ہے۔

۲۔ فیض صاحب کی نظم ''آج شب کوئی نہیں'' جدید ادب خانپور کے فروری ۱۹۸۱ء کے شمارہ کے صفحہ نمبر ۶۰ پر شائع شدہ ہے۔

۳۔ جدید ادب خانپور کے شمارہ مارچ ۱۹۸۳ء میں صفحہ نمبر ۳۰۴، ۳۰۵ پر ڈاکٹر تبسم کاشمیری صاحب کا خط شائع کیا گیا ہے۔ اس کا یہ اقتباس پروفیسر کتاؤ کا کے حوالے سے کی گئی بات کی تصدیق کرتا ہے۔

''فیض کی نظم ''آج شب کوئی نہیں'' پڑھی اور محظوظ ہوا اور پھر اردو خواں جاپانی دوستوں نے بھی شوق سے مطالعہ کیا۔ پروفیسر کتاؤ کا فیض کے پورے کلام کا ترجمہ کر رہے ہیں۔ یہ تازہ نظم میں نے ان کو دے دی

ہے۔''

۴۔ جدید ادب خانپور کے اسی فروری ۱۹۸۳ء کے صفحہ نمبر ۳۰۵ پر میرے نام فیض صاحب کے خط کا یہ اقتباس بھی موجود ہے۔

''پروفیسر کتاؤ کا سے ہماری ملاقات دو دفعہ ہو چکی ہے۔ انہیں شکایت ہے کہ پاکستانی ادبی رسائل وہاں نہیں پہنچتے۔ آپ جدید ادب انہیں بھجواتے رہیں۔

(فیض احمد فیض۔ وطن آنے سے پہلے بیروت سے۔)''

اپنی حد کے اندر رہ کر لکھنے کا فائدہ یہ ہوا کہ منشا یاد جیسے ادیب نے جب خاکوں کے مجموعہ ''میری محبتیں'' پر مضمون لکھا تو صاف الفاظ میں لکھا:

''جیسے فیض احمد فیض کا خاکہ، جن سے حیدر قریشی کی کم ملاقاتیں ہوئیں اور بے تکلفی کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ مگر خوبی یہ ہے کہ انہوں نے نہایت دیانتداری سے جتنا تعلق تھا اتنا ہی بیان کیا ہے اور اپنے پاس سے کچھ شامل کرنے کی، جس کی بہت گنجائش تھی، کوئی کوشش نہیں کی بلکہ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ وہ فیض مرحوم کو دور سے دیکھنے والوں میں سے ہیں۔''

(مطبوعہ عکاس اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۴۔ اکتوبر ۲۰۰۵ء۔ صفحہ نمبر ۳۷۔

یہ مضمون منشا یاد کے مضامین، جائزوں اور خاکوں کے مجموعہ ''منشائیے'' میں بھی شامل ہے۔)

میں سمجھتا ہوں کہ منشا یاد کی طرف سے میرے رویے کی توصیف کیے جانے کی وجہ یہی ہے کہ تسلیم الٰہی زلفی صاحب کی طرح افسانہ طرازی کا وسیع میدان موجود ہونے کے باوجود میں نے اپنی حد سے بڑھ کر فیض صاحب سے تعلق ظاہر نہیں کیا۔ بس اتنا ہی تعلق ظاہر کیا جتنا حقیقت میں تھا۔

کاش! فیض صاحب سے اپنے تعلق کی نوعیت بیان کرتے ہوئے تسلیم الٰہی زلفی صاحب بھی افسانہ طرازی نہ کرتے اور صرف اتنا تعلق ہی ظاہر کرتے جتنا کہ حقیقت میں تھا۔

یہاں میں تسلیم الٰہی زلفی کی کتاب کے چند مندرجات پیش کر رہا ہوں۔ اشفاق حسین نے انہیں اپنی کتاب میں چیلنج کیا ہوا ہے۔ ان کے جواب میں تسلیم الٰہی زلفی صاحب کو زیادہ محنت نہیں کرنا ہوگی، گالی گلوچ کیے بغیر صرف دو تین صفحات میں ٹو دی پوائنٹ جواب دینا ہوں گے۔ کہیں چند ڈاکومنٹس کا عکس فراہم کرنا ہوگا۔ ایسے متعدد نکات میں سے چند نکات میں خود یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

تسلیم الٰہی **زلفی** نے لکھا ہے کہ:

(۱) انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا ہے۔(پہلا ایڈیشن صفحہ ۹)

اس کے جواب میں تو تسلیم الٰہی زلفی کو کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ وہ اپنی ڈگری کی کاپی پیش کر سکتے ہیں کہ انہوں نے فلاں سن میں فلاں شعبہ میں یہ تعلیم حاصل کی ہے۔

(۲) اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن (صفحہ نمبر ۷) میں زلفی لکھا ہے کہ انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے انجینیر نگ میں ماسٹرز کیا ہے۔

تو اس کے جواب میں وہ ماسٹرس کی انجینیر نگ کی ڈگری دکھلا دیں۔ اس طرح خود دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

(۳) زلفی نے لکھا ہے کہ وہ کراچی میں ایرو ناٹیکل انجینئرنگ پڑھ رہے تھے۔(دوسرا ایڈیشن ۱۹۹)

تو اس کی ڈگری دکھلا دیں۔ کہاں سے ڈگری لی اور کس سن میں لی؟

(۴) زلفی نے لکھا ہے کہ انہوں بیروت کی امریکن یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا ہے ۔(پہلا ایڈیشن صفحہ ۹)

اس کے جواب میں تو انہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے بس، اس یونیورسٹی کی ڈگری دکھلا دیں۔

(۵) زلفی نے لکھا ہے کہ ملکہ برطانیہ نے انہیں چائے پر بکنگھم پیلس بلوایا اور شاہی عجائب گھر کی بھی سیر کروائی۔(نیا ایڈیشن ۱۲۱)

اس کی تصدیق کے لیے بکنگھم پیلس کے افسر تقریبات سے ریکارڈ منگوایا جا سکتا ہے۔ محل میں آنے والے اور خصوصاً ملکہ سے ملنے والے تمام مہمانوں کے ریکارڈ وہاں پر ہوتے ہیں۔ بکنگھم پیلس کی اس دعوت میں شرکت کرنے والے ابن انشا اور بی بی سی کے پروڈیوسر اطہر علی کا تو انتقال ہو چکا ہے مگر یاور مہدی صاحب ابھی زندہ ہیں۔ چاہیں تو ان سے ہی اپنے حق میں گواہی لے لیں۔

(۶) تسلیم الٰہی زلفی نے لکھا ہے کہ وہ جدہ میں صدر پاکستان ضیاالحق کے مترجم رہے ہیں۔(دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۳۳)

سعودی عرب میں پاکستانی سفارت خانے سے اس کی تصدیق کروائی جا سکتی ہے یا خود زلفی کے پاس کوئی صدر پاکستان یا سفارت خانے سے کوئی ستائشی خط ہو تو وہ دکھلا دیں۔

(۷) تسلیم الٰہی زلفی نے لکھا ہے کہ وہ سعودی شہری ہیں۔(دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۴)

جب کہ اشفاق حسین کا یہ کہنا ہے کہ یہ غلط ہے تو اس کے جواب میں زلفی اپنا سعودی

پاسپورٹ دکھلا سکتے ہیں یا سعودی نیشنلٹی کا لیٹر دکھا سکتے ہیں۔

(۸) زلفی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ سعودی ایرلائنز نے ان کا بیروت میں ٹرانسفر کیا تھا اور اس طرح انہیں فیض صاحب سے ملاقات کا موقعہ ملتا رہا۔(دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۲۴)

اشفاق حسین نے ان کے اس دعوے پر بھی سوال اُٹھایا ہے۔ میرے خیال میں زلفی اس کے ثبوت میں ایرلائنز کا اپائنٹمنٹ لیٹر دکھلا دیں۔ ٹرانسفر لیٹر بھی ساتھ شامل ہو جائے تو کیا ہی بات ہے۔

(۹) تسلیم الٰہی زلفی نے لکھا ہے کہ فیض صاحب اور ایلس سے بیروت میں ۷۸ سے ۸۰ تک باقاعدہ ملاقاتیں رہتی تھیں۔(دوسرا ایڈیشن ۱۹۹)

اشفاق حسین نے لڈمیلا وسی لیوا' ایلس فیض اور فیض کے حوالے دیتے ہوئے کہا ہے کہ فیض اور ایلس تو بیروت میں اس دوران (۷۸ء اور ۷۹ء میں) تھے ہی نہیں۔ تسلیم الٰہی زلفی کوئی اور معتبر حوالہ پیش کر دیں کہ یہ بات غلط ہے۔ فیض گھر لاہور میں فیض صاحب کے تمام پرانے پاسپورٹ ہیں ان میں بیروت کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ وہاں سے پاسپورٹ کی کاپی کر کے بھجوا دیں۔

(۱۰) زلفی نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے کہ مرے دل مرے مسافر والی نظم جو کٹی پھٹی حالت میں فیض نے ردی کی ٹوکری میں ڈال دی تھی اس نظم کو انہوں نے ردی کی ٹوکری سے نکال کر اپنے پاس محفوظ کر لیا۔(پہلا ایڈیشن ۲۷)

اپنی بات کے ثبوت میں زلفی کو چاہیے کہ وہ فیض صاحب کی رائٹنگ میں لکھی ہوئی اس کٹی پھٹی نظم کی کاپی پیش کر دیں۔ یہ تو تبرکاتِ فیض میں شامل کی جانے والی چیز ہو گی۔

(۱۱) تسلیم الٰہی زلفی نے لکھا ہے کہ گزشتہ پچاس سال سے ان کی لکھی ہوئی بچوں کی تدریسی کتابیں مشرق وسطیٰ' یوروپ' اور امریکہ وکینیڈا کے نصاب میں شامل ہیں۔(دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۸۴)

اس کو ثابت کرنا تو بہت ہی آسان ہے۔ کسی بھی اسکول کے بورڈ سے بحیثیت رائٹر اپنے حق میں ثبوت فراہم کر دیں۔ یا ان نصابی کتب کے متعلقہ صفحات کے عکس شائع کر دیں۔

تسلیم الٰہی زلفی ان گیارہ نکات کا جواب پیش کر دیں تو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ فیض شناسی میں سرخرو ہیں یا پھر ان کی فیض شناسی محض خودنمائی اور خودفریبی ہے۔ ؎ خودفریبی سی خودفریبی ہے

تسلیم الٰہی زلفی نے میرے نام اپنی ای میل میں فخر زمان صاحب کی توصیفی تحریر بھی طمطراق سے پیش کی ہے۔ جب تسلیم الٰہی زلفی کی کتاب اکادمی ادبیات نے شائع کی تھی تو اس پر اس وقت کے سربراہ

کی تحریر کا دیا جانا رسمی سی بات ہو جاتی ہے۔ کسی کی جا و بے جا توصیف سے نہ آپ کی عزت میں اضافہ ہوگا اور نہ ہی آپ کی کتاب کو فیض شناسی میں کوئی اعتبار حاصل ہوگا۔ ہاں آپ علمی و ادبی زبان میں سارے اعتراضات اور سوالات کا سامنا کریں اور سب کا جواب دیں تو پھر کسی کی توصیفی تحریر کے بغیر بھی آپ کے وقار و اعتبار کو چیلنج نہیں کیا جا سکے گا۔ ویسے بھی فخر زمان صاحب نے خود اصغر ندیم سید سے معذرت کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ان کی تحریر نہیں بلکہ ان کے اسٹاف کی لکھی ہوئی رسمی تحریر ہے جو ہر کتاب پر چیئرمین کے نام سے شائع ہوتی ہے۔ اصغر ندیم سید نے زلفی کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے فخر زمان کا یہ وضاحتی بیان اپنے دوسرے کالم میں شائع بھی کر دیا ہے۔

http://dunyapakistan.com/48501/asghar-nadeem-syed-6/#.VqPLM0S2wfS.gmail

لیکن کیا تسلیم الٰہی زلفی گالیاں دیئے بغیر اور ایموشنل بلیک کرنے والے بلیک میلروں کی طرح دھمکیاں دیئے بغیر علمی زبان میں اپنی کتاب کے مندرجات کی سچائی ثابت کر سکیں گے؟

اشفاق حسین کا فیض شناسی کے حوالے سے جو کام ہے وہ ''فیض صدی'' کے خاص عرصہ کی فضا کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ ان کے زمانۂ طالب علمی سے فیض صاحب کے ساتھ علمی، ادبی اور تحقیقی تعلقِ خاطر کا نتیجہ ہے۔ انہوں یونیورسٹی کے دور سے اب تک اپنے نکتہ نگاہ کے مطابق فیض شناسی کے حوالے سے لگاتار کام کیا ہے۔ جبکہ تسلیم الٰہی زلفی کا کام ایک تو فیض صدی کی شہرت کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونے کے مترادف ہے، دوسرے اس کام میں بھی انہوں نے اپنی ''عظمت'' کے خبط میں مبتلا ہو کر حقائق کو مسخ کرتے ہوئے فیض صاحب کے بارے ایسی ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن کی ابھی بھی نشان دہی کر کے تردید و تکذیب نہ کی جاتی تو آنے والے وقت میں فیض صاحب کے حوالے سے انہیں افسانوں کو حقائق سمجھ لیا جاتا۔ لیکن اشفاق حسین نے تسلیم الٰہی زلفی کی کتاب کے بیشتر جھوٹ طشت از بام کر دیئے ہیں۔ انہوں نے فیض صاحب کے بیروت میں قیام کے حوالے سے جو شواہد اور حقائق پیش کیے ہیں، ان کی صداقت اور اہمیت کو علم و تحقیق کی دنیا میں تسلیم کیا جائے گا جبکہ ''فیض احمد فیض: بیروت میں'' کے موضوع پر تسلیم الٰہی زلفی کی کتاب اپنا اعتبار کھو چکی ہے۔

مطبوعہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۳۔ فروری ۲۰۱۶ء

شرارِ جستہ

شہناز نبی کا نیا شعری مجموعہ ''شرارِ جستہ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس میں ان کی نظمیں اور غزلیں شامل ہیں۔ شہناز نبی ایک عرصہ سے شاعری کر رہی ہیں، ان کی نظمیں ہوں یا غزلیں، ان کے مطالعہ سے ان کے کلام میں پختگی کا احساس ہوتا ہے۔ ''شرارِ جستہ'' میں شامل ایک نظم ''غلط کہتے ہیں ویرانے'' یہاں پیش کر رہا ہوں، اس سے شہناز نبی کی نظموں کے عمومی انداز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''انہیں دیکھو/ بظاہر ہیں فرومایہ/ شکستہ/ بے سروساماں/ کبھی چہکار چڑیوں کی بسا جاتی ہے ویرانہ/ کبھی اُگتا ہے سبزہ خود فراموشی کے عالم میں/ کہیں پر جھانکتی کرنیں/ کہیں پر تاکتے بادل/ نہ دیواروں کو گرنے کا کوئی صدمہ/ نہ زینوں کو کھسکنے پر تردد ہے/ یہاں ویران ہو جانے میں اک آسودگی سی ہے/ وتیرہ کیا برا ہے یہ/ اسے اپنا کے تو دیکھیں''

شہناز نبی نظم کی طرح غزل بھی عمدہ کہتی ہیں۔ غزلوں کے چند اشعار سے ''شرارِ جستہ'' میں شامل غزلوں کے معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

آہوں کی، نہ اشکوں کی، نہ یادوں کی سزا ہے
قدموں کی یہ زنجیر تو خوابوں کی سزا ہے

وہ کیسا عشق تھا جس نے کبھی مغرور رکھا تھا
پہ اب شرمندگی محسوس کرتے ہیں دوانوں میں

دعا ہے کہ لب پر دعا نہ رہے
کسی سے کوئی التجا نہ رہے

غزل کہنے سے میں ڈرنے لگی ہوں
فعولن فاعلن کرنے لگی ہوں

مجھے کس بحر نے دھوکہ دیا ہے
میں کس گرداب میں پھنسنے لگی ہوں

مرے اندر ہے اک پیاسا کنارا
مرے اطراف اک دریا رواں ہے

معرضِ التوا میں ڈال دیا
میں نے دل سے اسے نکال دیا

بہت دن تک ہمارے حال پر ہنستی رہی تھی
پہ یہ دنیا بھی اب تیری دوانی ہوگئی ہے
کبھی اس دل کا رونا ہے کبھی دنیا کا رونا
غزل خوانی بھی جیسے نوحہ خوانی ہوگئی ہے

امید ہے کہ شہناز نبی کا یہ شعری مجموعہ ادبی حلقوں میں دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور شعروادب کا ذوق رکھنے والے قارئین میں بھی پسند کیا جائے گا۔

مطبوعہ **عکاس انٹرنیشنل** اسلام آباد۔شمارہ نمبر ۲۱۔ستمبر ۲۰۱۵ء

سخن یہ ہے

''سخن یہ ہے'' نصرت بخاری کا شعری مجموعہ ہے۔یہ مجموعہ'' عقیدت'' کے زیرعنوان حمد،نعت،سلام، سے شروع ہوتا ہے۔اسی حصہ میں'' قرآن'' کے زیرعنوان اشعار بھی بنیادی طور پر نعتیہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔حضرت علی اور بی بی زینب کے لیے عقیدت کا اظہار بھی اسی حصہ میں شامل ہے۔تاہم یہ سارا حصہ محض عقیدت اور عقائد کا جذباتی اظہار نہیں ہے بلکہ شعری اظہار کا سلیقہ نصرت بخاری کے ہاں تخلیق اور عقیدت کو آمیز کر کے ایسی سطح پر لے آتا ہے جہاں عقیدے اور فن دونوں کی پختگی ادبی وروحانی سرور کا باعث بن جاتی ہے۔

''سخن یہ ہے'' میں'' عقیدت'' کے بعد غزلوں کا حصہ ہے۔اس میں شامل غزلیں نصرت بخاری کی شاعرانہ شناخت قائم کرتی ہیں۔ان میں بعض کمزور غزلیں بھی ہیں لیکن یہ ویسی ہی کمزور غزلیں ہیں جیسی اردو کے اساتذہ سے لے کر آج کے عمدہ شعراء تک کے ہاں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ایسی غزلیں ہر شاعر کے فنی سفر کے نشیب وفراز کی روداد بن جاتی ہیں۔تاہم نصرت بخاری کی بیشتر غزلیں فکری وفنی پختگی،اور جذبہ ونغمگی سے آراستہ ہیں۔ان کی غزلوں میں غزل کی روایات کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں اور آج کی زندگی کا حال بھی دکھائی دیتا ہے۔اس حوالے سے متعدد اشعار میں سے صرف چند اشعار یہاں پیش کر رہا ہوں۔

دیس کیا چیز ہے احباب کی صحبت کیا ہے
مجھ کو معلوم نہ تھا ملک بدر ہونے تک

گھروں کے ہوتے ہوئے بے گھری کا سامنا ہے
وطن کے ہوتے ہوئے بھی وطن نہیں رکھتے

آنا ہے اگر ہم نے یہیں لوٹ کے نصرتؔ پھر دشت وبیاباں کا سفر کس کے لیے ہے

اک زمانے کے عناں گیر ہوا کرتے تھے
رشتے ناطے کبھی زنجیر ہوا کرتے تھے

جانے حالات بدل جائیں تو کیا حالت ہو
صاحبِ کشف و کرامات سے ڈر لگتا ہے

زخم کے اُدھڑنے میں دیر کتنی لگتی ہے
مل کے پھر بچھڑنے میں دیر کتنی لگتی ہے
بستیاں بسانے میں عمر بیت جاتی ہے
بستیاں اجڑنے میں دیر کتنی لگتی ہے

چپ جو رہتا ہوں تو مجرم کا گماں ہوتا ہے
بات کرتا ہوں تو باتوں کا زیاں ہوتا ہے

آج کی زندگی سے متعلق نصرت بخاری کی غزل ان کی شاعری کا حاصل کہی جاسکتی ہے۔تاہم اس مقام تک آنے میں وہ سارا سفر شامل ہے جو نصرت بخاری کی ساری شاعری کی صورت میں موجود ہے۔

''سخن یہ ہے'' کا تیسرا حصہ نظموں پر مشتمل ہے۔صرف ایک نظم ''ایک فلسطینی کی طرف سے'' آزاد نظم ہے، باقی ساری نظمیں پابند ہیں اور بڑی حد تک غزل کی ہیئت کے زیر اثر ہیں۔ان نظموں میں نصرت بخاری حال کی زندگی سے اور زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ان ساری نظموں میں براہِ راست جلتے ہوئے اور دکھ دیتے ہوئے موضوعات (وصیت، توہین، کشمیر، مسیحا، ایک فلسطینی کی طرف سے، سانحۂ پشاور کے حوالے سے،) پر کہی گئی نظمیں درپیش تلخ حقائق کا نوحہ لگنے لگتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ نصرت بخاری کا یہ شعری مجموعہ ان کی شعری پہچان میں اہمیت کا حامل رہے گا۔

(کتاب میں درج تاثرات)

پشاور کی ۱۷ کہانیاں

نذیر فتح پوری کہنہ مشق قلم کار ہیں۔شاعری ہو یا نثر نگاری، نذیر فتح پوری ایک پُر گو تخلیق کار دکھائی دیتے ہیں۔۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو پشاور، پاکستان کے ایک اسکول میں طالبان دہشت گردوں کا ہولناک حملہ ہوا تو دنیا بھر میں اس انسانیت سوز وحشیانہ کاروائی کی ہولنا کی کو شدت سے محسوس کیا گیا۔دنیا بھر کے میڈیا نے اس سانحہ کی کوریج کی اور طالبان دہشت گردوں کی پُر زور مذمت بھی کی۔

انڈیا اور پاکستان کے تعلقات ایک طویل عرصہ سے لاگ اور لگاؤ کے درمیان جھول رہے ہیں۔تاہم ان دنوں میں دونوں طرف تناؤ میں شدت آئی ہوئی تھی۔تناؤ کے اس عالم میں بھی سانحۂ پشاور کے بارے میں انڈین میڈیا نے اپنے دکھ کا برملا اظہار کیا۔ہندوستانی معاشرہ کے ہر طبقہ نے اپنے رنج و غم اور ہمدردی کا اظہار کیا۔

نذیر فتح پوری چونکہ بنیادی طور پر شاعر اور ادیب ہیں، اس لیے انہوں نے ایک ہندوستانی ادیب ہونے کے ناطے اپنے حصے کا چراغ جلانے کی کاوش کی ہے۔اس مختصر سے مجموعہ میں انہوں نے چند کہانیوں/واقعات کی صورت میں سانحۂ پشاور کے بارے میں اپنا دکھ بیان کرنے کی مخلصانہ کاوش کی ہے۔اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے انہوں نے ایک حد تک ہندوستان کے مختلف سماجی گروہوں کے دکھ کی ترجمانی بھی کی ہے۔ان تمام کہانیوں کے لیے بنیادی مواد سانحۂ پشاور کی خبروں سے لیا گیا ہے۔اس لحاظ سے یہ کہانیاں خبروں کے تناظر میں بھی اور ہنگامی ردِعمل کی صورت میں بھی مثبت صحافیانہ اقدار کی ترجمانی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ادب و صحافت کے حوالے سے نذیر فتح پوری کی اس مخلصانہ کاوش کو سراہا جائے گا اور پشاور اسکول میں معصوم بچوں کے ساتھ ہونے والی طالبان دہشت گردوں کی بربریت کی ہر سطح پر مذمت کی جاتی رہے گی۔یہی نذیر فتح پوری کی اس کاوش کی کامیابی ہوگی۔

(کتاب میں درج تاثرات)

خواب گاہ میں ریت

مبشر سعید نئے لکھنے والے عمدہ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں۔ چند برس پیشتر جب وہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے فرانس میں مقیم تھے تو انہوں نے ''جدید ادب'' کے حوالے سے رابطہ کیا تھا۔ ان کی شاعری دیکھی تو اچھی لگی۔ میں نے ''جدید ادب'' (جرمنی) کے شمارہ نمبر ۱۴ میں ان کی ایک ساتھ چھ غزلیں شائع کی تھیں۔ ان میں ان کی وہ غزل بھی شامل تھی جس کا یہ شعر ان کی شعری پہچان بن چکا ہے۔

تو نہیں مانتا مٹی کا دھواں ہو جانا تو ابھی رقص کروں، ہو کے دکھاؤں تجھ کو؟

یہ ۲۰۱۰ء کی بات ہے۔ اب پاکستان سے مبشر سعید کا پہلا شعری مجموعہ ملا ہے تو اسے دیکھ کر خوشی ہوئی ہے۔ اس مجموعہ میں جو کلام شامل ہے اسے دیکھ کر پہلا تاثر یہ بنا کہ چند سال پیشتر کی غزلوں کے مقابلہ میں مبشر سعید کی غزلوں میں کافی پختگی آ چکی ہے۔ اس میں بعض پہلے والی غزلیں بھی نظر ثانی کے بعد شامل کی گئی ہیں اور ہلکے سے ردوبدل نے شعر کو زیادہ پر تاثیر بنا دیا ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا غزل کا مطلع پہلے یوں تھا۔

حالتِ حال میں کیا رو کے سناؤں تجھ کو تو پلٹ آئے تو آنکھوں پہ بٹھاؤں تجھ کو

(یہ غالباً **حالتِ زار** کی جگہ **حالتِ حال** چھپ گیا ہے) اسے اب یوں کر لیا گیا ہے۔

شام کی زرد اداسی میں بٹھاؤں تجھ کو زندگی! آ کبھی سینے سے لگاؤں تجھ کو

اس غزل کے دو اشعار کو ڈراپ کر دیا گیا ہے۔ تین اشعار پہلی اشاعت کے مطابق ہیں۔ اسی غزل کے دوسرے شعر کے پہلے مصرعہ میں، اور مقطع کے دونوں مصرعوں میں ردوبدل کیا گیا ہے۔ مطلع کی طرح مقطع بھی یہاں درج کر دیتا ہوں تا کہ نظر ثانی کا معیار واضح ہو سکے۔ غزل کا مقطع پہلے یوں شائع ہوا۔

اس نے اک بار مجھے پیار سے بولا تھا سعیدؔ میرا دل ہے کبھی سینے سے لگاؤں تجھ کو

نظر ثانی کے بعد یہ مقطع اب شعری مجموعہ میں یوں شامل ہے۔

اس نے اک بار محبت میں کہا مجھ سے سعید عین ممکن ہے کہ میں یاد نہ آؤں تجھ کو

جدید ادب میں مبشر سعید کی چھپنے والی دوسری غزلوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صرف

ایک غزل پر نظر ثانی کی مثالوں پر اکتفا کر رہا ہوں۔ یہ مثالیں ایک تو اس وجہ سے دی ہیں کہ ان سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ محض پانچ چھ برسوں میں مبشر سعید کا شعری شعور مزید کتنا بہتر ہو گیا ہے۔ دوسرے، یہ اندازہ کیا جا سکے کہ مبشر سعید کو ان کی ادبی زندگی کے اوائل میں ''جدید ادب'' جرمنی میں خاص اہمیت دی جاتی رہی ہے۔

''خواب گاہ میں ریت'' کا مجموعی تاثر یہی ہے کہ مبشر سعید بہت عمدہ اور اچھی غزلیں کہتے ہیں۔ اس مجموعہ کی غزلیں پڑھتے ہوئے دلی خوشی محسوس ہوتی رہی ہے۔ چند اشعار بغیر کسی انتخاب کے پیش کر دیتا ہوں۔

عالمِ وجد سے اظہار میں آتا ہوا میں یعنی، خود خواب ہوا، خواب سناتا ہوا میں

دشت! چھانے گا تری خاک محبت سے سعیدؔ عشق! دیکھے گا تجھے سارے کا سارا کر کے

ہے ہمیں راس یہ گم نام جزیرے کی فضا گر کمانا ہے تمہیں نام، کماؤ، جاؤ

اتنی توقیر جو میری ہے زمانے میں سعیدؔ رنگ ہے مجھ پہ یہ مرشد کا چڑھایا ہوا رنگ
یہ کیسا عشق ہے جو آنکھ تک نہیں آتا یہ کیسی آگ ہے جو روشنی سے عاری ہے

یہ مرا دل ہے عزاخانۂ وحشت، جس میں لوگ آتے ہیں فقط رنج منانے کے لیے

دشتِ ہجراں سے محبت کو نبھاتے ہوئے ہم خاک ہوتے ہیں میاں! خاک اُڑاتے ہوئے ہم

''خواب گاہ میں ریت'' مبشر سعید کی ادبی پیش رفت کا اعلامیہ ہے۔ میں ان کے اس مجموعہ کا دلی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں مبشر سعید کی پے در پے ادبی کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں!

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۶۔ مئی ۲۰۱۷ء

گوہرِ اعجاز

اعجاز تماپوری مرحوم نے شاعری میں غزل،نظم،رباعیات،قطعات،ہائیکواور دوہے تک ساری اصناف کو برتا ہے۔غزل ان کے شعری مزاج کی اولین شناخت ہے۔ان کی نظمیں بھی غزل کے زیرِ اثر دکھائی دیتی ہیں۔انہوں نے روایتی نظم کواہمیت دی ہے تاہم جدید نظم سے بھی صرفِ نظرنہیں کیا۔رباعیات اورقطعات کی روایات کوملحوظ رکھتے ہوئے اعجاز تماپوری نے اپنے شعری امکانات کوممکنہ حدتک اجاگر کیا ہے۔ہائیکو چونکہ جاپان سے لائی گئی صنف تھی،اس لیے اس کے بنیادی ڈھانچے کواس کی جاپانی مقامیت کے حوالے سے سمجھے بغیر ہمارے ہاں تین یکساں مصرعوں کی نظمیں ہائیکو کے نام سے پیش کی جاتی رہی ہیں،تاہم بار بار توجہ دلانے کے بعداب اس خامی پرقابو پالیا گیا ہے۔

اعجاز تماپوری نے اردو میں ہائیکو نگاری کے ابتدائی دور میں ہائیکو لکھے تھےسوان میں وہ بےخبری راہ پا گئی ہے۔انہوں نے سادگی کے ساتھ تین ہم وزن مصرعوں کے ''ہائیکو'' لکھ دیئے ہیں۔لیکن ہائیکو کے دوش بدوش اعجاز تماپوری نے جودوہے لکھے ہیں وہ دوہے کی روایت کے عین مطابق ہیں۔بلکہ میں کہہ سکتاہوں کہ ایسے موسم میں جب پاکستان کے بعض ''عالی مقام'' شاعروں نے دوہے کے مقررہ چھندوں یا بسرام کاالتزام کیے بغیرغزل کے مطلعوں کے انبارلگا کرانہیں دوہے کا نام دے رکھا ہے،اعجاز تماپوری نے اردودوہے کوہندی دوہے کی روایت سے دورنہیں ہونے دیا۔

اعجاز تماپوری کا یہ شعری مجموعہ ''گوہرِ اعجاز'' ان کے جملہ شعری امکانات کوساتھ لیے ہوئے ہے۔اس مجموعہ سے اردوشاعری میں ان کی شعری خدمات کا جائزہ لیا جاسکے گا۔اعجاز تماپوری کی وفات کے بعدان کا یہ شعری سرمایہ یک جا کر کے شائع کرنے والے ان کے سارے عزیزاوراحباب اس کارِخیر کو مکمل کرنے پرلائقِ تحسین ہیں۔میں اس مجموعہ کی اشاعت پراپنی دلی مسرت کا اظہار کرتا ہوں!

(''گوہرِ اعجاز'' میں شامل تاثرات)

مشتاق قمر کے ناول وڈراما کا خصوصی مطالعہ

مشتاق قمر کو میں نے ''اوراق'' میں پڑھنا شروع کیا تھا۔انشائیہ نگاراورافسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ''اوراق'' کے سینئر اور مستند لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ان دونوں ادبی اصناف میں ان کی قابلِ قدر خدمات اردوادب کا حصہ ہیں اور میں ہمیشہ سے ان خدمات کا معترف ہوں۔

میری کم علمی کہیں کہ مشتاق قمر کی ناول نگاری اورڈراما نگاری کا جوہر مجھ سے مخفی تھا۔کسی زمانے میں ڈاکٹر وسیم انجم نے شاید ایک آدھ بار ناول کا کچھ ذکر کیا بھی تھا لیکن میں ان کی بات پر زیادہ دھیان نہ دے سکا۔اب جنید مظفر کا ایم فل کا مقالہ ''مشتاق قمر کے ناول وڈراما کا خصوصی مطالعہ'' پڑھنے کا موقعہ ملا ہے تو اپنی لاعلمی اورعدم توجہی پر افسوس ہونے لگا ہے۔

جنید مظفر نے اپنے مقالہ کو یونیورسٹی کے تحقیقی طریق کے مطابق چھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلے باب میں ''مشتاق قمر کی سوانح اور سیرت'' کوموضوع بنایا ہے۔دوسرے باب میں ''اردو ناول-عہد بہ عہد'' کے تحت اردو ناول نگاری کا عمومی جائزہ لیا گیا ہے۔جبکہ تیسرے باب میں ''ایک دن کا آدمی-تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے زیرعنوان مشتاق قمر کے ناول کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔چوتھے باب میں ''اردو ڈراما کی روایت'' کواحسن طور پر بیان کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔جبکہ پانچویں باب میں ''مشتاق قمر کے ڈرامے-تحقیقی وتنقیدی جائزہ'' کے تحت ان کے پانچ ڈراموں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ان میں سے اردو کے تین ڈرامے ''نقاب''، ''ذرا نم ہوتو''، اور ''اس کارمحبت میں''طبعزاد ہیں،، ''آخری سوٹ کیس'' انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہےاور ''لیکھ'' پنجابی زبان میں لکھا گیا ہے۔ان ڈراموں کوجس طرح جنید مظفر نے اپنے مقالہ کا موضوع بنایا ہے،اس سے ان کی محنت اورلیاقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔آخری باب میں پورے مقالہ کا محاکمہ اور کتابیات کوشامل کیا گیا ہے۔

ایم فل کے مقالہ ''مشتاق قمر کے ناول وڈراما کا خصوصی مطالعہ'' کے ذریعے انشائیہ نگاراورافسانہ نگار مشتاق قمر کی ادبی شخصیت کے بطور ناول نگاراور ڈراما نگار دو نئے پہلو سامنے لانے پر جنید مظفراوران

کے نگران ڈاکٹر نذر خلیق مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس تحقیقی مقالہ کی اشاعت کے بعد ہماری علمی وادبی دنیا میں مشتاق قمر کے مجموعی ادبی کام کو ایک بار پھر اہمیت دی جانے لگے گی۔

(کتاب میں درج تاثرات)

عشق چلا تھا اوڑھ کے چادر

اظہر عروج میرے شہر خانپور کی نئی نسل کے شاعر ہیں۔ان کے پہلے شعری مجموعہ ''ترے ہاتھ پیلے جو ہو گئے'' کی ان بیج فائل مجھے ملی ہے،اس کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے دلی خوشی ہوئی ہے۔ابتدائی شاعری ہونے کے باوجود اظہر عروج کی اُٹھان اچھی ہے۔وہ روایتی شاعری سے گزرتے ہوئے اپنی شخصیت کے توسط سے ایسا نیا پن لے کر آتے ہیں جو مستقبل میں ان کی انفرادیت کی بنیاد بھی بن سکتا ہے۔خانپور کے سینئر شاعروں میں یہ انداز بہت ہی کم دکھائی دیا تھا۔اس لحاظ سے یہ اظہر عروج کی ایسی مقامی کامیابی ہے جو آگے چل کر پوری اردو دنیا تک اپنی حیثیت مستحکم کر سکتی ہے۔کہیں کہیں اظہر عروج کے ہاں بعض فنی سقم کھٹکتے ہیں۔لیکن مقامی سینئرز کی صحبت اور ادبی مطالعہ کے ساتھ وہ ان پر قابو پاتے جائیں گے۔

اگرچہ اظہر عروج نے غزل میں اظہار کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں،تاہم ان کی نظمیں،ماہیے ،قطعات وغیرہ بھی ان کے شعری اظہار کی مناسب صورتیں ہیں،وقت گزرنے کے ساتھ ان میں سے جو سانچے ان کے مزاج سے زیادہ قریب ہوئے ،وہ ان میں زیادہ نمایاں ہوتے جائیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ اظہر عروج کے اس اوّلین مجموعہ نے مجھے ادبی خوشی عطا کی ہے۔میں ان کے شعری مجموعہ ''عشق چلا تھا اوڑھ کے چادر'' کی اشاعت پر اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اظہر عروج کی شاندار ادبی کامیابیوں کے لیے دل سے دعا گو ہوں!

(کتاب میں درج تاثرات)

حُسنِ تغزل

حسام حر کو پشاور سے تعلق رکھنے والے اہلِ ادب میں ایک قابلِ ذکر نام شمار کیا جاتا ہے۔دبستان پشاور اردو، پشتو اور ہندکو تینوں زبانوں کے ادبی سرمایہ سے تشکیل پاتا ہے۔ماضی کے سرمایہ کے دوش بدوش حال کے ادبی سرمایہ میں حسام حر نے بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔''حُسنِ تغزل'' ان کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔مجموعے کے نام سے ہی ظاہر ہے کہ وہ غزل کو اس کے لفظی کا سمیٹک کے ساتھ میک اپ شدہ چہرے کی بجائے اس کی صورت کے اصل حسن میں دیکھنا اور دکھانا زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔

ادبی سطح پر حسام حر جدید عہد اور اس کے مثبت ومنفی اثرات سے بڑی حد تک باخبر ہیں،ترقی پسند روایت ان کے مزاج کا حصہ ہے اور غزل کی بنیادی روایات کو انہوں نے خلوص دل کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا ہے۔یوں وہ اپنی غزل کی مشقِ سخن کے وقت اپنے تینوں زمانوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان تینوں زمانوں کی کارفرمائی کہیں قافیہ،ردیف کی صورت میں،کہیں بحور کے انتخاب کی صورت میں اور کہیں خیال کی پرواز میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔اس طرح غزل کے ارتقائی سفر کا قوس قزح جیسا خوش کن منظر بار بار دکھائی دیتا ہے۔

''حُسنِ تغزل'' آج کے دبستانِ پشاور کی شاعری کا ایک نمایاں رنگ ہے۔مجھے امید ہے کہ اس مجموعہ کو ساری ادبی دنیا میں دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا اور پسند کیا جائے گا۔حسام حر کے اس شعری مجموعہ کی اشاعت پر میں اس کا خلوصِ دل کے ساتھ خیر مقدم کرتا ہوں!

(کتاب میں درج تاثرات)

پارٹ ٹائم شاعری

ارشد خالد کی نظمیں اپنے اختصار کے باعث ان تخلیقی اصناف کی ہم مزاج ہیں جو اپنے مختصر سائز میں پوری بات کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ شاعری میں رباعی، ماہیا، ہائیکو اور نثر میں افسانچہ ایسی ادبی اصناف ہیں جو کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کی ترسیل مکمل کر لیتی ہیں۔ غزل کے شعر کی بات الگ ہے کہ وہاں تو دریا کو کوزے میں بند کیا جاتا ہے۔ ارشد خالد کی ساری مختصر مختصر نظمیں اپنے آپ میں ایک پوری کہانی بیان کر جاتی ہیں۔

ارشد خالد کی بعض نظمیں ایسی شاندار ہیں کہ میں نے سچ مچ دل میں خواہش کی کہ کاش یہ خیال مجھے سوجھتا اور میں اسے اپنے انداز میں کہہ سکتا۔ ایسی نظموں میں ''دیکھ سمندر'' اور ''جنت کے گھر'' کا بطور خاص نام لوں گا۔ ویسے ''چلو ہم ساتھ چلتے ہیں''، ''دیوانگی کا سفر''، ''میری آنکھیں''، ''تبدیلی''، ''الجھن''، ''جنّت''، ''دو صحرائی نظمیں'' اور ''دکھ'' اور ان جیسی بعض دوسری مختصر اور سادہ نظمیں اپنی سادگی میں ایک انوکھی کشش رکھتی ہیں۔ انہیں پڑھتے ہوئے احساس وفکر کی کسی نئی دنیا میں پہنچ جانے کا گمان ہوتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ''پارٹ ٹائم شاعری'' کے نام سے ارشد خالد کی نظموں کا یہ مجموعہ نظم کے قارئین میں توجہ کے ساتھ پڑھا جائے گا اور پسند کیا جائے گا۔

(کتاب میں درج تاثرات)

''جوش بانی'' کا

ترقی پسند نظم نمبر اور میرا جی

ڈاکٹر علی احمد فاطمی ایسے ترقی پسند نقاد ہیں جن کی سوچ اور اپروچ میں ایک توازن ملتا ہے۔ اپنے ترقی پسند خیالات کے ساتھ وہ ادب کو اس کے مجموعی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ادب کے تئیں ان کے اس رویے نے عمومی طور پر انہیں ادبی دنیا میں نہ صرف عدم توازن کا شکار ہونے سے بچائے رکھا بلکہ ان کی ترقی پسند سوچ میں ایک توازن بھی قائم کر دیا۔ ترقی پسند تحریک کی ابتدا، عروج، زوال سے لے کر اب تک کے منظر نامہ پر ایک سرسری سی نظر ڈالیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ یہ تحریک اپنی بہت ساری ادبی خوبیوں کے باوجود اپنے کارندوں کی مارکسسٹ سخت گیری اور فکری سطح پر متشددانہ رویے کی وجہ سے زوال کا شکار ہوئی۔ سخت گیر ترقی پسندوں نے جو زیادہ تر مارکسزم کے کچے پکے مطالعہ سے دانشور بن بیٹھے تھے، ادب کو محض آلۂ کار سمجھ لیا۔ ایسے غیر تخلیقی اذہان نے تخلیقی عمل کے اسرار اور اس کی پیچیدگیوں کو بھی سرسری طور پر لیا اور اپنے نظریات کو عقیدے کی متشددانہ حد تک پہنچا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تحریک کے تخلیق کار بھی اسی رو میں بہہ نکلے۔ چنانچہ کبھی کسی نے احسن فاروقی کو گریبان سے پکڑ کر اسٹیج سے نیچے گرایا تو کبھی منٹو اور اسی طرح کے دوسرے تخلیق کاروں کو اپنے رسائل میں چھاپنے سے روک کر سوشل بائیکاٹ کا اعلان کیا گیا۔ کبھی فیض میلہ میں احمد ندیم قاسمی جیسے ترقی پسند کو بھی ہوٹ کر کے مشاعرہ پڑھنے سے روک دیا گیا۔ یہ متشددانہ رویوں کی چند سرسری سی مثالیں ہیں۔ اس کا نقصان مخالفین کو اتنا نہیں ہوا جتنا خود ترقی پسندوں کو اور ان کی اپنی تحریک کو نقصان ہوا۔ ترقی پسند تحریک کے تنظیمی زوال کے بعد ترقی پسند تخلیق کاروں اور دوسرے دانشوروں نے سنجیدگی کے ساتھ تحریک کی غلطیوں کا جائزہ لیا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اصلاحِ احوال کی کوشش کی۔ علی احمد فاطمی کو میں ایسے دانشوروں میں شمار کرتا ہوں جنہوں نے تحریک کی غلطیوں کا ادراک کر کے احسن طور پر ان غلطیوں کی تلافی اور اصلاح کی کوشش کی۔

جوش وفراق لٹریری سوسائٹی، الہ آباد کے زیر اہتمام ایک ادبی رسالہ ''جوش بانی'' وقتاً فوقتاً

شائع ہوتا ہے۔اس کے مدارالمہام علی احمد فاطمی ہیں۔''جوش بانی'' کا شمارہ نمبر۵۔۶ جولائی ۲۰۱۰ء تا جون ۲۰۱۱ء ترقی پسند نظم نمبر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔اس نظم نمبر کو دیکھ کر میری ان تمام باتوں کی تصدیق ہوتی ہے جن کا میں اوپر ذکر کر چکا ہوں۔علی احمد فاطمی کے بے حد اہم اداریہ کے ساتھ ترقی پسند ادب اور ترقی پسند شاعری کے بارے میں محمد حسن، سید محمد عقیل، صدیق الرحمٰن قدوائی، شارب ردولوی، عتیق اللہ، اقبال حیدر، ابن کنول اور علی احمد فاطمی کے آٹھ مضامین شامل ہیں۔ان میں ترقی پسند ادب اور خصوصاً ترقی پسند شاعری کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔اس نمبر کا اہم حصہ اور بنیادی شناخت قرار پانے والا حصہ نظموں کے تجزیاتی مطالعہ پر مشتمل ہے۔اس میں ۵۹ شاعروں کی ۱۷ نظموں کا تجزیاتی مطالعہ یکجا کیا گیا ہے۔اداریہ اور مضامین کا حصہ ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، جبکہ نظموں کے تجزیاتی مطالعہ کا سلسلہ صفحہ نمبر ۱۱۷ سے لے کر صفحہ نمبر ۵۲۷ تک پھیلا ہوا ہے۔اس نمبر کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ اداریہ میں ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے فراخدلی کے ساتھ یہ اعتراف کیا ہے **''بہت پہلے میں نے میراجی کی کتاب اس نظم میں پڑھی تھی جو بہت اچھی لگی تھی، بس اسی طرز پر ترقی پسند نظم اور ان کے تجزیوں کا خاکہ بنا ڈالا'** یہ روایتی ترقی پسندوں سے ہٹ کر آزادانہ علمی و ادبی کام کرنے والوں کے کام کے ایماندارانہ اعتراف کی ایک جہت ہے۔وگرنہ عمومی طور پر ترقی پسندوں کی طرف سے میراجی کو برا بھلا ہی کہا جاتا تھا۔رجعت پسند کی روایتی گالی جو مارکسزم کا سطحی مطالعہ کرنے والے ہر کسی کو منہ بھر کر دے دیا کرتے ہیں، میراجی کو بھی دی جاتی رہی۔لیکن آج سنجیدہ اور پڑھے لکھے ترقی پسندوں میں یہ رویہ سامنے آنے لگا ہے کہ وہ نظریاتی تشدد کی بجائے دوسروں کی بات اور کام کی بھی قدر کرنے لگے ہیں۔یہ ایک صحت مند تبدیلی ہے، جس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

تجزیاتی مطالعہ کے لیے منتخب کی گئی نظموں میں شاعروں کے انتخاب میں بھی کھلے دل کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔علامہ اقبال نے تو ترقی پسند تحریک کے آغاز سے بھی پہلے چند ایسی شاندار نظمیں لکھ دی تھیں جو آج بھی ترقی پسند شاعری کے لیے مثالی نمونہ قرار دی جاسکتی ہیں۔چنانچہ علامہ اقبال کی دو نظمیں بھی تجزیاتی مطالعہ میں شامل کی گئی ہیں، اختر شیرانی سے لے کر میراجی تک مختلف الجہات لیکن اہم اردو شعراء کو بھی اس حصہ میں شامل کیا گیا ہے۔میراجی کے لکھے ہوئے جوش ملیح آبادی اور ن م راشد کی نظموں کے دو تجزیے بھی شامل کیے گئے ہیں۔اور میراجی کی نظم ''کلرک کا نغمۂ محبت'' کا تجزیاتی مطالعہ کرا کے اسے بھی شامل کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال، جوش ملیح آبادی، اختر شیرانی، فراق گورکھپوری، ن م راشد، میراجی، فیض احمد فیض

، مخدوم محی الدین، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، معین احسن جذبی، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، اسرار الحق مجاز، احسان دانش، جمیل مظہری، مجنوں گورکھپوری، پرویز شاہدی، وامق جونپوری، مسعود اختر جمال، احمد ندیم قاسمی، سلام مچھلی شہری، اختر الایمان، جاں نثار اختر، کیفی اعظمی جیسے معتبر ناموں سے لے کر آج کے ندا فاضلی، جاوید اختر اور شاہد ماہلی تک شاعروں کی ایک کہکشاں ہے جو اس نمبر میں جگمگا رہی ہے اور جن کی نظموں کے تجزیوں سے ترقی پسند افکار کی توثیق کی جارہی ہے۔ایک کمی ہے کہ ظہیر کاشمیری سے لے کر احمد فراز تک پاکستان کے کئی معتبر ترقی پسند شاعر اس نمبر میں دکھائی نہیں دے رہے۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ ''پاکستان کے سبھی ترقی پسند شاعروں کو ہم نہیں لے سکے جس کا ہمیں افسوس ہے۔مواد کی فراہمی مسئلہ بنی رہی''

ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے اداریہ کے ان اقتباسات سے ان کے موڈ اور فراخدلانہ طریق کار کے بارے میں اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''قمر رئیس کہا کرتے تھے کہ ادب میں نظریاتی تشدد نقصان زیادہ پہنچاتا ہے اور دائرہ کو محدود کرتا ہے۔فکر میں نرمی اور لچک ہونی چاہیے جو قمر رئیس میں تھی اور میں بھی اس کا قائل ہوا اور اسی کا فائدہ اٹھایا''

''سارا ادب ہمارا، سارے ادیب ہمارے، سارے انسان ہمارے، ساری کائنات ہماری، یہی ہم نے اپنے بزرگوں سے سیکھا ہے اور یہی ہم اپنے نوجوانوں کو وراثت میں دینا چاہتے ہیں۔''

یہ خوشی کی بات ہے کہ پہلے زندگی کے صرف ایک رُخ پر ہی اصرار کرنے والے ترقی پسند دانشور اب اپنے افکار پر قائم رہتے ہوئے زندگی کو اس کے مجموعی تناظر میں بھی دیکھنے لگے ہیں۔بلکہ زندگی سے بڑھ کر کائناتی سطح پر بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور ان کے رفیق کار کینیڈا کے اقبال حیدر مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ترقی پسند نظم نمبر پیش کر کے ترقی پسند نظم کے خدوخال کو اجاگر کیا۔اپنی سوچ میں آنے والی مثبت تبدیلیوں کو نمایاں کیا اور ہمارے میراجی کے کام کا اعتراف کر کے دوسروں کو بھی اعتراف کی ترغیب دی۔اس نمبر سے ادب میں فراخدلانہ سوچ اور صحت مند رویے مستحکم ہوں گے۔

جدید ادب جرمنی۔شمارہ نمبر ۱۸۔جنوری تا جون ۲۰۱۲ء

گزارشِ احوالِ واقعی

(ثمینہ راجہ کے خطوط کے حوالے سے)

''ثمینہ راجہ کے خطوط'' جناب انیس شاہ جیلانی کے نام لکھے گئے خطوط ہیں جنہیں حال ہی میں شائع کیا گیا ہے۔ ۲۸ جنوری ۲۰۱۷ء کو مجھے کراچی سے جناب راشد اشرف نے اس کتاب کی اشاعت کی خبر بذریعہ ای میل بھیجی اور ساتھ ہی لکھا کہ اس میں دو تین جگہوں پر آپ کا ''ذکرِ خیر'' بھی ہے۔ نہایت کھلے الفاظ میں'' تو میں نے انہیں لکھا کہ ''اگر میرے ذکر والا حصہ فراہم کر سکیں تو ممنون ہوں گا۔'' چنانچہ انہوں نے کرم کیا اور مجھے آٹھ تصویروں کی صورت میں متعلقہ صفحات فراہم کر دیئے۔ وہی صفحات میرے پیشِ نظر ہیں اور انہی کی بنیاد پر میں اپنی ''گزارشِ احوالِ واقعی'' پیش کر رہا ہوں۔

اکتوبر ۱۹۷۸ء میں ''جدید ادب'' خان پور کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ میری ادبی زندگی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ۱۹۷۹ء میں ثمینہ راجہ کی طرف سے ایک خط موصول ہوا تو میرا ان کا رابطہ ہوا۔ اس کے بعد ادبی زندگی میں وقفہ وقفہ سے ثمینہ راجہ کے ساتھ جو قلمی رابطہ ہوا، اس کی ترتیب مختصراً بیان کرتا ہوں۔

۱۔ اوّلین رابطہ ۱۹۷۹ء میں ہوا جب انہوں نے خط لکھا۔ اس دوران وہ جدید ادب میں چھپنے لگیں اور ''کرنیں'' کی اشاعت کے منصوبہ میں بھی شامل ہوئیں۔ اسی دورانیہ میں ان کی ایک غزل (یا شاید نظم) روزنامہ امروز کے ادبی صفحہ پر ان کی تصویر کے ساتھ شائع ہوئی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ اس پر گھر میں خاصا ہنگامہ ہوا، ان پر تشدد کیا گیا۔ پھر رابطہ نہ رہا، البتہ اتنا معلوم ہوا کہ اپنا گھر چھوڑ کر وہ کسی نہ کسی طرح اسلام آباد پہنچ گئی ہیں۔ پھر اسلام آباد میں زمان ملک سے ان کی شادی کی خبر سننے میں آئی۔

۲۔ دوسرا رابطہ غالباً ۱۹۹۱ء۔۱۹۹۲ء میں روبرو ہوا۔ عذرا اصغر نے اپنے گھر پر ایک گیٹ ٹوگیدر کا انتظام کیا تھا۔ یہاں ثمینہ راجہ بھی آئی ہوئی تھیں، زمان ملک بھی تھے۔ یہاں میں نے خوشگوار انداز میں ہلکا پھلکا سا جملہ بھی کہا تھا کہ اس محفل میں راجہ بھی ہیں اور مہاراجہ بھی ہیں۔

۳۔ تیسرا رابطہ تب فیس بک پر ہوا جب ثمینہ راجہ کی فیس بک پر ریحانہ قمر اور نوشی گیلانی کے خلاف

شدید جنگ جاری تھی۔ فیس بک پر یہ بہت ہی افسوسناک جنگ تھی۔ محاذ جنگ پر دونوں طرف سے شدید گولہ باری ہو رہی تھی۔ الزامات کی نوعیت کا اندازہ اس سے کر لیں کہ ریحانہ قمر کی ٹیم ثمینہ راجہ پر فیصل عجمی اور احمد فراز کے حوالے سے بہت ہی کھلے الزامات عائد کر رہی تھیں۔ تب میں نے ثمینہ راجہ سے رابطہ کیا۔ انہیں لکھا کہ اس نوعیت کا گند اچھالا جا رہا ہے تو آپ کو لاتعلق ہو جانا چاہئے۔ لیکن وہ نہیں مانیں۔ پھر میں نے انہیں دو مشورے دیئے۔ نوشی گیلانی کو کبھی کوئی اصلاح دیتا رہا ہوگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب وہ شعر کہہ سکتی ہیں اور اپنے ڈھب کی اچھی شاعری کر رہی ہیں۔ اس لئے نوشی کے خلاف محاذ بند کریں اور صرف ریحانہ کے ساتھ لڑائی کر لیں۔ یوں بھی ایک وقت میں ایک محاذ پر ہی لڑنا مناسب ہوتا ہے۔ دوسرا مشورہ یہ دیا کہ فیس بک پر ہر بندہ متعدد ناموں کے ساتھ براجمان ہے۔ الزام کے طور پر جو لوگ دوسروں کے فیک اکاؤنٹس کی بات کرتے ہیں وہ خود دس دس فیک اکاؤنٹس کھول کر کام کر رہے ہیں اور اوپر سے معلم اخلاق بھی بنے ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر اس قسم کی لڑائی لڑنی ہے تو اپنے احباب کو آگے کریں اور خود پیچھے رہ کر مقابلہ کریں۔ فیس بک پر اسی طرح مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ آپ کے بارے میں جس قسم کا گند اچھالا جا رہا ہے، اس معاملہ میں آپ کو سامنے نہیں ہونا چاہئے۔ لیکن انہوں نے میرے دونوں مشورے نہیں مانے۔ جب خواتین کی گالی گلوچ انتہا تک پہنچ گئی تو فیصل عجمی اور عباس تابش کے درمیان رابطہ ہوا اور پھر ایک دم ثمینہ راجہ اور ریحانہ قمر کے درمیان جنگ بندی ہو گئی۔ لیکن تب بعض لوگوں نے کمنٹ دیئے کہ اس جنگ بندی کے انداز سے دونوں اطراف سے اچھالے گئے الزامات کی بالواسطہ طور پر تصدیق ہو گئی۔ یہ سانحہ ۲۰۱۰ء کی بات ہے۔

۴۔ چوتھا رابطہ ۲۰/اکتوبر ۲۰۱۲ء کو تب ہوا جب ان کی وفات کی خبر ملی اور میں نے اپنے ادبی فورم urdu_writers@yahoogroups.com پر ان کی وفات کی خبر جاری کی۔ وہ خبر یہاں بھی شامل کر رہا ہوں۔ پہلے ناصر علی سید نے ایک خبر جاری کی۔

''اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ اردو کی معروف شاعرہ ثمینہ راجہ اب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔''

میں نے اسی خبر کو بنیاد بناتے ہوئے اپنے مذکورہ فورم پر وفات کے روز ہی یہ خبر ریلیز کی۔

''اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اس خبر سے دلی صدمہ ہوا۔ ثمینہ راجہ میرے آبائی علاقہ ضلع رحیم یار خان سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کی زندگی میں میری یادوں کا باب''۔۔۔ادبی کائنات میں رنگ'' شائع ہوا تھا۔ اس میں ان کا ذکرِ خیر بایں الفاظ کیا گیا:

ثمینہ راجہ رحیم یار خان کے قریب ایک گاؤں راجہ کوٹ میں رہتی تھیں۔ ان میں شروع سے ہی

شاندار تخلیقی صلاحیتیں تھیں۔گاؤں کے ماحول میں تو شاید یہ صلاحیتیں پوری طرح ابھر نہ پاتیں تاہم انہوں نے ہمت سے کام لیا اور قسمت نے یاوری کی اور وہ جلد ہی اسلام آباد کے کشادہ ماحول میں پہنچ گئیں۔اردو کے ایک اچھے شاعر زمان ملک سے ان کی شادی ہوگئی۔پھر غالباً رشتہ زیادہ نبھ نہیں سکا۔تاہم ثمینہ راجہ نے بڑی بہادری کے ساتھ سماجی سطح پر بھی اور ادبی سطح پر بھی زندگی کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔ثمینہ راجہ کو ادبی دنیا میں کافی حد تک پذیرائی ملی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ان کا جو ادبی مقام بنتا ہے ابھی تک ان کے ساتھ وہ انصاف نہیں کیا گیا۔میری ان کے ساتھ رحیم یار خان کے زمانے سے ہی خط و کتابت تھی۔ادبی رابطہ تھا۔تاہم ان سے بالمشافہ ملاقات غالباً ۹۲۔۱۹۹۱ء ہوئی تھی۔عذرا اصغر نے میری اسلام آباد میں آمد پر اپنے گھر میں ہی ایک ''گیٹ ٹوگیدر'' کا اہتمام کیا تھا۔ثمینہ راجہ بھی اس موقعہ پر آئی تھیں۔

دعا ہے کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔آمین۔

ناصر علی سید صاحب!اس خبر کو بروقت ریلیز کرنے کے لئے آپ کا خصوصی شکریہ۔(حیدر قریشی)

۵۔اب پانچواں رابطہ میں کتاب ثمینہ راجہ کے خطوط کے متعلقہ صفحات کے حوالے سے اپنے اس مضمون کے ذریعے کر رہا ہوں۔

ان سابقہ رابطوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ثمینہ راجہ کے بارے میں میری سوچ ہمیشہ مثبت رہی ہے۔انہیں ایسا کیا صدمہ پہنچا کہ وہ میرے بارے میں اتنے نامناسب انداز میں رائے مستحکم کرتی گئیں۔اب مجھے خود ثمینہ راجہ کے خطوط کے اندر سے ہی اپنے موقف کی صفائی اور ان کی سوچ کی تردید کرنا پڑے گی تو مجھے اس کا بھی افسوس رہے گا لیکن یہ شائع ہوئے ہیں تو اپنی طرف سے وضاحت تو کرنا پڑے گی۔

اب میں ثمینہ راجہ کے خطوط میں اپنے ذکر والے سارے موصولہ حصے پیش کر دیتا ہوں تا کہ پھر مختلف نکات پر آسانی سے بات ہو سکے۔

▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪▪

''یاد آیا حیدر قریشی سے اس کا رسالہ منگوایئے،اس نے تو مارے طعنوں کے میرا جینا دوبھر کر دیا ہے،بے چارہ غضب کا کنجوس آدمی ہے۔اس کا ایک لطیفہ آپ کو سناؤں پچھلے دنوں میں نے تخلیق میں ''جدید ادب'' کا اشتہار دیکھا اور ''شفق رنگ'' کا بھی،یہ کتاب ضلع رحیم یار خان کے شعراء اور شاعرات کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ہے،میں نے اسے خط لکھا کہ اپنا پرچہ اور کتاب بذریعہ وی پی پی بھجواؤ،جواب میں اس کا خوب لمبا چوڑا خط آیا۔ایک ایک لفظ سے بے تابی ٹپکتی تھی۔بتایئے آپ نے اس

سے پہلے خط کیوں نہیں لکھا،اتنی دیر کیوں لگائی،میں کب سے آپ کے خط کا منتظر تھا،ہر دوسری سطر کے بعد انہیں جملوں کی تکرار،میں سخت حیران ہوئی کہ یہ کیا ماجرا ہے بعد میں اس نے بتایا کہ وہ نہیں جانتا کہ میں بھی رحیم یار خان سے تعلق رکھتی ہوں۔''شفق رنگ'' کی اشاعت کے بعد لاہور اور سرگودھا کے بعض ادیبوں اور مدیروں نے اس سے پوچھا کہ ثمینہ راجہ بھی تو رحیم یار خان کی ہے اسے کتاب میں کیوں شامل نہیں کیا۔اس پر بیچارہ میرے خط کا انتظار فرمانے بیٹھ گیا۔ظاہر ہے میرا پتہ تو اسے معلوم تھا نہیں کہ خود رابطہ قائم کرتا۔اچھا یہ تو تعارف تھا لطیفہ آگے ہے۔کتاب پر اس نے لکھا ''بی بی ثمینہ کی نذر جن کا نام شامل نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب ہمیشہ کے لئے ادھوری ہوگئی۔'' کتاب اور رسالے کا بھجوایا بھی پارسل،میں سمجھی کہ اعزازی طور پر بھجوایا ہے لیکن خط کے آخر میں چند سطریں تھیں،ملاحظہ فرمایئے۔''وی پی بھجوانے کی عادت میں نے سیکھی نہیں،اعتماد کر کے پارسل بھجوایا کرتا ہوں،اکثر دھوکہ بھی ملتا ہے مگر وی پی پی نہیں بھجوایا کرتا،آگے آپ جانیں۔'' اب کون کافر ہے جو ''دھوکے'' کا لفظ سن کر بھی اس کے رسالے اور کتاب کو ہضم کرے گا۔سو میں نے ۴۵ روپے منی آرڈر کرا دیئے،کتاب کی قیمت سمیت۔کتاب پر نوٹ تھا خیال تھا کہ یہ تو یقیناً نذر ہو گیا ور آجکل میں معذرت کا خط آئے گا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی،مگر توبہ کیجئے صاحب،جواب میں ایک عدد شکریہ آیا منی آرڈر کی وصولی پر۔اب جب بھی کتاب دیکھتی ہوں نوٹ دیکھ کر دل جل کر کباب ہو جاتا ہے،آپ براہ کرم اسے تیس روپے منی آرڈر کروایئے تا کہ وہ اپنا پرچہ آپ کو ''اعزازی طور'' پر بھجوا سکے۔'' (ص۲۰۱)

''پہلی انتہا حیدر قریشی ہے۔آپ نے بہت اچھا کیا روپے اسے بھجوا دیئے۔تیس چالیس یا سو روپوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا،ہاں آدمی کی ''اوقات'' معلوم ہو جاتی ہے۔'' (ص۲۰۶)

''جدید ادب'' کے دو شمارے رجسٹرڈ بھجوائے تھے موصول ہوئے ہوں گے۔حیدر قریشی صاحب ''کرنیں'' کے نام سے بہاول پور ڈویژن کے شعراء اور شاعرات کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ چھاپ رہے ہیں۔مجھے کہتے ہیں اس خیال کا محرک آپ ہیں،میں نے آپ کو ''شفق رنگ میں شامل نہیں کیا تھا،مگر اتنا بتا دوں کہ پانچ سو روپے ہر شاعر سے وصول کر چکے ہیں عجیب آدمی ہیں یہ صاحب بھی۔'' (ص۲۲۱)

''یہ تو آپ نے عجیب بات لکھی ہے کہ آپ لوگ یعنی ضلع رحیم یار خان کے لال بجھکڑا اگر مل جائیں تو لاہور،کراچی پر بھاری پڑ سکتے ہیں،حیدر قریشی صاحب بھی یہی بات کہتے ہیں مگر میں متفق نہیں

ہوسکتی۔'' (ص۲۲۲)

''جدید ادب'' واقعی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے پا کر وقت کٹنے کا کوئی سامان ہو سکے مگر چھپتا بھی تو خان پور سے ہے نا۔ مدیر کی فرمائش پر میرا خیال ہے تمام بڑے لکھنے والے مطبوعہ چیزیں ہی بھجواتے ہیں، غیر مطبوعہ چیزیں معمولی رسالے میں دینے سے ان کی ساکھ پر اثر پڑتا ہوگا۔ حیدر قریشی کی واقفیت بھی زیادہ لوگوں سے نہیں ہے کچھ یہ شخص انانیت زدہ بھی ہے لوگ رسمی طور پر جو چند جملے تعریف کے طور پر لکھ دیتے ہیں اسی پر یہ حضرت پھولے نہیں سماتے۔ آپ کیوں ہمت نہیں کرتے، حیرت شملوی اکیڈمی صرف نام کی اکیڈمی ہے، کچھ کام بھی لیجئے اس سے، کوئی رسالہ نکالئے، آیئے ہم مل کر رسالہ نکالیں، سید انیس شاہ جیلانی صاحب اور ثمینہ راجہ۔ ہم کوئی معمولی لوگ تھوڑے ہیں، بس ہمت کی بات ہے'' (ص۲۲۲، ۲۲۳)

''جدید ادب'' نے میری شاعری پر کچھ خاص نہیں لکھا۔ حیدر قریشی ایک مضمون لکھ رہے تھے مجھ ناچیز پر، مکمل کرلیا تو مجھے بھی دکھایا، میری تعریف کم تھی پروین شاکر کی مذمت زیادہ۔ حیرت ہے پروین نے بڑے بڑوں کو چکرا دیا ہے۔ مجھے بعض اوقات تو بڑا لطف آتا ہے کوئی صاحب اسے آفتاب بنانے پر تلے ہوئے ہیں کوئی ذرہ بھی نہیں سمجھتے۔ میں نے حیدر قریشی سے کہا کہ ''اگر وہ مجھ پر مضمون لکھنا چاہتے ہیں تو پروین شاکر کی مذمت مت کریں، ورنہ براہِ کرم مضمون لکھنے کا ارادہ ترک فرمادیں۔ کسی شخص کو خوامخواہ اس کے مقام سے گرانے کی کوشش کرنا سخت ذلیل حرکت ہے۔ میں بھلا اپنی دکان چمکانے کے لئے کسی کو کیوں نیچا دکھانے کی کوشش کروں، مجھے تو یہ بالکل پسند نہیں۔ اب میرا خیال ہے انہوں نے مضمون ہی رکھ چھوڑا ہے۔ گروپ بازی کی لعنت ہمارے ادب پر مسلط ہو چکی ہے۔'' (ص۲۲۳)

''حیدر قریشی کا خط تلاش کرنا پڑے گا اتنے بہت سے خطوط میں لیکن میں بھجوا ہی دوں گی۔ آپ ذرا اس شخص کا لہجہ ملاحظہ فرمایئے گا، مجھے زندگی بھر کسی شخص پر اتنا غصہ نہیں آیا۔ آپ سوچتے ہوں گے پھر اس سے خط و کتابت کیا ضروری ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو سانپ کے منہ میں چھچھوندر کا معاملہ ہو گیا ہے۔ جب میں نے آپ کے لئے غلط الفاظ استعمال کرنے پر جھاڑا تو حضرت معذرت کرنے لگے لیکن میں نے تہیہ کیا ہے کہ اب ختم۔'' (راشد اشرف کی ارسال کردہ پکچرے پر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔)

''حیدر قریشی کا کوئی اور خط مجھے ملا نہیں، کاغذوں میں ادھر ادھر ہو گیا ہوگا تحریر تو آپ نے اس شخص کی دیکھ لی، انداز گفتگو بھی ملاحظہ فرمالیا، اب لعنت بھیجئے۔'' (ص۲۲۸)

اب میں ان فرمودات کے مختلف نکات کا الگ الگ جائزہ پیش کرتا ہوں۔ ثمینہ راجہ کے الزامات کو ان کی اپنی تحریر اور حقائق کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔

۱۔ عزت کے ساتھ استقبال کرنے کا گناہ: ثمینہ راجہ کو بعض ادبی رسائل میں پڑھا تھا، جب یہ معلوم ہوا کہ وہ میرے ہی ضلع کی رہنے والی ہیں تو خوشی ہوئی۔ جب ان کا پہلا خط ملا تو میں نے اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کیا۔ میرے خط کے جو مندرجات انہوں نے بیان کئے ہیں وہ کسی ''بے تابی'' کا نہیں بلکہ خوشی کا اظہار تھا۔ اسی لیے بعد میں جب انہیں کتاب ''شفق رنگ'' بھیجی تو اس میں یہ لکھا کہ:

'بی بی ثمینہ کی نذر جن کا نام شامل نہ ہونے کی وجہ سے یہ کتاب ہمیشہ کے لئے ادھوری ہوگئی۔''

یہ عبارت تو میری ادبی ایمانداری کا ثبوت ہے کہ اگر پہلے اپنے ضلع میں ان کے موجود ہونے کا علم نہ ہونے کے باعث ''شفق رنگ'' ان کے کلام کے بغیر چھپ گئی تھی تو میں نے اس انتخاب کو ادھورا قرار دیا۔ کوئی میرے ساتھ اس انداز کا سلوک کرے تو میں اس کی عزت افزائی کا ہمیشہ شکر ادا کرتا ہوں۔ میری متعدد تحریروں میں اپنے معاصرین کی ادبی اہمیت کے برملا اعتراف اور شکرگزاری کی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں اپنے ایک بیان اور شکرگزاری کی دو مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

''ہماری ادبی دنیا میں بہت سارے ایسے ادیب ہیں جو کسی دوسرے ادیب کے بارے میں جو توصیفی رائے رکھتے ہیں، کسی مجلس میں اس ادیب کی موجودگی یا غیر موجودگی میں ذکر آنے پر بھی اس کا فراخدلانہ اعتراف کر لیتے ہیں جبکہ بعض ایسے ادیب بھی ہیں جو کسی سے ادبی سطح پر بہت زیادہ متاثر بھی ہوں تو اسے چھپا کر رکھتے ہیں، بلکہ اس کے تئیں اپنی بے نیازی ظاہر کرتے ہیں۔ میں کسی بھی بڑے یا چھوٹے بلکہ بہت ہی چھوٹے ادیب کے بارے میں بھی جو اچھی رائے رکھتا ہوں اس کا برملا اعتراف کرنے سے دریغ نہیں کیا کرتا۔''

(تسلیم الٰہی زلفی کی فیض شناسی یا خودنمائی؟ از حیدر قریشی۔
مطبوعہ عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ نمبر ۲۳۔ فروری ۲۰۱۶ء)

ماسکو سے ڈاکٹر لدمیلا وسیلیو یا کی ۲۴ ستمبر ۲۰۱۶ء کی ایک خوش کن ای میل کے جواب میں، میں نے لکھا:

''میں تو آپ کی اس خبر سے ہی خوش تھا کہ آپ برصغیر سے باہر کے ادبی رسائل پر کام کر رہی

ہیں۔ یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ یہ کام تو صرف ایک حصہ ہے جبکہ آپ برصغیر سے باہر کی اردو دنیا پر پوری کتاب لکھ رہی ہیں۔ پھر اسی حوالے سے جدید ادب کے بارے میں اور میرے تئیں آپ کی محبت اور اخلاص کا اظہار، ذکرِ خیر بھی اور شاعری کا روسی زبان میں ترجمہ بھی، اتنی خوشیاں۔۔۔۔۔ سچی بات ہے میرا دامن چھوٹا پڑ گیا ہے۔ **(میں ایسی خوشیوں پر اپنے جذبات کو چھپا تا نہیں ہوں۔ ہمیشہ اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتا ہوں)** اللہ آپ کو خوش رکھے اور صحت تندرستی والی زندگی عطا کرے۔ آمین۔''

ڈاکٹر ظہور احمد اعوان نے روزنامہ **آج** پشاور۔ ۲۵/جولائی ۲۰۱۰ء میں اپنے کالم میں ''جرمنی کا ایک ادبی رسالہ'' کے ذیلی عنوان سے میری بہت زیادہ عزت افزائی کی، میری حیثیت سے زیادہ مجھے اہم گردانا۔ میں نے ان کا تمسخر نہیں اڑایا بلکہ یوں شکریہ ادا کیا۔

''ا: ڈاکٹر صاحب آپ کی محبت اور حوصلہ افزائی ہمیشہ میرے لیے تقویت کا موجب بنی ہے۔ آپ کے بعض القاب اور جملے میری حیثیت سے زیادہ ہو کر بھی مجھے اچھے لگے ہیں لیکن یہ ''بابائے ادب'' کا لقب میری حیثیت سے زیادہ ہی نہیں بہت زیادہ ہے۔ ادبی لحاظ سے تو بالکل ہی نہیں اور عمر کے لحاظ سے بھی ابھی ایسا بزرگ نہیں ہوا کہ اس لقب کا متحمل ہو سکوں۔ سو آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اپنے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ **(حیدر قریشی)** ''

مطبوعہ جدید ادب جرمنی۔ شمارہ نمبر ۱۶۔ ص۔ ۵۵۔۵۶

میری زندگی کا یہ رویہ شروع سے اب تک ایسا ہی ہے۔ ثمینہ راجہ نے اس کے برعکس میری طرف سے خوشی اور عزت کے ساتھ اپنا استقبال کئے جانے پر طنزیہ اور تمسخرانہ انداز اختیار کیا تو یہ ان کا اپنا مزاج اور ان کا اپنا ظرف ہے۔ میں صرف شرمندگی کا اظہار ہی کر سکتا ہوں۔

☆☆☆ **جدید ادب کی فروخت کا گناہ:** ثمینہ راجہ نے لکھا کہ ''اپنا پرچہ اور کتاب بذریعہ وی پی پی بھجواؤ''۔ میں نے لکھا کہ ''وی پی بھجوانے کی عادت میں نے سیکھی نہیں، اعتماد کر کے پارسل بھجوایا کرتا ہوں، اکثر دھوکہ بھی ملتا ہے مگر وی پی پی نہیں بھجوایا کرتا، آگے آپ جانیں۔''

اس پر ثمینہ راجہ نے جس نوعیت کی طعنہ زنی کی ہے وہ بے حد افسوسناک ہے۔ نہ تو میں نے کوئی بل بھیجا۔ نہ کسی معیّن رقم کا تقاضا کیا۔ پارسل انہیں ملا اور انہوں نے جو مناسب سمجھا بھیج دیا۔ اس کے بعد اس پر جتنے جملے تراشے گئے وہ ثمینہ راجہ کی ''عالی ظرفی'' ہی کہلا سکتے ہیں۔ اب ''جدید ادب'' کی فروخت کی بات ہی آئی ہے تو آج اس حقیقت کا اظہار بھی کر دوں کہ جدید ادب خانپور کے دور میں ایک شمارہ بھی

ایسا نہیں تھا جس کو دس خریدار نصیب ہوئے ہوں۔ اکا دکا کسی نے تعاون کیا وہ بھی کبھی کبھار۔ ثمینہ راجہ کی صورت میں حاتم طائی ایک ہی نصیب ہوئیں۔

جدید ادب خانپور ہی نہیں جدید ادب جرمنی کا معاملہ بھی ایسا ہی رہا ہے۔ بمشکل تین یا چار احباب تعاون کرتے تھے۔ رسالہ میں جیسے تیسے شائع کر لیتا تھا۔ ڈاک خرچ بھی برداشت کر لیتا تھا۔ لیکن جب ڈاک خرچ بہت زیادہ ہو گیا، رسالے کی اشاعت کی لاگت سے بھی بڑھ گیا، تب میں نے مجبوراً رسالہ بند کر دیا۔ اس معاملہ میں جدید ادب کے اداریوں اور بعض انٹرویوز اور دوسری تحریروں میں ثبوت موجود ہیں۔ کسی نے طلب کئے تو وہ بھی پیش کر دوں گا۔ یہ بھی نصیب کی بات ہے کہ ''جدید ادب'' خان پور کو ایک دو بندوں نے ۴۵ روپے عنایت کر دیئے تو اس کا اعلان بھی اس انداز میں کر دیا گیا۔ اور ہم جو گھر پھونک کر رسالہ چلا رہے تھے وہ سارا دریا برد ہوا۔

یہاں اپنے ایک انٹرویو کا اقتباس بھی دے دیتا ہوں۔ صورتِ حال مزید واضح ہو جائے گی۔

''ادبی رسائل کے حوالے سے'' عزیز نبیل کے سوالوں کے جواب

سوال نمبر ۸: کیا آپ کو اپنے رسالے کے زیادہ تر نسخے اعزازی طور پر شعراء و ادبا کو روانہ کرنے پڑتے ہیں؟

جواب: زیادہ تر نسخے نہیں جناب۔۔ سارا رسالہ ہی اعزازی جاتا ہے۔ میں نے اپنے رسالے پر قیمت درج ہی نہیں کرائی۔ ایک بار چند دوستوں کے اصرار پر قیمت درج کرائی تو اتنی شرمندگی ہوئی کہ پھر فوراً پہلی ڈگر پر آ گیا۔ ہاں کچھ دوست ڈاک خرچ کے طور پر یا ویسے تعاون کے طور پر کبھی کبھار کچھ عنایت کر دیتے ہیں تو ان کا شکر گزار رہتا ہوں۔ جو مدیرانِ جرائد ادب کے قارئین اور ادیبوں کو اپنا رسالہ سہولت کے ساتھ قیمتاً بھیجتے ہیں، مجھے ان کی کامیابی سے خوشی ہوتی ہے۔

(مطبوعہ **دستاویز** دوحہ، قطر۔ شمارہ نمبر ۲۔ سال اشاعت ۲۰۱۲ء)

☆☆☆ **جدید ادب کی مزید ملامت:** ثمینہ راجہ لکھتی ہیں۔ ''جدید ادب'' واقعی کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے پا کر وقت کٹنے کا کوئی سامان ہو سکے مگر چھپتا بھی تو خان پور سے ہے نا۔ مدیر کی فرمائش پر میرا خیال ہے تمام بڑے لکھنے والے مطبوعہ چیزیں ہی بھجواتے ہیں، غیر مطبوعہ چیزیں معمولی رسالے میں دینے سے ان کی ساکھ پر اثر پڑتا ہوگا۔ حیدر قریشی کی واقفیت بھی زیادہ لوگوں سے نہیں ہے۔''

''جدید ادب'' کی توصیف یا تنقیص کرنا ہر قاری کا حق ہے لیکن یہ تاثر دینا غلط ہے کہ اس میں بڑے لکھنے والے اپنی مطبوعہ چیزیں بھیجتے تھے۔ پہلے شمارہ میں ہی ڈاکٹر سید عبداللہ کا مضمون اردو ادب میں پاکستانیت کے مسئلہ پر تھا اور اسے بعد کے شماروں میں انور سدید اور شمیم احمد جیسے نقاوں نے مزید آگے بڑھایا۔ یہاں زیادہ تفصیل میں جانے کی بجائے ڈاکٹر لدمیلا ہی کی ۱۹ ستمبر ۲۰۱۶ء کی ای میل کا اقتباس پیش کر دیتا ہوں۔ وہ خانپور کے زمانے سے جرمنی کے زمانے تک جدید ادب کو دیکھتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''محترم حیدر قریشی صاحب، آپ کے تفصیل جواب کے لیے بیحد شکریہ۔

جہاں تک 'جدید ادب" کے خانپور کے دور کی بات ہے تو اس کی پوری داستان مجھے معلوم ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور دوسرے اہلِ ادب سے آپ کے روابط، مالی سمیت وہ ساری مشکلات بھی جو آپ کو رسالہ نکالنے کی راہ میں عبور کرنا پڑیں اور آپ کی اَن دیکھی قوتِ ارادی اور استقلال، سب معلوم، اور اس سب کچھ سے میں بہت ہی متاثر ہوئی ہوں۔ برِصغیر سے باہر شائع ہونیوالے جریدوں پر، جو ستر کے عشرے سے لے کر آج تک نکالے جاتے تھے، میرے مطالعہ، جائزہ میں آپ کا کردار اور آپ کا "جدید ادب" مرکزِ توجہ ہے۔ آپ کا ایک مثالی فقرہ جو "جدید ادب" کے شمارہ نمبر ۱۷، ۲۰۱۱ء کے اداریہ میں درج ہے، آپکی ادبی سرگرمیوں کی بہترین وضاحت ہے، جس پر خاص زور دیئے بغیر نہیں رہا جاتا ہے کہ "میں کوئی ادبی خدمت نہیں کر رہا بس اپنی زندگی اور ادبی زندگی بسر کر رہا ہوں"۔ کیا خوب آپ نے کہا۔''

پھر اپنی ۲۰ ستمبر ۲۰۱۶ء کی ای میل میں ڈاکٹر لدمیلا وسیلیو یا لکھتی ہیں۔

''مجھے افسوس ہے کہ اس قدر معیاری رسالہ تاریخ کے طاق پر آیا ہے۔ لیکن جس کے پاس اس رسالے کے کتابی شمارے ہیں اس نے ضرور گھر کی لائبریری میں ان کو ایک نمایاں جگہ پر رکھا ہوگا۔ کم از کم میں اپنی بات بتا رہی ہوں۔ جب کچھ پڑھنے کو جی چاہتا ہے اکثر "جدید ادب" کا کوئی شمارہ اٹھا لیتی ہوں۔ اپنے کام کے لیے بھی کافی مواد ملتا ہے۔''

جدید ادب کے بارے میں ڈاکٹر لدمیلا اور ثمینہ راجہ کے تاثر اور خیال کا فرق صاف ظاہر ہے!

ثمینہ راجہ کا خیال کہ تمام بڑے لکھنے والے ''مطبوعہ چیزیں'' ہی بھجواتے ہیں۔ اس سلسلے میں شمیم احمد جیسے مشکل نقاد کے ایک خط کا اقتباس بھی پیش کرتا ہوں۔ اس سے عمومی صورتِ حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

''آپ نے جمیل جالبی کے معاملہ میں بری طرح پھانس لیا ہے۔ اتنا شدید پھندہ نہ ڈالا کیجئے۔ اخلاقی طور پر آپ اذیت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہر حال کوشش کروں گا کہ آئندہ ماہ فرمائش پوری

کر سکوں۔''

(جدید ادب خان پور شمارہ مارچ ۱۹۸۳ء، ص ۳۰۱)

☆☆☆ **بندے کی اوقات:** ثمینہ راجہ اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

''پہلی انتہا حیدر قریشی ہے۔ آپ نے بہت اچھا کیا روپے اسے بھجوا دیئے۔ تیس چالیس یا سو روپوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ہاں آدمی کی ''اوقات'' معلوم ہو جاتی ہے۔'' (ص ۲۰۶)

''جدید ادب'' کے دو شمارے رجسٹرڈ بھجوائے تھے موصول ہوئے ہوں گے۔ حیدر قریشی صاحب ''کرنیں'' کے نام سے بہاول پور ڈویژن کے شعراء اور شاعرات کے کلام کے انتخاب پر مشتمل ایک مجموعہ چھاپ رہے ہیں۔ مجھے کہتے ہیں اس خیال کا محرک آپ ہیں، میں نے آپ کو ''شفق رنگ'' میں شامل نہیں کیا تھا، مگر اتنا بتا دوں کہ پانچ سو روپے ہر شاعر سے وصول کر چکے ہیں عجیب آدمی ہیں یہ صاحب بھی'' (ص ۲۲۱)

جہاں تک بندے کی اوقات کا تعلق ہے میں خود اس سے بخوبی واقف ہوں۔ میں نے اپنی یادوں کے ایک باب کا عنوان ہی ''بندۂ مزدور کی اوقات'' رکھا ہے۔ جب جدید ادب کا اجرا کیا تھا میری تنخواہ ڈیڑھ سو سے دو سو روپے ماہانہ کے درمیان تھی۔ رضی صاحب نے ابتدائی ڈیڑھ برس میں سو ڈیڑھ سو روپے فی شمارہ اشتہار مہیا کئے۔ باقی بیوی کا زیور بیچ کر رسالہ چھاپتا رہا۔ (حوالہ: خاکہ ''پسلی کی ٹیڑھ'') ویسے اللہ کے فضل سے وہ سارا زیور اسے جرمنی میں بنوا کر دے دیا ہے۔ اب کوئی مائی کا لال دکھا دیں جس نے ایسی بے سروسامانی کے عالم میں ''جدید ادب'' خانپور جتنا ہی رسالہ نکال دکھایا ہو۔ بے شک یہ میرا اپنا شوق تھا لیکن اہلِ نظر اسے گہری نظر سے دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا ایک اقتباس:

''حیدر قریشی کو اردو ادب کی ترویج کا شوق اس وقت پیدا ہوا تھا جب وہ خانپور کی ایک فیکٹری میں محنت مزدوری کرتے تھے۔ غزل کہتے تھے، افسانہ لکھتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے شناسائی ہوئی تو ان کے باطن سے انشائیے کے شگوفے بھی پھوٹنے لگے۔ لیکن ادب کا یہ عمل ان کی ذات تک محدود تھا۔ اردو ادب کی خدمت کے لئے وہ اپنے عمل کے دائرے کو وسیع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خانپور جیسے دور افتادہ مقام سے رسالہ **جدید ادب** جاری کیا۔ فیکٹری سے محنت مشقت سے حاصل کیا ہوا رزقِ حلال اس پرچے کی طباعت اور اشاعت پر خرچ کر ڈالتے۔ تھوڑے عرصہ میں جدید ادب اتنا معیاری پرچہ بن گیا کہ اس دور کے پاک و ہند کے بیشتر اہم ادیب اپنی اعلیٰ تخلیقات **جدید ادب** کو اشاعت کے لئے بھیجنے لگے۔

متعدد نئے لکھنے والوں کو حیدر قریشی نے اعتماد اشاعت عطا کیا۔اور آج وہ اردو ادب کی کہکشاں کے روشن ستارے بن گئے ہیں۔''

(جدید ادب اور حیدر قریشی۔از ڈاکٹر انور سدید۔

مطبوعہ **ادبی صفحہ** روزنامہ **نوائے وقت** لاہور۔۱۹؍دسمبر ۲۰۰۸ء)

یہاں یہ وضاحت بھی کر دوں کہ شفق رنگ اور کرنیں دونوں کتابیں ہی امدادِ باہمی کے ساتھ شائع کی گئیں تھیں۔میرا ابتدائی ادبی زمانہ تھا۔وسائل تھے نہیں مگر کام کرنے کا شوق بھی تھا۔سو دوستوں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا تو سب نے تعاون کیا۔ثمینہ راجہ سے بھی جب بات ہوئی تو میں نے صاف گوئی کے ساتھ انہیں بتا دیا کہ آپ کو اتنا ساتھ دینا ہوگا۔اس میں شاید صاف گوئی ہی عجیب چیز رہی ہے۔

☆☆☆**اہلِ ملامت کی مزید ملامت:** ثمینہ راجہ لکھتی ہیں۔

''حیدر قریشی کی واقفیت بھی زیادہ لوگوں سے نہیں ہے کچھ یہ شخص انانیت زدہ بھی ہے لوگ رسمی طور پر جو چند جملے تعریف کے طور پر لکھ دیتے ہیں اسی پر یہ حضرت پھولے نہیں سماتے۔آپ کیوں ہمت نہیں کرتے ،حیرت شملوی اکیڈمی صرف نام کی اکیڈمی ہے، کچھ کام بھی لیجئے اس سے،کوئی رسالہ نکالئے ،آیئے ہم مل کر رسالہ نکالیں،سید انیس شاہ جیلانی صاحب اور ثمینہ راجہ۔ہم کوئی معمولی لوگ تھوڑے ہیں،بس ہمت کی بات ہے''(ص۲۲۲،۲۲۳)

ایک چیز ہوتی ہے اپنی عزت نفس کا احساس اور ایک چیز ہوتی ہے انانیت۔اگر میں انانیت زدہ ہوتا تو ثمینہ راجہ کے پہلے خط پر ان کا اتنی خوشی اور عزت کے ساتھ استقبال نہ کرتا۔میرے بارے میں خود ان کے بقول:'جب میں نے آپ کے لئے غلط الفاظ استعمال کرنے پر جھاڑا تو حضرت معذرت کرنے لگے'' کیا انانیت زدہ اس انداز میں معذرت کرتے ہیں؟

جہاں تک انیس شاہ جیلانی کے بارے میں میری کسی رائے کا تعلق ہے،اگر ثمینہ نے کسی رائے کا اظہار کیا اور میں نے ان سے اختلاف کیا تو اس میں کیا غلط تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس سلسلہ میں کچھ بھی یاد نہیں۔اگر انیس شاہ جیلانی صاحب،ثمینہ راجہ کے فراہم کردہ میرے خط کی فوٹو کاپی عنایت کر دیں تو ہوسکتا ہے کچھ بھولا بسرا ہوا یاد آجائے۔وگرنہ نہ تو میں کہیں انیس شاہ جیلانی کی راہ میں آتا ہوں اور نہ ہی وہ کہیں میرے رستے میں آتے ہیں۔ہم الگ الگ راہوں کے راہی ہیں۔

اسی خط میں ثمینہ راجہ اپنے تئیں لکھتی ہیں۔''ہم کوئی معمولی لوگ تھوڑے ہیں،''اب پتہ نہیں انانیت زدہ

کون نکلا؟۔کون ہے کتنا گنہگار کہوں یا نہ کہوں!

ضلع رحیم یار خان سے اپنا رسالہ نکالنے کا خیال عمدہ تھا۔ثمینہ راجہ اور انیس شاہ صاحب دونوں صاحبِ حیثیت لوگ تھے۔دونوں مل کر رسالہ نکالتے تو بہت اچھا رسالہ نکال سکتے تھے۔ضلع رحیم یار خان سے اور بھی ادیبوں نے ادبی رسائل نکالے۔کوئی ایک شمارہ نکال پایا،کوئی دوسرے شمارے کے آنے تک ہانپ گیا۔یہ سارے لوگ بڑے باوسیلہ اور بارسوخ لوگ تھے،نجی طور پر بھی اور پبلک ریلیشننگ کے حوالے سے بھی۔لیکن شاید کچھ بات توفیق ملنے کی بھی ہوتی ہے۔میرے بارے میں ثمینہ راجہ کا یہ فرمان بھی دیکھتے ہیں۔''لوگ رسمی طور پر جو چند جملے تعریف کے طور پر لکھ دیتے ہیں اسی پر یہ حضرت پھولے نہیں سماتے۔''

ڈاکٹر لدمیلا کے نام اپنی ای میل درج کر چکا ہوں،اس کا یہ جملہ دہرا دیتا ہوں۔

(میں ایسی خوشیوں پر اپنے جذبات کو چھپاتا نہیں ہوں۔ہمیشہ اپنی خوشی کا بے ساختہ اظہار کرتا ہوں)

اور اب جدید ادب خانپور کے شمارہ ۴ (۱۹۷۹ء) میں چھپنے والے چند ادیبوں کے خطوط،جو بقول ثمینہ راجہ ''رسمی طور پر'' لکھ دیئے گئے۔لیکن سچی بات ہے ایسے خطوط میرے شوق کو ہمیشہ مہمیز کرتے رہے ہیں۔یہ ۸۰ صفحات پر مشتمل تین شماروں کے شائع ہونے کے بعد جید ادیبوں میں جدید ادب کے بارے میں پیدا ہونے والے تاثر کی ایک جھلک ہے۔

سید ضمیر جعفری (اسلام آباد): چھوٹے بھائی! آپ نے تو خانپور سے اتنا عمدہ ادبی جریدہ نکال کر خانپور کو بڑا شہر بنا دیا۔آفرین! میرے سامنے جدید کا وہ شمارہ ہے جس میں میرا مضمون بھی شامل ہے،سوسوائے میرے مضمون کے باقی تمام رسالہ موتیوں کی مالا ہے۔اللہ تمہارے حوصلوں کو جوان رکھے۔

ڈاکٹر وزیر آغا (سرگودھا): آپ کا محبت نامہ ملا،ساتھ ہی جدید ادب کا تازہ شمارہ بھی،جسے پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔خوشی اس لیے بھی ہوئی کہ جدید ادب نے تھوڑے ہی عرصہ میں اپنی شخصیت دریافت کر لی ہے۔اکثر رسائل سالہا سال کی محنت کے بعد اس مقام پر پہنچتے ہیں۔

ممتاز مفتی (اسلام آباد): مضامین آپ ہمیشہ اچھے حاصل کرتے ہیں اور ''ناموں'' والے حیرت ہے کہ کیسے حاصل کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور): خط ملا ساتھ ہی جدید ادب کا شمارہ بھی۔خانپور جیسے دور افتادہ مقام سے ایسے معیاری جریدے کی اشاعت نے خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا۔

علامہ منظور احمد رحمت (ایڈیٹر ویکلی مدینہ بہاولپور): آپ نے جدید ادب کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ ٹھوس بھی ہیں اور صحت مند بھی۔آپ قلم کی آبرو کے محافظ ہیں۔ایسے لوگ خوش نصیب بھی

ہوتے ہیں اور مرجع خلائق بھی۔ راستے کی دشواری، حریفوں کی ملامت گری، وسائل کی کمیابی اور غمِ روزگار کی خلش، یہ سب پُر خلوص انسانوں کے نصیبے میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ منافق اور شوریدہ سران نعمتوں کے جلال و جمال کو کیا جانیں!''

یہ محض رسمی تاثرات نہیں ہیں۔ اگر ان تاثرات کو غور سے پڑھیں تو ان میں معترضین کے کئی اعتراضوں کے بالواسطہ طور پر جواب بھی موجود ہیں۔

☆☆☆لاہور اور کراچی کے حوالے سے وضاحت: ثمینہ راجہ لکھتی ہیں

''یہ تو آپ نے عجیب بات لکھی ہے کہ آپ لوگ یعنی ضلع رحیم یار خان کے لال بجھکڑ اگر مل جائیں تو لاہور، کراچی پر بھاری پڑ سکتے ہیں، حیدر قریشی صاحب بھی یہی بات کہتے ہیں مگر میں متفق نہیں ہو سکتی۔'' (ص ۲۲۲)

میری طرف سے لاہور اور کراچی پر بھاری پڑنے والی بات غلط ہے۔ یہ انیس شاہ جیلانی صاحب کا خیال ہو سکتا ہے۔ میرا موقف یہ رہا ہے کہ بڑے شہروں کے ساتھ چھوٹے شہروں کے ادیبوں کو بھی توجہ اور اہمیت دی جانی چاہئے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی بات ذہن پر نقش ہے۔ ثبوت بھی پیش ہے۔

سوال نمبر4: رسالے کا مختصر تاریخی پس منظر اور محرکات؟

جواب: میں خان پور ضلع رحیم یار خاں میں رہتا تھا۔ تب ادبی رسائل بڑے شہروں سے نکلا کرتے تھے۔ لاہور کے اہلِ ادب چھوٹے شہروں کے ٹیلنٹ کی طرف توجہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ سو چھوٹے شہروں کی طرف سے ادب کے مرکزی دھارے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے کتابی سلسلہ کی صورت میں جدید ادب کا اجرا کیا۔ (**سعید الرحمٰن کے تحقیقی سوالنامہ کے جواب۔ ۲۹ جون ۲۰۱۲ء۔**

مشمولہ کتاب ''انٹرویوز'' مرتب سعید شباب۔ انٹرنیٹ ایڈیشن ص ۲۰۹)

یہی موقف بعد میں ایک اور ہی احساس میں بدل گیا۔ ڈاکٹر نذر خلیق کے ساتھ انٹرنیٹ مکالمہ میں ان کے ایک سوال کے جواب میں، میں نے یہ عرض کیا:

''یہ بات تو میں جدید ادب کے نئے دور کے پہلے شمارہ کے اداریے میں واضح طور پر لکھ چکا ہوں کہ جدید ادب کا اجراء میری ادبی سرگرمی کا حصہ ہے اور ادب میرے نزدیک خود زندگی کی ایک اہم اور بامعنی سرگرمی ہے۔ اس لئے یہ کوئی ادبی خدمت نہیں ہے۔ رسالہ نکال کر ادب کی خدمت

کرنے والے پہلے ہی بہت ہیں۔ میں کوئی ادبی خدمت نہیں کر رہا بس اپنی زندگی اور ادبی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ (''**انٹرنیٹ کے ذریعے مکالمہ ڈاکٹر نذر خلیق۔**

سہ ماہی توازن، مالے گاؤں، شمارہ: ۴۰۔۔۔۔حریمِ ادب، بورے والا۔ کتاب نمبر۲)

☆☆☆پروین شاکر کا ذکر: ثمینہ راجہ ایک خط میں لکھتی ہیں۔

''جدید ادب'' نے میری شاعری پر کچھ خاص نہیں لکھا۔ حیدر قریشی ایک مضمون لکھ رہے تھے مجھ ناچیز پر، مکمل کر لیا تو مجھے بھی دکھایا، میری تعریف کم تھی پروین شاکر کی مذمت زیادہ۔ حیرت ہے پروین نے بڑے بڑوں کو چکرا دیا ہے۔ مجھے بعض اوقات تو بڑا لطف آتا ہے کوئی صاحب اسے آفتاب بنانے پر تلے ہوئے ہیں کوئی ذرہ بھی نہیں سمجھتے۔ میں نے حیدر قریشی سے کہا کہ ''اگر وہ مجھ پر مضمون لکھنا چاہتے ہیں تو پروین شاکر کی مذمت مت کریں، ورنہ براہِ کرم مضمون لکھنے کا ارادہ ترک فرما دیں۔''

اس سلسلہ میں واضح کر دوں کہ ثمینہ راجہ کی شاعری کے بعض حصوں میں جنسی جذبوں کا اظہار بہت شدید تھا۔ ایک نظم کا عنوان تھا ''حریمِ جاں میں وائلن''۔ اب ذرا تصور کریں کہ جنوبی پنجاب کا آخری کونہ، جہاں کی اپنی اخلاقیات اور اپنی تہذیب ہے۔ پھر لڑکی غیر شادی شدہ، (۱۹۶۱ء کی پیدائش کے حساب سے ۱۹۷۹ء میں ۱۹ سال کی عمر ہے)، اور ایسے حالات میں جنسی جذبات کا بے محابا اظہار۔ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی کہ ثمینہ کی شاعری پر اس طرح سے لکھا جائے کہ وہ اپنی فکری تطہیر کی طرف مائل ہو جائیں۔ ''کرنیں'' میں ثمینہ راجہ کے تعارف میں بھی میں نے یہ کاوش کی تھی، ایک اقتباس دیکھ لیں:

''اس کے اندر یقیناً بغاوت کے جذبات ملتے ہیں لیکن اس نے ان جذبات کو بھی مشرقیت کے حصار سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ بغاوت اور مشرقیت کے تصادم سے ثمینہ نے مشرقیت کی فتح کا اعلان بھی کیا ہے اور اپنی تخلیقیت کو بھی جاوداں بنا لیا ہے۔'' (''کرنیں'' ص ۷۳)

یہ سب لکھنے سے میرا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ شعوری طور پر بغاوت سے باز آنا شروع کر دیں اور اپنی معاشرتی تہذیب کے ساتھ شاعری میں آگے بڑھ سکیں۔ یہ چھوٹا سا ثبوت اس بات کا ہے کہ میری تحریر کی نیت اور مقصد واضح ہو جائے کہ میں نے باتوں باتوں میں ان کی باغیانہ سوچ کی تطہیر کرنے کی کاوش کی۔

جب ثمینہ راجہ اسلام آباد چلی گئیں، زمان ملک کے ساتھ شادی ہو گئی، تب ان کی ایک اچھی نظم ''اوراق'' میں شائع ہوئی تھی اور اس پر پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے میں نے اس مفہوم کی رائے لکھی تھی۔ ''جذبات کی تطہیر کے بعد اعتدال کی طرف مراجعت خوش آئند ہے، ثمینہ راجہ کے لیے بھی اور اردو

شاعری کے لیے بھی۔'' ادبی جریدہ ''اوراق'' کے اس زمانے کی فائل کے دو شماروں میں وہ نظم اور میرا خط آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ میری یہ رائے اسی تسلسل کو ظاہر کرتی ہے جو ان کی شاعری میں جنسی جذبات کے بے محابا اظہار کے حوالے سے میرا ابتدائی موقف اور مقصد تھا۔

جہاں تک پروین شاکر کے ساتھ موازنہ کا تعلق ہے، یہ مضمون کا تقاضا تھا۔ ویسے ہی جیسے میں نے پروین شاکر پر مضمون لکھتے وقت کشور ناہید اور فہمیدہ ریاض کے ساتھ اس کا موازنہ کیا ہے۔ اور دونوں سینیئرز پر پروین کو فوقیت دی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے پروین شاکر کی بعض کمزوریوں کو بھی نشان زد کیا ہے۔ یہ مضمون ''شعر و سخن'' مانسہرہ کے پروین شاکر نمبر میں چھپ چکا ہے۔ میرے مضامین کے پہلے مجموعہ ''حاصلِ مطالعہ'' میں شامل ہے۔ ''ہمارا ادبی منظر نامہ'' میں شامل ہے۔ سو پروین شاکر کے بارے میں مجھے اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے، دوسروں کو اختلاف رائے کا حق بھی حاصل ہے لیکن بدزبانی کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ جو بدزبانی کرتا ہے وہ اپنی تربیت کو یا فطرت کو ظاہر کرتا ہے۔

چونکہ ثمینہ نے خود ''ورنہ مضمون لکھنے کا ارادہ ترک فرما دیں'' لکھ دیا تھا، چنانچہ میں نے مضمون ضائع کر دیا۔ میری کاوش ناکام ہوئی۔ ثمینہ راجہ نے بغاوت کو فوقیت دی اور پھر وہ المیہ رونما ہوا جو بالآخر کم عمری میں ہی ان کی موت پر منتج ہوا۔ بغاوت کرنے کے بعد وہ سماج سے لڑتے لڑتے کینسر کا شکار ہو گئیں۔ ۵۱ سال کی ہوئیں اور ۵۲ ویں سال میں قدم دھرتے ہی راہیٔ ملکِ عدم ہو گئیں۔ اللہ مجھے بھی معاف کرے اور ثمینہ راجہ کو بھی معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین

☆☆☆ **ذلیل حرکت اور لعنت بھیجیں:** پروین شاکر والے بیان کے تسلسل میں ثمینہ راجہ مزید لکھتی ہیں۔

''کسی شخص کو خوامخواہ اس کے مقام سے گرانے کی کوشش کرنا سخت ذلیل حرکت ہے۔ میں بھلا اپنی دکان چمکانے کے لئے کسی کو کیوں نیچا دکھانے کی کوشش کروں، مجھے تو یہ بالکل پسند نہیں، اب میرا خیال ہے انہوں نے مضمون ہی رکھ چھوڑا ہے، گروپ بازی کی لعنت ہمارے ادب پر مسلط ہو چکی ہے''

(ص ۲۲۳)

میں پروین شاکر کے بارے میں جو اچھی بری رائے رکھتا ہوں، وہ مطبوعہ موجود ہے اور یہ میرے ادبی اظہار کا حق ہے۔ کسی شخص کو اس کے مقام سے گرانے کی کوشش تو خود ثمینہ نے سرِ عام کی تھی۔ جب وہ فیس بک پر ریحانہ قمر اور نوشی گیلانی کی مذمت کر رہی تھیں، انہیں نیچا دکھانے کے لیے اس حد تک کوشش کر رہی تھیں کہ خود فریق ثانی کے الزامات سے لہولہان ہو گئی تھیں، تب کون سی ادبی خدمت ہو رہی تھی؟ میں

اس لڑائی کے پس منظر میں نہیں جاؤں گا۔ وہ تب بھی میرے مشورے مان لیتیں تو اتنا بڑا تماشا نہ بنتیں۔

گروپ بازی کے سلسلہ میں میرا موقف ''لعنت'' بھیجنے والا نہیں ہے۔ میرا موقف دیکھ لیں۔

''ادبی گروہ بندیاں ہر دور میں رہی ہیں ہمارے قدیم شعراء ایک دوسرے کے خلاف ہجویات ہی نہیں لکھتے رہے، فرضی جنازے بھی نکالتے رہے ہیں۔ آج وہ دور ہے جب ہمارے معاشرے میں دکانداروں، موچیوں اور نائیوں تک کی انجمنیں بنی ہوئی ہیں۔ سوٹر یڈ یونین کے اس دور میں ادیبوں نے بھی اپنے اپنے گروہ بنا لئے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ گروہ بندی اگر تخلیقی لحاظ سے مسابقت حاصل کرنے کے جذبے کو پروان چڑھائے تو ادب کے لئے بے حد مفید ہے لیکن اگر مادی مقاصد کے حصول کی دوڑ جیتنے کے لئے گروہ بندی ہے تو وہ اچھی چیز نہیں ہے۔ اردو ادب میں اگرچہ تخلیقی مسابقت حاصل کرنے والا جذبہ بھی موجود ہے تاہم مادی مقاصد کے حصول کی افسوسناک مثالیں زیادہ ہیں۔''

(ثریا شہاب کا حیدر قریشی سے انٹرویو۔ ڈیلی جنگ لندن۔ شمارہ ۷ نومبر ۱۹۹۶ء۔ ادبی صفحہ)

المیہ یہ ہے کہ ثمینہ خود انیس شاہ جیلانی کے ساتھ مل کر بھی اپنا گروپ بنانے کی کوشش کر رہی تھیں اور اسلام آباد جا کر بھی انہوں نے جن افراد کے ساتھ تعلق رکھا وہ یا تو مسندِ اقتدار کے قریب تھے یا خود انتہائی مال دار تھے۔ دونوں صورتوں میں مادی مقاصد کا حصول آسان بنا رہا۔

اگلے خط میں ثمینہ راجہ لکھتی ہیں:

''حیدر قریشی کا خط تلاش کرنا پڑے گا اتنے بہت سے خطوط میں لیکن میں بھجوا ہی دوں گی۔ آپ ذرا اس شخص کا لہجہ ملاحظہ فرمائیے گا، مجھے زندگی بھر کسی شخص پر اتنا غصہ نہیں آیا۔ آپ سوچتے ہوں گے پھر اس سے خط و کتابت کیا ضروری ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو سانپ کے منہ میں چھچھوندر کا معاملہ ہو گیا ہے۔ جب میں نے آپ کے لئے غلط الفاظ استعمال کرنے پر جھاڑا تو حضرت معذرت کرنے لگے لیکن میں نے تہیہ کیا ہے کہ اب ختم۔'' (راشد اشرف صاحب کی ارسال کردہ ''پکچرے'' پر صفحہ نمبر درج نہیں ہے۔)

''حیدر قریشی کا کوئی اور خط مجھے ملا نہیں، کاغذوں میں ادھر ادھر ہو گیا ہوگا، تحریر تو آپ نے اس شخص کی دیکھ لی، انداز گفتگو بھی ملاحظہ فرما لیا، اب لعنت بھیجئے۔'' (ص ۲۲۸)

اگر انیس شاہ جیلانی صاحب ثمینہ راجہ کے نام میرے خطوط میں سے دستیاب خطوط فراہم کر دیں تو واضح ہو جائے گا کہ میرا لہجہ کیسا تھا۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ میں کسی خط میں بھی تہذیب سے نیچے نہیں

گرا۔ ''ذلیل حرکت'' اور ''لعنت بھیجیں'' جیسے الفاظ ثمینہ راجہ کے قلم سے زیب نہیں دیتے۔ اوپر سے انہوں نے ''سانپ کے منہ میں چھچھوندر'' لکھ کر خود ہی سانپ کا منصب سنبھال لیا ہے۔ محاورتاً سہی لیکن ان کے لیے سانپ کا لفظ مجھے اس وقت بھی اچھا نہیں لگ رہا۔ حالانکہ ان کے لب و لہجہ اور ان کی لفظیات میں خاصا زہر ہے، پھر بھی ان کے ساتھ سانپ کا لفظ اچھا نہیں لگ رہا۔

ثمینہ راجہ کے ساتھ جتنا تعلق رہا، یا بے تعلقی رہی اس سارے دورانیہ میں میری طرف سے ایسا کچھ نہیں لکھا گیا جس میں ان کی اہانت کا شائبہ تک ہو۔ میں نے ان کی نسبت عزت کا رویہ ہی ظاہر کیا یا پھر خاموشی اختیار کی۔ اگر کوئی شخص آپ کی عزت کرتا ہو اور آپ بے سبب اس کی اہانت پر تل جائیں تو جلد یا بدیر ایسے لوگوں کے ساتھ قدرت کا نظام کچھ نہ کچھ ضرور ظاہر کرتا ہے۔

اپنی طرف سے اس وضاحتی مضمون کے ساتھ میں اپنا اور ثمینہ راجہ کا معاملہ ادبی تاریخ اور اللہ کے سپرد کرتا ہوں!

اضافی نوٹ:

☆☆☆۱۔ اگر راشد اشرف صاحب نے ثمینہ راجہ کے خطوط کے مزید صفحات فراہم کیے تو اس مضمون کو اپ ڈیٹ کرلوں گا۔ ضرورت پڑی تو ایک اور مضمون بھی لکھا جا سکتا ہے۔

☆☆☆۲۔ ڈاکٹر لدمیلا وسیلیو یا کے ساتھ خط و کتابت کو ان کی اجازت سے اپنے ایک مضمون ''ڈاکٹر لدمیلا کی دو نئی کتابیں'' میں شامل کر چکا ہوں۔

عکاس انٹرنیشنل اسلام آباد۔ شمارہ ۲۶۔ مئی ۲۰۱۷ء

اردو ہم عصر۔ ڈنمارک

http://www.urduhamasr.dk/dannews/index.php?mod=article&cat=Literature&article=1834

پنجند۔ آسٹریلیا

http://punjnud.com/Aarticles_detail.aspx?ArticleID=1292&ArticleTitle=Guzarash%20e%20Ahwal%20e%20Waqaee

اردو افسانے کی اولیت کی تحقیق کا مسئلہ

اسلام آباد کے افسانہ سیمینار میں منشایاد نے مسعود رضا خاکی کے حوالے سے اولین اردو افسانہ ۱۹۰۳ء میں راشد الخیری کے ''نصیر اور خدیجہ'' کو قرار دیا تھا۔ اور اس کے لئے مرزا حامد بیگ کی ایک مرتب کردہ کتاب کا حوالہ دیا تھا۔ اس کے بعد جب روزنامہ جناح اسلام آباد کی ۱۰ فروری کی اشاعتِ خاص میں افسانے کے سو سال کے حوالے سے افسانہ نگاروں کے تاثرات شائع کئے گئے تو اس میں مرزا حامد بیگ کے اس بیان سے کنفیوژن پیدا ہوا۔ انہوں نے ۱۹۰۳ء میں اولین افسانہ کی تحقیق کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرمایا:

''میرے لئے تو خاص جذبات ہیں کہ **میری تحقیق کے مطابق** افسانے کے سو سال اب پورے ہوئے۔ مجھ سے بڑھ کر کوئی خوشی محسوس نہیں کر سکتا۔''۔۔۔

مرزا حامد بیگ کی خوشی بجا ہے اور ان کے جذبات بھی قابلِ قدر ہیں لیکن اب محمد حمید شاہد کی کل کی لاہور کی افسانہ تقریب کی رپورٹ دیکھ کر وہ بات زیادہ واضح طور پر سامنے آئی جو منشایاد کے ابتدائیہ میں موجود ہونے کے باوجود زیادہ توجہ نہیں کھینچ سکی تھی۔ محمد حمید شاہد کی رپورٹ کے مطابق:

یاد رہے مرزا حامد بیگ ڈاکٹر مسعود خاکی کی اس تحقیق کے پرجوش حامی ہیں۔ ڈاکٹر مسعود خاکی نے اپنے تحقیقی مقالہ ''اردو افسانے کا ارتقاء'' ۱۹۶۵ء میں مکمل کیا تھا جس پر انہیں پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ڈاکٹریٹ کا اعزاز دیا گیا۔ اس مقالے کے تیسرے باب میں ''اردو کا پہلا افسانہ نگار'' کا عنوان قائم کر کے ڈاکٹر مسعود خاکی نے لکھا ہے کہ:

علامہ راشد الخیری (محمد عبدالرشید دہلوی) کا سب سے پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' ۱۹۰۳ء میں مخزن میں چھپا۔

سید سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ ۱۹۰۷ میں شائع ہوا جو طبع زاد نہیں تھا۔

خواجہ حسن نظامی نے افسانہ نگاری کا آغاز ۱۹۱۰ کے بعد کیا۔

منشی پریم چند (نواب رائے) کا پہلا افسانہ ''روٹی رانی'' ۱۹۰۷ میں شائع ہوا تھا جو ترجمہ تھا تاہم اسی سال ان کا طبع زاد افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' بھی شائع ہوا تھا۔

اسی تحقیق کو بعد ازاں تسلیم کر لیا گیا۔ مرزا حامد بیگ نے بھی اسی تحقیق کو درست جانا۔ ڈاکٹر مسعود خا کی کا یہ مقالہ کتابی صورت میں مکتبہ خیال لاہور سے اگست ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا اس کتاب کا انتساب بھی ان کی تحقیق کے حوالے سے یوں ہے

''علامہ راشد الخیری کے نام جنہوں نے اردو کا پہلا افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' لکھا''

اس وضاحت اور مرزا حامد بیگ کے بیان سے کنفیوژن پیدا ہو رہا ہے۔ اگر مسعود رضا خا کی نے اپنا تحقیقی مقالہ ۱۹۶۵ء میں مکمل کر لیا تھا اور اس میں واضح طور پر علامہ راشد الخیری کے افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کو اردو کا پہلا افسانہ قرار دیا گیا تھا تو پھر مرزا حامد بیگ کا اسے اپنی تحقیق قرار دینا عجیب سا لگتا ہے۔ حیرت ہے کہ انہوں نے روزنامہ جناح میں اپنے تاثرات میں وقار عظیم اور سید معین الرحمٰن کی تحقیق کا ذکر کر کے ان کو رد تو کیا ہے لیکن یہ کہیں ذکر نہیں کیا کہ میں جسے ۱۹۰۳ء کا پہلا افسانہ نگار کہہ کر اپنی تحقیق قرار دے رہا ہوں، اس تحقیق میں مسعود رضا خا کی کا کوئی حصہ ہے۔ ممکن ہے اخبار میں کتابت کی غلطی سے کوئی حصہ حذف ہو گیا ہو۔ اس لئے امید ہے مرزا حامد بیگ خود اس سلسلے میں وضاحت فرمائیں گے کہ اس تحقیق میں مسعود رضا خا کی کا کتنا حصہ ہے اور ان کا اپنا کیا حصہ ہے۔ تا کہ تحقیقی زاویے سے کوئی کنفیوژن نہ رہے۔ شکریہ!

۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء

ناصر عباس نیر

میں نے جناب حیدر قریشی کی بحث دیکھی ہے جو انہوں نے اردو کے پہلے افسانے کے بارے میں کی ہے۔ حامد بیگ صاحب کا دعویٰ غلط ہے کہ راشد الخیری کو انہوں نے اردو کا پہلا افسانہ نگار ثابت کیا ہے۔ اس ضمن میں عرض ہے کہ اردو میں پہلا ترجمہ شدہ افسانہ یلدرم (سجاد حیدر یلدرم) نے ۱۹۰۱ء میں لکھا تھا اور راشد الخیری ۱۹۰۳ء میں طبع زاد لکھا تھا۔ یہ تحقیق ڈاکٹر مسعود رضا خا کی کی ہے اور اس سے اتفاق ڈاکٹر

انوار احمد نے بھی کیا ہے جنھوں نے اردو افسانے پر بہت اچھا کام کیا ہے۔ انہوں نے مخزن کا وہ شمارہ (دسمبر ۱۹۰۳ء، شمارہ ۲، جلد ۶) بھی تلاش کرنے کا دعویٰ کیا ہے جس میں یہ افسانہ ''نصیر اور خدیجہ'' کے نام سے چھپا تھا۔

۲۳ مارچ ۲۰۰۴ء

نوٹ: اردو افسانے کی اولیت کی تحقیق کے مسئلہ پر سائبر ادبی حلقہ **اردو رائٹرز ایٹ یاہو گروپس** پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ صاحب سے جو استفسار کیا گیا تھا اس کا جواب وہاں نہیں مل سکا۔ شاید ڈاکٹر صاحب انٹرنیٹ پر اردو میں رابطہ نہیں کر سکتے۔ امید ہے اب **جدید ادب** میں چھپنے کے بعد ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اس حوالے سے اپنی وضاحت عنایت فرمائیں گے، جدید ادب کے صفحات حاضر ہیں۔

حیدر قریشی

جدید ادب جرمنی۔ شمارہ نمبر ۳۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۴ء

جدید ادب کے اسی شمارہ نمبر ۳، میں منشا یاد اور افتخار عارف کے مذکورہ مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں۔

جدید ادب جرمنی کے تین اداریے

اداریہ

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو ادب میں ''پیروئ مغربی'' کا رجحان غالب تھا۔اس کے نتیجہ میں بعض نئی اصناف متعارف ہوئیں اور اردو ادب کا حصہ بنیں۔ نئے افکار و خیالات نے بھی ادب پر اپنے اثرات مرتب کئے لیکن ایک عرصہ کے بعد ''پیروئ مغربی'' کا رویہ فیشن اور نقالی کی حد تک چلا گیا۔ مغربی معاشرے کے اپنے تقاضے اور اپنی ترجیحات ہیں اور ہمارے معاشرے کی تمام تر خامیوں کے باوجود کچھ اپنی روایات ہیں۔علوم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ایک زمانے سے مختلف اقوام ایک دوسرے کے علوم سے استفادہ کرتی آ رہی ہیں۔لیکن جب اچھے بھلے دانشور اور تخلیقی اذہان بھی دوسروں کے افکار اور ادب کی محض نقالی کرنے لگیں تو اس سے نہ تو وہ کسی عالمی سطح پر خود کو جوڑ پاتے ہیں اور نہ ہی اپنی مقامی جڑیں مضبوط رکھ پاتے ہیں۔

مغربی دانشوروں نے ایک طویل عرصہ تک مشرقی افکار و خیالات سے استفادہ کیا ہے لیکن ان سے فیض یاب ہونے کے باوجود انہوں نے نقالی کی راہ نہیں اپنائی جبکہ ہمارے ہاں یہ المیہ ظاہر ہوا کہ ہمارے بعض دانشور اور تخلیق کار مغربی چکا چوند سے مرعوب ہو کر ان کا ''ترجمہ'' بن کر رہ گئے۔ادب کے کسی بھی بڑے دھارے میں ہماری شمولیت ہماری اپنی مقامیت اور اپنی جڑوں کی بنیاد پر ہونی چاہئے۔ متعدد منفی رویوں کے دوش بدوش ہمارے ہاں یہ صحت مند رویہ بھی دیکھنے میں آیا کہ ہمارے بعض دانشوروں اور تخلیق کاروں نے مغربی افکار سے استفادہ تو کیا لیکن ان کے نتائج اپنے طور پر اخذ کئے۔مغربی اصناف سے اردو زبان کو فیض یاب تو کیا لیکن اس انداز میں کہ ان اصناف کو اپنی دھرتی سے جوڑا، ان اصناف کے بنیادی خدوخال کو قائم رکھتے ہوئے ان پر اپنا مقامی رنگ چڑھایا اور یہ سب کچھ تخلیقی ریاضت کے ساتھ کیا۔

اور اب کہ بیسیوں اپنے اختتام کے آخری کنارے پر کھڑی ہے تو اردو ادب میں یہ خوش کن منظر

دیکھنے میں آ رہا ہے کہ پیروئ مغربی کے رویے کے ساتھ ساتھ ہمارے دانشور اور تخلیق کار اپنی مقامیت اور اپنی لوک جڑوں کی طرف بھی خصوصی توجہ کرنے لگے ہیں۔بیسویں صدی کی آخری دہائی میں پنجاب کے لوک گیت ماہیے کی اردو ادب میں وسیع پیمانے پر پذیرائی اسی رویے کی ایک روشن مثال ہے۔توقع کی جا سکتی ہے کہ ہمارے تخلیق کار اپنی مقامیت کی طرف مزید توجہ کریں گے، اس اعتماد کے ساتھ کہ ان کی جو بھی عالمی شناخت بنے گی، اپنی مقامیت اور اپنی جڑوں سے پھوٹنے والی شناخت سے ہی بنے گی۔

جدید ادب جرمنی۔شمارہ نمبر ا۔مئی ۱۹۹۹ء

جدید ادب جرمنی کے پہلے دور میں صرف دو شمارے شائع ہو سکے تھے۔یہ پہلے شمارے کا اداریہ ہے۔

گفتگو!

اردو زبان کے اس وقت تین بڑے مراکز قرار دیئے جا سکتے ہیں۔پاکستان، ہندوستان اور برِصغیر سے باہر کی تمام بکھری ہوئی پاکٹس۔تینوں میں بحیثیت زبان اردو کو اپنی بقا کے مسائل کا سامنا ہونے کے باوجود ان کی نوعیت خاصی الگ الگ سی ہے۔ہندوستان میں سیاسی وجوہ کی بنا پر چند مخصوص لابیوں کی طرف سے اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دے کر مارنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود اردو ابھی تک اپنے سخت جان ہونے کا ثبوت دے رہی ہے۔پاکستان میں باوجود اردو کو قومی زبان ماننے کے عملاً اسے 'عوام کالانعام' تک ہی رکھا گیا ہے۔مقتدر اشرافیہ طبقہ نے انگریزی کو ہی اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے اور اسی کے وسیلے سے ہی کوئی سماجی ترقی اور سیاسی فیض حاصل کیا جا سکتا ہے۔یوں پاکستان میں اردو کی سلامتی کو کوئی خطرہ نہ ہونے کے باوجود اس کی زبوں حالی ہندوستان میں اردو کی صورتحال سے بھی زیادہ بڑا المیہ ہے۔

ہندوستان میں جہاں اردو دشمنی میں اسے مسلمانوں کی زبان قرار دینے کی کوشش کی گئی وہیں مسلمان ادیبوں نے بھی ناانصافی پر غم و غصہ کے باعث اردو کو مسلمانوں کی زبان مان کر مذہب کی طرح اس کے تحفظ کو جزوِ ایمان بنا لیا۔لیکن دوسری طرف یہ انوکھا منظر بھی ہے کہ ہندوستان کا بنگال تو اردو کا قلعہ بنا ہوا ہے اور مسلمان بنگلہ دیش میں کوئی اردو بولنے والا ڈھونڈے سے بھی شاید ہی ملے گا۔چند برس

پیشتر ماریشس میں اردو کو مسلمانوں کی زبان کے طور پر آگے لایا جانے لگا تو وہاں باقاعدہ ایک عرب ملک کی امداد سے اردو کے مقابلہ پر عربی کو مسلمانوں کی زبان کے طور پر بڑھاوا دینے کی مہم شروع کر دی گئی۔ یوں اردو کے فروغ کی مہم کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

عربی بولنے والے ممالک میں اردو کے پھلنے پھولنے کی تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے۔ لیکن مغربی ممالک میں جہاں ساؤتھ ایشیا کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد آباد ہے، ان کے بچوں میں اردو کے نفوذ کے امکانات بہت کم رہ گئے ہیں۔ اگرچہ نائن الیون کے واقعہ کے بعد بعض گھروں میں اپنی جڑوں کی فکر کرنے کے نتیجہ میں اپنی زبان کی طرف بھی دھیان گیا ہے اور اس کے لئے کچھ کرنے کی خواہش بھی بڑھی ہے لیکن عملاً یہاں کی نئی نسل کا اردو کے تئیں وہی رویہ ہے جو ہندوستان میں اردو کے کئی نامور شاعر و ادیب گھرانوں کی اولاد کا ہے۔ ان شاعروں اور ادیبوں میں ممتاز ترقی پسند بھی شامل ہیں اور جدید بھی، جن کی اولادیں اردو سے نابلد ہو چکی ہیں، ہوتی جا رہی ہیں،

کیا اردو کے تینوں مراکز کی کوئی ایسی کانفرنس بلائی جا سکتی ہے جو منتظمین کی ذاتی نمود و نمائش سے اُٹھ کر عملاً اردو کو درپیش ان مسائل کے حل کے لئے ٹھوس اقدامات طے کرے اور تینوں سطحوں پر پھر اس کے لئے مثمر بہ ثمرات عمل کیا جا سکے؟ اگر ایسا ہوتا ہے تو ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس کے بعد یہ دوسری ایسی کانفرنس ہوگی جو نشستند، خوردند، برخاستند سے بڑھ کر اردو زبان کے لئے واقعتاً کچھ کر سکے گی۔ لیکن کیا اردو کی بقا اور ترقی چاہنے والے اس حیثیت میں ہیں کہ ایسا سب کچھ کر سکیں؟ اردو ادب کی بقا اردو زبان کی بقا اور ترقی ہی سے وابستہ ہے۔

جدید ادب جرمنی۔ شمارہ نمبر ۸۔ جنوری تا جون ۲۰۰۷ء

گفتگو!

ادب میں سامنے کی حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت تک رسائی کی تخلیقی کاوش ایک طرح سے صوفیانہ رویہ رہا ہے۔ موجود مادی کائنات کے پارٹیکلز کی تہہ میں اس کے عقبی بھید موجود ہیں لیکن تا حال سائنس پارٹیکلز سے کوارکس (کلرز) تک پہنچ کر رُک جاتی ہے اور اس سے آگے اس کے ہونٹوں پر بھی ایک

حیرت انگیز مسکراہٹ ہی رہ جاتی ہے۔ ہمارے جو صاحبانِ علم مادی دنیا سے ماورا کسی حقیقت کو مجہولیت سمجھتے ہیں، انہیں اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ ذہن میں رہے کہ ماورائیت کی پرچھائیوں کو مس کرنے کا تجربہ نہ رکھنے والے صاحبانِ علم اپنے علم کی حد کو کائنات کے بھیدوں کی آخری حد نہ سمجھیں۔ ایسے احباب کو ان کے مادی ذہن کے مطابق ہی بتانا مناسب ہے کہ انسانی دماغ کی کارکردگی کو دیکھیں تو اس کا ۱۰ فی صد ہی ابھی تک کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اس ۱۰ فی صد دماغی کارکردگی نے انسان کو کتنی حیرت انگیز ترقیات کے دور تک پہنچا دیا ہے۔ اس سے دماغ کا جو ۹۰ فی صد حصہ بظاہر خاموش پڑا ہے، اس کی بے پناہی کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اچھے تخلیق کاروں کو اس ۹۰ فی صد سے کبھی کبھار جو کچھ ملتا ہے، اس کا اندازہ تخلیق کار ہی کر سکتے ہیں۔ سو ماورائیت تو ہمارے باہر بے پناہ کائنات سے لے کر ایٹم کے اندر اس کے بلڈنگ بلاک کی تلاش تک مسلسل موجود ہے۔ اور انسانی دماغ کا ۹۰ فی صد خاموش حصہ بجائے خود ہمارے اندر ماورائیت کی کارفرمائی کا زبردست ثبوت ہے۔

ماورائیت کے نام پر یا صوفیانہ رمزیت کے نام پر اگر بعض لوگ سطحی یا بے معنی تحریریں پیش کر رہے ہیں تو اس نقلی مال کا مطلب بھی یہ نکلتا ہے کہ اصل بھی موجود ہے۔ اصل کرنسی ہوتی ہے تو اس کی جعلی کرنسی بنانے والے اپنا کام دکھاتے ہیں۔ حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت کی جستجو رکھنے والوں کو ایک طرف تو مذہبی نظریہ سازوں کا معتوب ہونا پڑتا ہے دوسری طرف وہ لوگ بھی ان کے درپے رہتے ہیں جو بظاہر خود کو مذہبی نظریہ سازی کے استحصالی طرز کا مخالف کہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات ہے کہ حقیقت کے عقب میں موجود حقیقت اور زندگی کو اس کے وسیع تر مفہوم میں جاننے کی کوشش کرنے والوں کو دونوں طرف کے لوگوں سے ایک جیسی ملامت کا سامنا کرنا پڑتا ہے بلکہ مذہبی نظریہ سازوں کے مخالف ترقی پسندوں کا رویہ تو بعض اوقات خود مولویانہ طرزِ عمل سے بھی زیادہ مولویانہ ہو جاتا ہے۔ امید ہے ہمارے ایسے صاحبانِ علم اپنے رویوں پر نظر ثانی کریں گے۔

جدید ادب جرمنی۔ شمارہ نمبر ۱۱۔ جولائی تا دسمبر ۲۰۰۸ء

بحث ونظر

مکالمہ بحوالہ کتاب
''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق''
اوراس کتاب کا جائزہ

ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں

۲ مارچ ۲۰۱۶ء سے ۱۴ مارچ ۲۰۱۶ء تک ہونے والا

مکالمہ

عمر فاروق (کینیڈا)۔۔۔حیدر قریشی (جرمنی)
umarfarooq33@yahoo.com
haider_qureshi2000@yahoo.com

عمر فاروق بنام حیدر قریشی

Mar 2 at 11:49 AM

Hello,

I want to send a book on "Historical Facts About Semitic Arab Nations" for review. It's Urdu rendering of Dr. Ismail Ahmad Adham's Arabic articles which were written with critical approach, keeping in view the historical research methodology, and are not just description of different historical narratives of transmitters.

The brief introduction of author is given below:

"Dr. Ismail Ahmad Adham (1911–1940) was an Egyptian scholar of Turkish origin who was essentially a mathematician and physicist for having doctorate in both the subjects. In addition, he was fully adept in literary criticism, history and theology,

having direct access to the basic sources in as many as eight languages of the East and the West, had they been published or yet in form of manuscripts; the reason that raised him prominent among his contemporaries. But soon after his sad demise in 1940, he and his work suddenly became unknown to his own fellow countrymen. Some thirty years later Dr. Ahmad Ibrahim al-Hawari, an Egyptian researcher, undertook the task of collecting Dr. Adham's articles scattered in different journals (other than his published and unpublished treatises in Arabic as well as in other languages) and Cairo's famous publishing house Dar-ul-M'arif published them in three volumes. The articles translated here in this book are taken from the third volume titled: Qadaaya Wa Munaaqshaat published in 1986."

If Dr. Gopi Chand's book on Structuralism was reviewed critically and the reality about author and narratives was discusssed scholarly by one of "Jadeed Adad" contributors, Dr. Ismail critically discussed Arab Semitic History just like that as you will see in his critique on "The Life of Muhammad" by Muhammad Hussain Haikel. Hope to find someone adept in historical methodology to review Dr. Adham's articles and the way they conveyed in their rendition to Urdu historians/ readers.

Please give positive response to send you the book and whether in its PDF file only or by ordinary mail as well. It's printed in Toronto by Shawn Graphics.

Thank you,

Umar Farooq

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 2 at 4:23 PM

آپ کتاب بھیج دیں، پڑھنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا۔ کتاب پی ڈی ایف کے ساتھ ان پیج فائل میں بھی مل جائے تو لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔

باقی دیکھتے ہیں۔

حیدر قریشی

عمر فاروق بنام حیدر قریشی

Mar 2 at 7:13 PM

Hello Haider Qureshi Sb.

Unfortunately, I've only PDF file of the book available right now. Inpage file is not accessible for me at the moment. I'll send it to you soon as well. Please find in attachment the PDF file of the book "Saami Arabi Taareekh Sey Chand Haqaaiq". Please acknowledge the receipt of this email with attachment.

Umar Farooq

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 2 at 8:50 PM

پی ڈی ایف فائل مل گئی ہے، شکریہ

کل اسے پڑھنا شروع کروں گا، انشاءاللہ۔

ان پیج فائل میں یہ سہولت ہوتی ہے کہ پڑھتے ہوئے مطلوبہ حصوں کو ساتھ ساتھ رنگین کرتے جاتے ہیں۔

آپ کس ملک/شہر میں ہیں؟

ہوسکتا ہے مطالعہ کے دوران آپ سے بات کرنا پڑے۔

حیدر قریشی

عمر فاروق بنام حیدر قریشی

Mar 2 at 10:49 PM

مکرمی حیدر قریشی صاحب،

عرض ہے کہ میں کینیڈا کے شہر اوک ول، جو گریٹر ٹورنٹو کا حصہ شمار ہوتا ہے، میں مقیم ہوں۔ میرا فون نمبر ہے: 289-834-3295 اس کے شروع میں کنٹری کوڈ ایک شامل ہو جائے گا۔

کتاب کا ان پیج مسودہ دستیاب ہو گیا ہے، جو اس ای میل کے ساتھ اٹیچ ہے۔ آپ کتاب دیکھ لیں۔ پھر آپ سے بات ہو گی۔

میرا ایک ترجمہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے۔ پورب اکادمی اسلام آباد سے۔ "جانبداری: جدید تناظر میں ایک مطالعہ"۔ وہ کتاب اگر اپنے مصنف کے انفرادی ذوق کی حامل تھی، تو موجودہ ترجمہ علمی تحقیقی نقطہ نظر پر مبنی ہے۔ ایک اور مصری مصنف کی کتاب کے ترجمے کا منصوبہ بھی ہے بعنوان: "ہمارا فکری ورثہ: عقلی

اور غیر عقلی رویے"۔

اسی طرح فی الحال منصوبہ ہے کہ شام کے مشہور دانشور شاعر اڈونیس کے پی ایچ ڈی کے تھیسس کی کتابی شکل کا ترجمہ بھی کیا جائے بعنوان: "ثبات اور تغیر: عربوں کے ہاں تقلیدی اور تخلیقی رویے"۔

میں بنیادی طور پر عربی زبان کا ٹیچر رہا ہوں، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں۔ وہاں چودہ سال ٹیچنگ اور ریسرچ میں عزیز و غیر عزیز ہونے کے بعد بغیر کسی ملامت کے کوئے جاناں کا شوق چرایا، اور امیگریشن کے بعد عرصہ ایک سال سے کینیڈا میں پرمانٹ ریزیڈنٹ کے طور پر رہ رہا ہوں۔ مذکورہ سارے منصوبے وہاں کے تھے۔ یہاں:

دن جھمیلوں میں گزر جاتا ہے
رات تکرار میں کٹ جاتی ہے
مے کدہ مل گیا تو خوب رہی
ورنہ آزار میں کٹ جاتی ہے
آخرش کوئی ہو معنی پیدا
عمر بیکار میں کٹ جاتی ہے
اک تماشا یہ حیات دنیا
سیر و دیدار میں کٹ جاتی ہے

عمر فاروق

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 3 at 3:27 PM

آپ کا فون نمبر ریذیڈینس کا ہے یا موبائل کا؟
گھر کا ہے تو میں آج شام تک بات کر سکوں گا۔

حیدر قریشی

عمر فاروق بنام حیدر قریشی

Mar 3 at 4:38 PM

Unfortunately, I've mobile number only.

You can email me about what you need to discuss.

I've also an unpublished article titled "Urdu Balaaghat: Akhz o Istimdaad Aur Tareekh"

It's a research article. Please do read it carefully as well along with given footnotes if you have enough time, and let me know if you can publish it in Jadeed Adab.

You have a literary magazine, but I'm asking you that because it is not published since 2014. Neither in Meyar of Urdu Department at IIU Islamabad, nor in Bazyaft at University of the Punjab despite Dr Nasir Nayyer's consent to that, may be because of the first detailed footnote about university politics of articles, and I insisted it to be published it as was.

It's last part consists of a brief critique on Abid Ali Abid's devised new definition of "Ilm-ul-Bayaan".

It's PDF copy is attached herewith.

Umar Farooq

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 3 at 5:31 PM

ابھی اسماعیل صاحب کو پڑھ رہا ہوں۔ نیا مضمون کتاب کے بعد دیکھوں گا۔

اسماعیل صاحب کی کتاب کا ٹائٹل جے پی جی فائل میں مل جائے تو اس کتاب کو کسی ویب سائٹ پر پبلش کرا دوں گا۔

آپ کا نیا مضمون بھی انٹرنیٹ پر شائع کرایا جا سکتا ہے۔ آپ خود اپنا بلاگ کیوں نہیں بنا لیتے؟

ہاں۔۔ میں نے واٹس ایپ پر آپ کو ایڈ کرنے کی کوشش کی ہے۔ شاید آپ اس سسٹم کو استعمال نہیں کر رہے۔

حیدر قریشی

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 3 at 10:16 PM

محترمی عمر فاروق صاحب

سلام مسنون

اسماعیل احمد ادھم صاحب کے چاروں مضامین پڑھ لیے ہیں۔ایک بار پھر انہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔اس کے بعد تبصرہ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا علم البلاغت والا مضمون سرسری دیکھا ہے۔اگر اسے انٹرنیٹ پر دینا ہے تو پھر ایک زحمت کریں، جملہ حواشی کو ہر صفحہ کے آخر میں دینے کی بجائے، مضمون کے آخر میں کر دیں۔ویسے بھی مجھے یہ مضمون نہیں بلکہ پوری کتاب لگ رہا ہے۔سو جملہ حواشی آخر میں دینا بہتر رہے گا۔

آپ نے بے حد حساس دیاروں کی سیاحت کی ہے۔یہ چوتھے کھونٹ کا نہیں، اس سے نکلتی ہوئی کسی اور سمت کا سفر ہے۔دیکھتا ہوں کس حد تک آپ کے ساتھ چل پاتا ہوں۔کتاب پر میرے تبصرے سے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔آپ کی سیاحت آپ کا فکری مسئلہ ہے تو آپ سے اختلاف کرنے کے باوجود میں نہ صرف آپ کے اختلاف کے حق کو تسلیم کرتا ہوں بلکہ اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ جب اچھے پیرائے میں لکھا جا سکتا ہے تو حساس موضوعات پر بھی مکالمہ ہونا چاہئے، ہوتا رہنا چاہئے لیکن ان لوگوں کے ساتھ جو اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا ظرف رکھتے ہوں۔

اسماعیل صاحب کی کتاب کو انٹرنیٹ پر شائع کرا دیتا ہوں۔آپ اس کے سرورق کی جے پی جی فائل بھیج دیں۔اپنی تصویر بھی بھیج دیں تو اچھا ہے۔آپ کے مضمون کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔میرا خیال ہے کہ آپ اپنا ایک بلاگ بنا کر اپنی کتب اور جملہ مضامین کو آن لائن مہیا کر سکتے ہیں۔اس میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔

میری اس میل کے آخر میں میرے چند بلاگس کے لنک دیئے ہوئے ہیں۔پہلے دو لنکس زیادہ مربوط ہیں۔ان سے آپ اپنا بلاگ بنانے کا کچھ آئیڈیا کر سکیں گے۔

میں نے واٹس ایپ پر آپ کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن کامیابی نہیں ملی۔میرا خیال ہے کہ واٹس ایپ یا سکائپ پر ہم آسانی سے گفتگو کر سکیں گے۔

میں عام طور پر آئی ٹیبلٹ پر ہی میلز دیکھ کر رومن اردو میں جواب لکھ دیا کرتا ہوں۔اردو رسم الخط

میں لکھنے کے لیے مجھے کمپیوٹر کھولنا پڑتا ہے۔معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کو رومن اردو میں ای میلز لکھتا رہا ہوں، اب کوشش کروں گا کہ اردو رسم الخط میں ہی جواب بھیجا کروں۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

■■■

بھی تحقیقی ہو یا جدید ادب ایسا ادبی مجلّہ، اسے اسی طرح شائع کر دے تو بات اصل ٹھکانے تک پہنچ جائے گی۔ بہرحال، آپ مضمون پڑھ کر ورق پر اشاعت کے بارے کچھ کہیں تو ممنون ہوں گا۔

ایک ادبی مجلّے میں میں نے ایک جلاوطن عراقی شاعر احمد مطر کی کوئی بائیس نظمیں اردو ترجمہ کر کے یک مشت بطور گوشہ یا قسط وار اشاعت کے لیے بھیجیں، صرف تین نظمیں شائع کی گئیں، باقی رد۔ حالاں کہ سب کی سب اس کی نمائندہ نظمیں ہیں۔ انھیں نیٹ پر رکھنے سے کم ہی کوئی تعارف حاصل کر سکے گا۔ یہ میرا ذاتی خیال اور تجربہ بھی ہے۔ شاعر کا تعارف ہے:

احمد مطر (پیدائش 1954ء ۔) عراق کا ایک جلاوطن انقلابی شاعر ہے۔ عراق کی آمرانہ حکومت کے خلاف نظمیں لکھنے پر اسے انٹیلی جنس کے اضطہادی ہتھکنڈوں کا شکار ہونا پڑا، اور کویت میں جا کر پناہ لینا پڑی۔ وہاں پہلے سے موجود اپنے ہم وطن دوست ناجی علی کے ساتھ اس نے روزنامہ القبس میں کام کیا، جس کا سرآغاز احمد مطر کی نظم ہوتی اور اختتام ناجی علی کا کارٹون۔ لیکن اپنے تیکھے لہجے اور جرا?ت مندانہ موقف کے باعث اسے ناجی علی کے ساتھ کویت سے بھی نکلنا پڑا۔ دونوں نے مختلف جگہ قیام کے بعد 1986ء ۔ میں مستقل طور پر لندن میں جلاوطنی اختیار کی۔ ناجی علی پر وہاں قاتلانہ حملہ ہوا، اور وہ ایک ماہ بے ہوش رہنے کے بعد مر گیا۔ اس کی موت کا احمد مطر پر گہرا اثر ہوا، اور اس کی نظمیں زیادہ کاٹ دار لہجہ اختیار کر گئیں۔ احمد مطر کسی خاص آئیڈیالوجی کا پابند شاعر نہیں۔ اس کا شمار مزاحمتی شعرا میں ہوتا ہے، اور اس لحاظ سے کئی جگہ اس نے راست اندازِ تخاطب سے بھی کام لیا ہے، جو اصل زبان میں خاصا لطف کا حامل ہے۔ آج کل اس کی نظمیں زیادہ تر قطر کے ایک روزنامے الرا?ۃ میں شائع ہوتی ہیں۔ یہاں احمد مطر کی بائیس نمائندہ نظموں کا منثور ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ترجمے کے ساتھ اصل عربی متن بھی دیا گیا ہے، تاکہ آزاد نظم میں لائے گئے ضمنی قوافی اور زبان کی شعریت محسوس کرنے کے علاوہ ترجمے میں اپنایا گیا ذرا سا آزاد اسلوب بھی دل چسپی رکھنے والے قاری کے سامنے رہے۔ واضح رہے کہ تین مترجمہ نظمیں سہ ماہی اجرا کے شمارہ نمبر 17، جنوری تا مارچ 2014ء ۔، میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر یہاں چونکہ عالمی ادب کے ضمن میں احمد مطر کی نظمیں بطور ایک گوشہ شائع ہو رہی ہیں، اس لیے وہ تین نظمیں بھی ساتھ شاملِ اشاعت ہیں۔

جدید عرب شعرا میں محمود درویش کے علاوہ کم ہی کسی شاعر کا تعارف مع انتخاب اردو کے ادبی مجلّات میں پیش کیا گیا ہے۔ جبران خلیل جبران، اگرچہ ایک استثنا ہے، مگر اس کے صرف ناول مقبول ہیں، اور انھیں پر بات ہوتی ہے، نیز خود عربوں کے ہاں اسے باقاعدہ شعرا کے زمرے میں شامل نہیں کیا جاتا۔ معلوم رہے

کہ احمد مطر حیات شعرا میں سے ہے۔

میں نے آپ کے ادبی مجلّے کے لیے تعارف میں بطور تمہید کچھ سطریں تبدیل کی ہیں۔

آپ کے بھیجے لنکس سے میں تحریریں اور کتابیں پڑھنے کی کوشش کروں گا۔ آپ کا برینڈ نام اتنی زیادہ تحریروں، کتابوں اور تحقیقات کے باعث ہے۔

پیار چھپا کے بھاگ بھری کا سینے میں
حضرت واث ہیر بناتے رہتے ہیں
کچھ جذبوں کو قیدی کرنے کی خاطر
لفظوں کی زنجیر بناتے رہتے ہیں
اپنا ترکش کیوں کر خالی رہنے دیں
ہم بھی اپنے تیر بناتے رہتے ہیں

عمر فاروق

▪▪▪

ضرور اور بھرپور استفادہ کرتا۔

اب ان کی اشاعت کی ایک صورت تو یہ ہوسکتی ہے کہ آپ انڈیا کی یونیورسٹیوں کے اردو کے شعبہ کی جانب سے شائع کیے جانے والے مجلّات سے رابطہ کریں اور وہاں اپنے مضامین بھیج کر دیکھیں۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہم کسی ادبی رسالہ کے مدیر سے بات کریں اور ان کے رسالے کا ایک عربی ادبیات نمبر شائع کرا لیں، جس میں آپ کا لکھا ہوا اور ترجمہ کردہ بیشتر میٹر یک جا ہو جائے۔ لیکن ایسی صورت میں متعلقہ رسالے کے ساتھ مناسب مالی تعاون کرنا ہوگا۔ آپ اس کے لیے آمادہ ہوں تو کسی سے بات کا آغاز کرسکتا ہوں۔

آپ کے اشعار پڑھ کر اچھا لگا۔ بھاگ بھری کے ذکر پر اپنا ایک شعر یاد آ گیا۔

میں نہ رانجھا، نہ تعلق میرا وارث سے کوئی
پر مرے دل میں بھی اک بھاگ بھری رہتی ہے

عجیب اتفاق ہے، آپ سے ایسے موسم میں رابطہ ہوا ہے جب مجھے معلوم ہوا ہے کہ مصر کی ایک یونیورسٹی سے کوئی نوجوان میری شاعری پر ایم اے کا مقالہ لکھ رہا ہے۔

میں نے ۱۹۹۵ء میں دیوندر اسر کے ناولٹ خوشبو بن کے لَوٹیں گے کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے مضمون کے آخر میں لکھا تھا:

''خوشبو بن کے لوٹیں گے'' کے ذریعے مجھے دیوندر اسر کے اندر آریائی اور دراوڑی تہذیبوں کا ہزاروں برس پرانا تصادم ویسے کا ویسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ بظاہر آریائی فاتح ہے اور دراوڑی مفتوح لیکن اصل حقیقت تو کچھ اور ہے۔ تصادم کا یہ منظر نامہ میرے لئے اس لئے بھی اہمیت رکھتا ہے کہ تاریخ کے طویل دَورانیے کے اس کھیل کا اگلا کردار ایک عربی کے روپ میں میرے اندر بھی کہیں چھپا بیٹھا ہے۔ **(ہمارا ادبی منظر نامہ۔ص ۱۵۵)**

کہیں یہ ماضی بعید کے عرب کو حال کی عربی کی طرف سے محبت کا کوئی پیغام تو نہیں مل رہا؟ بس ایسے احساسات کے سامنے پھر ساری تحقیق اور ساری سائنس اپنی جگہ بجا ہونے کے باوجود مدھم ہونے لگتی ہے۔ ماضی کے اَن دیکھے ہیولے اور مابعد الطبیعاتی کیفیات تخلیقی دیاروں میں لے جانے لگتی ہیں۔ تخلیقی دیاروں میں نامعلوم کی جستجو میں مگن رہنا مجھے اچھا لگتا ہے، لیکن میں سائنس اور اس سے منسلک علوم کی فضیلت اور برکات کا بھی قائل ہوں کہ ان علوم کے حالیہ فیوض نے تو سچ مچ ہمیں طلسم ہوش ربا دنیا میں

داخل کر دیا ہے، ابھی روشنی کی رفتار سے سفر کرنے کی خبر بھی کسی وقت حقیقت بن کر سامنے آسکتی ہے۔ سائنس اور فلسفہ اور ان سے منسلک دیگر علوم بھی اپنے طریقِ کار کے مطابق نامعلوم کی جستجو ہی کر رہے ہیں اور اس دوران جو کچھ منکشف ہوتا جا رہا ہے، وہ کسی بھی طلسماتی داستان سے کم نہیں ہے۔

خط غیر ضروری طور پر طویل ہوتا جا رہا ہے اس لیے اجازت چاہتا ہوں۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

عمر فاروق بنام حیدر قریشی

Mar 5 at 12:44 AM

مکرمی حیدر قریشی صاحب،

قریشی ہونا اور ماضی بعید کے عربی تعلق کا عز و شرف یا ذل و قرف مجھے بھی حاصل ہے۔ "ذل و قرف" اس لیے کہ کئی دفعہ یہ شرف، عزت و وقار میں کمی کا باعث بن جاتا ہے۔ یا تو پاکستان میں عرب نسل سے تعلق رکھنے والوں کو اچھا مقام حاصل ہوتا ہے یا وہ اضطہاد کا شکار نظر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام نے ذات پات کو ختم کیا، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر اسماعیل ادہم کا علم الانساب والا مضمون بھی اس بات نفی کرتا ہے کہ ذات پات ختم کرنے میں اسلام کامیاب ہوا۔ بلکہ حضرت عمر کو آخری عمر میں جو قلق ہوا کہ ان سے مسلمانوں کی درجہ بندی اور وظائف کی تقسیم میں غلطی سرزد ہوئی، تو ان کا وہ قلق بالکل درست تھا۔ اگر وہ چند ایک کو وظیفہ دے کر آئندہ کے لیے قبائلی تعصب، بھارت میں فیوڈلزم ختم کیے جانے کی طرح ختم کر دیتے تو واقعی ذات پات کا جھگڑا اسلام میں ختم ہوسکتا۔ رہا آریائیوں اور دراوڑوں کا تعلق تو ان کا باہم وہی تعلق ہے جو عرب فاتحین اور مقامی لوگوں کا رہا ہے، جن میں مسلمان ہونے والے بھی فاتحین اور ان کی نسل کے ساتھ محبت اور نفرت کا تعلق رکھتے ہیں۔

تحریروں اور تراجم پر آپ کی تجویز کے بارے میں بعد میں عرض کروں گا، فی الحال "عرضِ مترجم" والی بات کو مزید آگے بڑھانے کے لیے اپنی پہلی ترجمہ کردہ کتاب پر خود اپنا ہی تبصرہ ایک خط کی شکل میں یہاں اٹیچ کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کو ترسیل نہ ہوسکا ایک خط بھی اٹیچ ہے۔ اس میں بھی کچھ اسی

بات کو کمک مہیا کی گئی ہے۔

ہو نہ ہو جان بچا کر کوئی آ پہنچا ہے
پھر رسد گاہ سے لشکر کو کمک جاتی ہے

عمر فاروق

■■■

۔انسانوں کی طبقاتی تفریق کو الگ رکھیں۔ ہر انسان کے خود اپنے وجود کے بھی کئی طبقے بنے ہوئے ہیں۔ دماغ برہمن کی طرح خود کو افضل سمجھتا ہے اور دل کے توسط سے باقی جسم سے رابطہ رکھتا ہے۔ دائیں ہاتھ کے مقابلہ میں بایاں ہاتھ کمتر ہے۔ جسم کے نیچے کے حصہ کو صاف رکھنے کے باوجود ہم خود ایک اچھوت ہی سمجھتے ہیں۔''

(**کھٹی میٹھی یادیں** کے باب **دعائیں اور قسمت** سے اقتباس)

''میری بے گناہی۔۔۔ میری نیکیاں دنیا نہیں دیکھتی اور میں تہمتوں کی زد میں ہوں۔

میں اذیت میں ہوں کہ میری ماں ابھی تک میری خاطر پانی کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ وہ جو بادشاہ زادی ہے۔ میرے سوتیلے بھائی اسے لونڈی اور مجھے لونڈی کا بیٹا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرے سوتیلے عزیز تاریخ کو جتنا چاہیں مسخ کر لیں مگر وہ میرے باپ کا نام کیونکر مٹا سکیں گے کہ پھر وہ خود بھی بے شناخت ہو جائیں گے۔

میں ابراہیم کا بیٹا ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آگ ابراہیم کے لئے گلزار ہو گئی تھی تو مجھے کیونکر نقصان پہنچا سکے گی۔

''آگ سے ہمیں مت ڈراؤ یہ ہماری غلام بلکہ غلاموں کی بھی غلام ہے۔''

یہ آسمانی آواز مجھے یقین دلاتی ہے کہ میری ایڑیوں کی رگڑ سے ایک چشمہ پھوٹ بہے گا اور اس کا پانی میری مدد کو آئے گا۔''

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میری بے گناہی اور سچائی کے سارے نشان اس آگ میں جل کر فنا ہو جائیں گے۔ مٹ جائیں گے۔ اور میرے سوتیلے عزیزوں کے سوتیلے جذبوں کے ظلم کا کوئی ثبوت باقی نہیں رہے گا۔ تب میرے سوتیلے عزیز اپنی مرضی کے مطابق میری تاریخ لکھیں گے، تب وہ اطمینان سے لکھیں گے کہ:

میں بدکار تھا اور میری بیوی بھی بدکار تھی اور میری ماں لونڈی تھی... مگر میرا باپ؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

میرے سوتیلے عزیزوں نے نفرت کی آگ لگا دی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور میں دیکھتا ہوں کہ:

تپتے ہوئے صحرا میں میرے ایڑیاں رگڑنے سے ایک چشمہ پھوٹ بہا ہے۔ مری ماں کے چہرے پر

خوشیوں اور مسرتوں کا نور پھیلا ہوا ہے۔ وہ جو کسی قافلے کی امداد کی منتظر تھی اب ہزاروں قافلے اس کی مدد کے محتاج ہیں۔ اور اس بادشاہ زادی کو ایک نئی بادشاہت مل گئی ہے۔

(**افسانہ ''میں انتظار کرتا ہوں'' سے مقتبس**)

میرا خیال ہے کہ ذات پات کے حوالے سے ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ لیکن ہمارا سوچنے کا انداز قدرے مختلف ضرور ہے۔ اسماعیل صاحب نے جو کچھ عربوں کے نسب کے حوالے سے لکھا ہے وہ سارا کچھ دنیا کے کسی بھی دوسرے خطے اور کسی بھی قوم پر اس سے کہیں زیادہ منطبق کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے میں اپنے تبصرے میں کچھ عرض کر سکوں گا۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

▪▪▪

قطرہ جان، آشنائے بحر
نقش تو نے برآب کھینچا ہے

عمر فاروق

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 6 at 7:59 AM

محترمی عمر فاروق صاحب

سلام مسنون

میری ۵ مارچ کی ای میل کے جواب میں آپ کی ای میل ملی، شکریہ۔

میں نے اپنے ۳ مارچ کے خط میں لکھا تھا:

''آپ نے بے حد حساس دیاروں کی سیاحت کی ہے۔ یہ چوتھے کھونٹ کا نہیں، اس سے نکلتی ہوئی کسی اور سمت کا سفر ہے۔ دیکھتا ہوں کس حد تک آپ کے ساتھ چل پاتا ہوں۔ کتاب پر میرے تبصرے سے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ آپ کی سیاحت آپ کا فکری مسئلہ ہے تو آپ سے اختلاف کرنے کے باوجود میں نہ صرف آپ کے اختلاف کے حق کو تسلیم کرتا ہوں بلکہ اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جب اچھے پیرائے میں لکھا جا سکتا ہے تو حساس موضوعات پر بھی مکالمہ ہونا چاہئے، ہوتا رہنا چاہئے لیکن ان لوگوں کے ساتھ جو اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا ظرف رکھتے ہوں۔''

اسماعیل احمد ادھم کے حوالے سے عربوں کے نسب کے سلسلہ میں آپ نے میرے موقف کو تسلیم کر لیا، اس کے لیے آپ کا شکریہ۔ لیکن لگتا ہے آپ نے یہ اعتراف بشاشت کے ساتھ نہیں کیا۔ یہ مان لینے کے بعد کہ:

''نسب انساب کی حقیقت یقیناً سب کے ہاں تقریباً ایک سی ہے۔ بس اپنی حقیقت چھوڑ کر عام روش یہی ہے کہ دوسرے کی حقیقت بتائی جائے اور اپنے لیے تسکین دل کا سامان بہم پہنچایا جائے''

آپ نے براہِ راست خطاب کرتا ہوا شعر جڑ دیا ہے۔

آگہی کا عذاب کھینچا ہے تیرے رُخ سے نقاب کھینچا ہے

مجھے افسوس ہے کہ اپنی ای میل میں نسب و انساب کے حوالے سے میرے موقف کو تسلیم کر لینے کے

باوجود آپ اپنے انقباض کو چھپا نہیں سکے۔ معرکہ آرائی کا کوئی مرحلہ ہو تو میں دمادم مست قلندر کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ لیکن آپ کے ساتھ تو ایک شریفانہ مکالمہ ہو رہا تھا۔ آپ کے تئیں میرا رویہ بھی دوستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ اس کے باوجود آپ کو اس سطح پر کیوں اترنا پڑا؟ حیران ہوں!

میں اپنی تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے آپ کے اشعار کے جواب میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں۔ آگہی کے حوالے سے عدمؔ کا شعر آپ کی نذر ہے۔

آگہی میں اک خلا موجود ہے
اس کا مطلب ہے خدا موجود ہے

جملہ اشعار کے حوالے سے آغا جی کی یہ تین سطریں پیش ہیں۔

''اُس نے کاغذ پہ لکھا: روگ تمہارا یہ ہے
میں نے کاغذ پہ لکھا
روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئنہ ہے''

اور اسی تناظر میں نقاب کھینچنے کی بجائے نقاب کے بھید کے حوالے سے عرض ہے کہ:

حیدرؔ بھید جہاں کے جیسے خواب کے اندر خواب
ایک نقاب اگر اُلٹیں تو آگے اور نقاب

اللہ آپ کو خوش رکھے۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

عمر فاروق بنام حیدر قریشی

Mar 7 at 12:06 AM

محترمی حیدر قریشی صاحب

نقاب کے اندر نقاب ہی اصل مسئلہ ہے۔ معذرت چاہتا ہوں کہ راست اندازِ تخاطب کا حامل شعر لکھ دیا۔ حالانکہ شعر کو نثر پر محمول نہیں کرنا چاہیے۔ کسی نثر یے میں شاعرانہ نثر کو بھی شعر کے انداز پر دیکھنا چاہیے۔

آپ نے شعر کو براہِ راست تخاطب سمجھ لیا۔ اگر چہ بحث باہم شخصی حوالے سے بھی ہو رہی تھی، لیکن بخدا میں نے صرف یاد آجانے والے اشعار لکھ دیے اور یہ نہیں سمجھا کہ میں چوٹ کر رہا ہوں یا ذاتیات پر آ رہا ہوں۔ یہ آپ نے توجہ دلائی، جو میرے خیال میں ٹھیک نہیں۔ عدم کا شعر خدا کے وجود سے بڑھ کر نقاب اندر نقاب کی بات کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ خلا کی کھوج جاری رہے گی۔ بالکل "تم اک گورکھ دھندا ہو" والی نصرت فتح علی کی قوالی کی طرح۔ اب میں آپ کو یہ نہیں کہہ رہا کہ "تم اک گورکھ دھندا ہو"۔ حالانکہ "تمھیں" ہی کہا جا رہا ہے، اور یہ "تمھیں" غالب کے اردو دیوان کی پہلی غزل کے پہلے شعر میں "فریادی نقش" کے "کاغذی پیرہن" والی بات ہے۔ امید ہے اس وضاحت سے بات صاف ہو گئی ہوگی۔ اور ہاں، مجھے نہیں، غالب کو انقباض تھا، اور غالب کو نہیں، مجھے انقباض تھا۔ بات ایک ہی ہے، جو آغا صاحب نے بھی کہی۔ جب کہ تسلیم کرنے والی بات ایک پیرا پہلے ختم ہو چکی تھی۔ صرف اختتام میں ایک شعر آن اٹکا، اور میں نے انقباض ختم کرنے کے لیے ہی اسے درج کیا۔ ریڈر ریسپونس مختلف رہا۔ میں نے لاشعوری سطح پر شعوری انقباض ختم کرنے کو شعر درج کیا۔

آپ کے تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ میں نے کتاب کا انتساب یوں لکھا ہے

انتساب

نسب انساب کی تحقیق

کے نام

عمر فاروق

.....

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 7 at 3:41 PM

محترمی عمر فاروق صاحب

سلام مسنون

آپ کا برقی مکتوب ملا، آپ نے اپنے ''طرزِ عمل'' کی وضاحت کے لیے جو کچھ لکھا ہے، اس سے علمی سطح پر کوئی وضاحت تو نہیں ہوئی لیکن آپ کی ''شعر فہمی'' اور بات سنبھالنے کی ''خوبی'' کا اندازہ ہو گیا۔ نقاب کے اندر نقاب کی ترکیب آپ نے خود بنالی ہے، میں نے ہر نقاب کے اُلٹنے کے بعد ایک اور نقاب سامنے

آنے کی بات کی ہے اور یہ کائنات کی وسعتوں کے تناظر میں کی گئی ہے۔ کائنات کے بھیدوں کا ذکر ہے جو خواب کے اندر خواب کا تسلسل ہیں۔ آپ اسے محض اپنی نظریاتی بنیاد پر دیکھ رہے ہیں۔ یہ نظریہ کی اسیری کا منظر ہے۔ آپ جس نظریے کے اسیر ہیں، اس سمیت تمام دینی و غیر دینی نظریات کے حوالے سے میرا عمومی رویہ آپ سے مختلف ہے۔ اپنی ایک پرانی تحریر سے اپنا تاثر یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

''میری کئی دہریے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ پاکستان میں، انڈیا میں اور اب یہاں جرمنی میں بھی۔ دہریے لوگوں کی کم از کم دو قسمیں تو میرے ذہن میں واضح ہیں۔ ایک قسم کے دہریے وہ ہیں جو کچے پکے مطالعہ کے ساتھ، دانشور کہلانے کے لئے شوقیہ دہریے بن گئے۔ یہ لوگ محض محفلوں میں نمایاں ہونے کے لئے نازیبا زبان میں بات کرتے ہیں۔ خدا کو سمجھنے کی کاوش یا اس کی جستجو (چاہے اس کے نتیجہ میں بندہ کوچۂ الحاد میں بھی چلا جائے) ان کے ہاں بالکل نہیں ہوتی۔ نام آوری کے ایسے شوقین دہریوں کو میں شیخ چلی دہریے سمجھتا ہوں۔ ان کے برعکس وہ لوگ جو واقعتاً خدا کی ہستی کو عقل کے ذریعے سمجھنا اور جاننا چاہتے ہیں، میں ان کے انکار کے باوجود انہیں خدا پرست کہتا ہوں۔ **لاتسبو الدھر** والی حدیث قدسی میں خدا خود کہتا ہے کہ زمانے (دہر) کو برا مت کہو، میں خود زمانہ (دہر) ہوں۔ تو صاحب! اگر خدا دہر ہے تو دہریہ کا مطلب ہوا خدا پرست۔

مختلف مذاہب کا پس منظر رکھنے والے دہریوں میں ایک دلچسپ چیز میں نے یہ دیکھی کہ کسی نہ کسی سطح پر وہ اپنے مذہب سے لازماً وابستہ ہوتے ہیں۔۔۔۔۔ یوں دہریوں کے بھی کئی مسلک سمجھ لیجیے۔ مسلمان دہریے، مسیحی دہریے، ہندو دہریے۔ یہاں کراچی کے ایک معروف ترقی پسند نقاد اور لاہور کے بھی ایک نیم ترقی پسند کالم نگار کی یاد آ گئی۔ ان میں سے ایک نے انڈیا کے ادیب دوستوں میں بیٹھ کر اظہر جاوید کے مسلک کا مذاق اڑایا اور ایک نے میرے مذہبی رجحانات کی خطرناکی سے وہاں کے ہندو دوستوں کو آگاہ کیا۔ سو ثابت ہوا کہ دہریوں کی بھی اقسام ہیں یعنی مسلمان دہریے، مسیحی دہریے، ہندو دہریے، یہودی دہریے، وغیرہ وغیرہ۔ جو حسبِ موقع صاحبِ ایمان بھی بن جاتے ہیں۔''

(کھٹی میٹھی یادیں کے باب رہے نام اللہ کا! سے اقتباس)

'' اس وقت دنیا کو مذہبی انتہا پسندی سے شدید خطرات لاحق ہیں۔ کسی ایک مذہب یا مسلک کو قصوروار کہے بغیر میرے نزدیک ہر مسلک اور مذہب کے انتہا پسند انسانیت کے لئے شدید خطرہ ہیں۔ میرے ذاتی خیال کے مطابق ہر مسلک اور مذہب کے پاس کچھ ایسی بنیادیں ہوتی ہیں جن پر وہ

باقاعدہ قائم اور استوار ہوتا ہے۔اسی لئے اس کے پیروکاروں کے لئے اس پر کاربند رہنے کا کچھ جواز بنتا ہے۔اسی طرح ہر مذہب اور مسلک میں کچھ ایسے کمزور پہلو بھی ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر ان پر مدلل اعتراض وارد ہوتے ہیں۔بس جہاں ایسے اعتراضات میں شدت آتی ہے وہیں دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی اپنے مخالف کے کمزور پہلوؤں پر حملہ کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے۔یوں مذہبی نفرتیں بڑھتی ہیں۔عمومی طور پر ہمارے تہذیبی اور ثقافتی میلان کے ساتھ ہمارا نفسیاتی میلان ہمیں کسی مسلک پر کاربند رکھتا ہے۔یا پھر بھیڑ چال کا نسل در نسل رویہ بھی ہمیں ہانکتا ہے۔یوں کوئی انتہائی جذباتی اور مشتعل قسم کا سچا مومن اگر کسی مسیحی، یہودی، ہندو یا سکھ گھرانے میں پیدا ہوتا تو وہاں بھی وہ اتنا ہی مخلص، سچا، کھرا، جذباتی اور مشتعل قسم کا مسیحی، یہودی، ہندو یا سکھ ہوتا۔میں ہر مذہب کے اس قسم کے مومنین کا احترام بھی کرتا ہوں اور ان سے ڈرتا بھی ہوں اور ہر سال اکبر حمیدی کے الفاظ میں دعا کرتا ہوں:

یارب العالمین! ترے لطف سے رہیں
محفوظ ''مومنین'' سے ''کفار'' اس برس''

(کھٹی میٹھی یادیں کے باب رہے نام اللہ کا! سے اقتباس)

پہلے اقتباس کے بعد خلا کے حوالے سے میں نے تفصیل سے موازنہ پیش کیا ہے، پھر بھی آپ نے خلا کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس کے لیے آپ کا شکریہ۔

میں نے اپنے ۵ مارچ کے خط میں لکھا تھا:

''وزیر آغا صاحب کے نام آپ کا مکتوب پڑھ لیا ہے۔میرا خیال ہے کہ اس موضوع پر دونوں اطراف سے اپنا اپنا موقف اس حد تک کھول کر بیان کیا جا چکا ہے کہ پرانے دلائل کو دہرانے کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔بس یہ کہا جا سکتا ہے کہ جیسے جس کے دھیان میں آئی۔اور قارئین میں سے جس نے جسے چاہا اختیار کر لیا۔پرانی باتوں کے علاوہ کوئی نیا نکتہ سامنے آیا تو اس پر مزید غور کیا جا سکتا ہے۔''

یہ مہذب طریقے سے اس بات کا اظہار تھا کہ اگر آپ کے پاس کوئی نیا نکتہ نہیں ہے تو باتوں کو دہراتے چلے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔پھر آپ تو نہ صرف دہرائی ہوئی باتیں دہرائے جا رہے ہیں بلکہ علمی معاملات میں طعن وطنز کے تیر بھی چلا رہے ہیں۔سو اب اپنے ترجمے بھیجنے کی بجائے اگر کسی مکالمہ کی خواہش ہے تو کسی نئے علمی نکتہ سے بات شروع کریں۔ورنہ آپ کا خود دوسروں کا ترجمہ ہو کر رہ جانا میرے لیے کسی دلچسپی کا موجب نہیں ہے۔امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

والسلام
آپ کا مخلص
حیدر قریشی

■■■

عرض ہے کہ آغا صاحب کوانٹم فزکس کے بہت اچھے شناسا تھے۔کوانٹم فزکس کی ایک دریافت نیوٹرینو ہے، جس سے مائنڈ اور میٹر یا روح اور مادہ کی بحث پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ای = ایم سی۲ کے بعد نیوٹرینو نے اندازہ لگوایا کہ روح اور مادہ یا مائنڈ اور میٹر کی دوئی علمی سطح پر تقریباً ختم ہو کر رہ گئی ہے۔"نو میٹر نیور مائنڈ" کا مذاق سنجیدگی کا روپ دھارنے لگا ہے۔اس لیے دہرا اور دہریہ کی بحث نیا انداز اپنا چکی ہے۔ نیوٹروز سورج کی شعاعوں کے ساتھ اخراج کرتے ہیں اور پلک جھپکتے میں پوری زمین سے گزر کر دوسری طرف نکل جاتے ہیں، ہمارے مادی وجود کو کسی قسم کا نقصان پہنچائے بغیر،مگر جب وہ اس طرح گرفت میں آئے بغیر تین حالتیں بدلتے ہیں،تو اس وجہ سے وہ مادے کے ساتھ بھی منسلک ہیں۔

نقاب اندر نقاب نہ ہو تو ایک نقاب الٹنے کے بعد نیا نقاب کیوں کر سامنے آئے۔پہلی بات غیر علمی ہے،تو دوسری اسی کے ساتھ منسلک ہے۔صرف ایک شعر سے ہر بات کو مخالف سمجھ لینا درست نہیں، نہ کسی دوسرے شعر کے ساتھ تقابل سے بات شعر کی سطح پر سمجھنے کی "جوابی" کوشش سے "سخن فہمی" کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔خواب کے اندر خواب کا تسلسل نفسیاتی تحقیقات کی روشنی میں نئے سے نیا انداز اختیار کرتا ہے۔کائنات کی وسعتیں اور انسان کی حیثیت دونوں زیرِ بحث ہیں۔

پرانی باتوں سے نیا نکتہ نکالنا یا انھیں نئے طور پر پیش کرنا ہی مقصد تھا،جس کے لیے پرانا مواد کھنگالنا ضروری ہے،خواہ عربی لٹریچر کے حوالے سے دہرائی گئی باتوں کو اردو میں نئے سرے سے موضوعِ بحث بنایا جائے۔ارسال کردہ ترجمے اور اختلاف "برداشت" کرنے کے حوالے سے پہلی جوابی ای میل میں کچھ عرض کر چکا ہوں۔شکریہ

عمر فاروق

.....

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 13 at 7:33 PM

محترمی عمر فاروق صاحب سلام مسنون

سات مارچ کے بعد سے آپ کی طرف سے کوئی ای میل نہیں آئی،اب بارہ مارچ کو رات بارہ بجے آپ کی انگریزی میں لکھی ہوئی ای میل ملی اور پورے پچپن منٹ کے بعد تیرہ مارچ کی تاریخ میں آپ کی اردو میں لکھی ہوئی ای میل ملی۔پچپن منٹ کے بعد آپ کو دوسری ای میل لکھنے کی ضرورت کیوں پیش

آئی؟اللہ بہتر جانتا ہے یا آپ خود بہتر جانتے ہیں۔تاہم اس سے مجھے سہولت ہو گئی کہ آپ کی اردو ای میل کے مندرجات کے حوالے سے انگریزی میل کا بھی تھوڑا بہت جواب لکھ دوں۔لیکن اگر آپ محسوس کریں کہ آپ کی انگریزی میں لکھی ہوئی کسی اہم بات کا جواب نہیں لکھ سکا تو اردو میں نشان دہی کر دیجئے گا،پھر میرے نزدیک جو مناسب جواب ہو گا عرض کر دوں گا۔

آپ نے کوانٹم فزکس کے حوالے سے جو کچھ لکھا ہے،میں اس پر اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ سائنسی انکشافات سے میری واقفیت بہت محدود اور واجبی سی ہے۔جن چند نکات کو تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی ہے اور سمجھ پایا ہوں،انہیں بھی میں یا تو آسان اور اچھے اردو مضامین کے توسط سے سمجھ پایا ہوں۔یا متعلقہ موضوع کے کسی پروفیسر دوست کے ساتھ ڈسکس کر کے اس بات کو آسان بلکہ دیسی مفہوم میں سمجھنے کی کوشش کر لیتا ہوں۔یہ میری ذاتی دلچسپی اور عدم دلچسپی کا معاملہ ہے۔آپ نے کوانٹم فزکس کے حوالے سے وزیر آغا صاحب سے ہی بات کی ہوتی تو بہتر ہوتا۔لیکن آپ تو ان کے جیتے جی ان کے نام لکھا ہوا خط بھی انہیں بھیج نہ سکے،اس موضوع پر کیا بات ہوتی۔زندگی میں ایسے معاملات بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ویسے آپ نے یہ بات آغا جی کے حوالے سے شروع کی ہے تو آپ کی بات کے لُبّ لباب کے جواب میں وضاحتاً عرض ہے کہ آغا جی مذہب کی رسمی صورت میں زیادہ دلچسپی نہ لینے کے باوجود کائنات کی حقیقتِ عظمیٰ کے نہ صرف معترف تھے بلکہ اس کی جستجو کو اپنا ادبی وظیفہ سمجھتے تھے۔

فزکس کے معاملات کو سمجھنے کے لیے فزکس کے قوانین اور اصولوں کے مطابق ہی آگے بڑھنا ہوتا ہے۔اسی طرح میٹا فزکس کی اپنی ایک الگ دنیا ہے،اسے فزکس کے اصولوں پر پرکھنے کی کوشش کی جائے گی تو کہیں کوئی ہلکی پھلکی مطابقت تو مل جائے گی لیکن اس کے لیے میٹا فزکس کی دنیا میں جانا ضروری ہو گا۔جیسے فزکس سے نابلد انسان فزکس کے قوانین کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ایسے ہی میٹا فزکس کی دنیا سے نابلد انسان بھی اس دیار کے بارے میں کوئی حکم نہیں لگا سکتا۔یہ باتیں میرے ذہن میں اسی حد تک آتی ہیں۔

آپ کی انگریزی ای میل کے یہ الفاظ پڑھ کر حیران رہ گیا ہوں۔

If you had said the very first day that the translated book sent to you for review is against your beliefs and what you have as a sort of creedal faith in certain things or/and personalities, so you won't go ahead to re-read and subsequently review the book, there would have been no tension created between us.

آپ کی بھیجی ہوئی اسماعیل احمد ادھم کی پوری کتاب پڑھنے کے بعد میں نے اپنی ۳ مارچ کی ای میل میں آپ کو یہ لکھا تھا۔

''اسماعیل احمد ادھم صاحب کے چاروں مضامین پڑھ لیے ہیں۔ایک بار پھر انہیں پڑھنا چاہتا ہوں۔اس کے بعد تبصرہ لکھنے کی کوشش کروں گا۔

آپ کا علم البلاغت والا مضمون سرسری دیکھا ہے۔اگر اسے انٹرنیٹ پر دینا ہے تو پھر ایک زحمت کریں، جملہ حواشی کو ہر صفحہ کے آخر میں دینے کی بجائے، مضمون کے آخر میں کر دیں۔ویسے بھی مجھے یہ مضمون نہیں بلکہ پوری کتاب لگ رہا ہے۔سو جملہ حواشی آخر میں دینا بہتر رہے گا۔آپ نے بے حد حساس دیاروں کی سیاحت کی ہے۔یہ چوتھے کھونٹ کا نہیں، اس سے نکلتی ہوئی کسی اور سمت کا سفر ہے۔دیکھتا ہوں کس حد تک آپ کے ساتھ چل پاتا ہوں۔کتاب پر میرے تبصرے سے کچھ اندازہ ہو جائے گا۔آپ کی سیاحت آپ کا فکری مسئلہ ہے تو آپ سے اختلاف کرنے کے باوجود میں نہ صرف آپ کے اختلاف کے حق کو تسلیم کرتا ہوں بلکہ اس کی قدر بھی کرتا ہوں۔میرا خیال ہے کہ جب اچھے پیرائے میں لکھا جا سکتا ہے تو حساس موضوعات پر بھی مکالمہ ہونا چاہئے، ہوتا رہنا چاہئے لیکن ان لوگوں کے ساتھ جو اختلاف رائے کو برداشت کرنے کا ظرف رکھتے ہوں۔

اسماعیل صاحب کی کتاب کو انٹرنیٹ پر شائع کرا دیتا ہوں۔آپ اس کے سرورق کی جے پی جی فائل بھیج دیں۔اپنی تصویر بھی بھیج دیں تو اچھا ہے۔آپ کے مضمون کے ساتھ دی جا سکتی ہے۔میرا خیال ہے کہ آپ اپنا ایک بلاگ بنا کر اپنی کتب اور جملہ مضامین کو آن لائن مہیا کر سکتے ہیں۔اس میں زیادہ مشکل پیش نہیں آئے گی۔میری اس میل کے آخر میں میرے چند بلاگس کے لنک دیئے ہوئے ہیں۔پہلے دو لنکس زیادہ مربوط ہیں۔ان سے آپ اپنا بلاگ بنانے کا کچھ آئیڈیا کر سکیں گے۔''

اس جواب میں سلیقے اور تہذیب کے ساتھ نہ صرف واضح اختلاف رائے موجود ہے بلکہ اختلاف رائے کے باوجود میری طرف سے انتہائی فراخ دلی کا مظاہرہ بھی کیا گیا ہے۔میں آپ کی ترجمہ کردہ تحریروں سے اتفاق نہ کرنے کے باوجود ان کو آن لائن کرنے کی ترغیب دے رہا ہوں اور اس کے لیے آپ کو سہولت دینے پر بھی آمادہ ہوں۔آپ کے معتقدات سے اختلاف کرنے کے باوجود میں آپ کے اختلاف رائے کے حق کو بھی تسلیم کر رہا ہوں اور اس کی قدر بھی کر رہا ہوں، اور ساتھ ہی آپ کو باور کرا رہا ہوں کہ ایسے موضوعات پر مکالمہ ہونا چاہئے لیکن ان لوگوں کے ساتھ جو اختلاف رائے کو برداشت

کرنے کا ظرف رکھتے ہوں۔مجھے افسوس ہے کہ آپ خود اس ظرف کا مظاہرہ نہ کر سکے۔آپ ایک بار نہیں بار بار چھلکے۔میں مہذب انداز میں آپ کو توجہ دلاتا رہا اور آپ استہزائیہ انداز سے اپنے علم کا مظاہرہ کرتے رہے۔میرا خیال ہے کہ اب تک ہمارے درمیان جو مراسلت ہو چکی ہے، اس سارے میٹر کو علمی مکالمہ کے طور پر یک جا کر کے شائع کر دیا جائے۔اس سے میرا آپ کا نہ سہی بہتوں کا بھلا ہو جائے گا۔

اسماعیل احمد ادھم کی کتاب پر تبصرہ کرنا چاہتا ہوں۔۸ مارچ کو میری اہلیہ کی انجیو پلاسٹی ہوئی ہے۔میں ان کے طبی معاملات میں مصروف رہا ہوں۔یہ سلسلہ ابھی بھی جاری ہے تاہم تبصرہ میں ضرور کروں گا بلکہ اچھا ہوگا کہ جہاں میرا تبصرہ کتاب پر میری رائے کا اظہار ہوگا، وہیں پر ہمارا یہ مکالمہ اس تبصرے کے لیے پس منظر بھی مہیا کر دے گا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

■■■

قریشی صاحب ذات کے اعتبار سے میں بھی قریشی ہوں، (لیکن نام کے ساتھ درج نہیں کرتا)۔ میرے انداز سے آپ نے کوئی جملہ تیز خیال کر لیا، اور بس، اس کے علاوہ اور کوئی بات نہیں۔ یہاں پچھلے پیراگراف میں شوخی (گدگدی) کا انداز اپنایا گیا ہے، طعن و تشنیع کا نہیں۔

کوانٹم فزکس دراصل فزکس اور میٹافزکس کے درمیان ایک رابطے کی صورت ہے، جس سے میں نے کہا کہ علمی طور پر مائنڈ اور میٹر یا روح اور مادے کی کم سے کم فلسفیانہ دوئی ختم ہوتی نظر آتی ہے۔

انگریزی ای میل کا آخری لمبا حصہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس پر بات کی جائے۔ ٹالرنس اور پلورزم کی دو اصطلاحات یا الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ ٹالرنس یا برداشت کا مطلب واضح طور پر یہ ہے کہ بخوشی کوئی بات/شخص/شخصیت قبول نہیں ہوتی، بلکہ کوئی نہ کوئی تلخی یا انقباض چھپا ہوتا ہے۔ جب کہ پلورزم یا پلورسٹک اپروچ میں تلخی کو ختم کرتے ہوئے وصفی یا ڈسکرپٹو انداز میں بات کی جاتی ہے اور انقباض در نہیں آنے دیا جاتا۔ بلکہ آپ کو اپنی بات کہنے اور مجھے اپنی بات کرنے کی آزادی حاصل ہوتی ہے، کسی فرکشن کے بغیر، محض اپنی پسند اور ناپسند کے تحت۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی ناپسند بات بھی واضح ڈسکرپٹو طور پر بیان نہ کی جا سکے۔

بات زندگی اور صحت کے ساتھ ہے۔ خدا آپ کو اور آپ کے اہلِ خانہ کو کامل صحت عطا فرمائے۔

مشکور ہوں کہ آپ تبصرہ لکھیں گے، اور ذاتی پسند یا ناپسند کو ٹالرنس یا برداشت کے تحت نہیں، بلکہ پلورسٹک اپروچ کے مطابق دیکھیں گے۔ باقی اپنا اپنا انداز۔

شخصیت اپنی اپنی ہوتی ہے
کوئی ہوتا نہیں کسی جیسا

عمر فاروق

.....

حیدر قریشی بنام عمر فاروق

Mar 14 at 7:25 PM

محترمی عمر فاروق صاحب

سلام مسنون

آپ کا ۱۴ مارچ کا برقی خط ملا، شکریہ۔

آپ نے میرے ۳ مارچ والے ابتدائی خط سے لے کر ۱۳ مارچ والے خط تک اختلاف رائے کے حوالے سے میرے خیالات اور میرے خطوط کے ذریعے میرے طرزِ عمل کے باوجود نہ صرف ان ساری باتوں کو نظر انداز کیا ہے، بلکہ ایک بار پھر مجھے ہی برداشت اور آزادئ اظہار کا درس دے رہے ہیں۔ حالانکہ اس دوران آپ کی کتنی ہی باتوں کے جواب میں میری طرف سے اپنی پرانی تحریروں کے ذریعے آپ پر اپنا موقف واضح کیا گیا۔ ایسے مواقع پر دو صورتیں تو بالکل سامنے کی بات لگتی ہیں۔ اگر مدلل طور پر آپ کی کوئی بات رد ہو رہی ہے تو آپ کو اس اعتراف کر لینا چاہئے۔ اور پھر بات کو وہاں سے آگے لے جانا چاہئے۔ دوسرے اگر آپ کے کسی موقف سے ملتی جلتی بات دوسری طرف بھی ہو رہی ہے تو یا تو مشترکہ نکات پر صاد کر لینا چاہئے یا پھر دوسرے موقف پر کھل کر بات کرنی چاہئے۔ افسوس یہ ہے کہ آپ نے ایسی ہر صورت سے گریز کیا۔ ایک موقع پر مجبوراً آپ کو اعتراف کرنا پڑا تو وہیں آپ کی اپنی ٹالرنس اور پلورسٹک اپروچ دونوں کا بھرم کھل گیا۔ یہ سب کچھ مراسلت میں محفوظ ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے حوالے سے مغربی دنیا کے ایک طبقے کی متعصّبانہ رائے بہت پہلے سے میرے علم میں ہے اور میں اس پر اپنا ردِ عمل ۱۹۸۱ء کے مطبوعہ اپنے ایک افسانے ''میں انتظار کرتا ہوں'' میں احسن طور پر دے چکا ہوں۔ (یہ افسانہ میرے افسانوی مجموعہ روشنی کی بشارت میں شامل ہے) لہٰذا قریشی حوالے سے اسماعیل احمد ادھم کا نسب انساب والا مضمون میرے لیے کسی نجی رنجش کا باعث کیسے ہو سکتا ہے۔ بلکہ اس کی وضاحت مزید کے طور پر میں نے آپ کو اپنے پانچ مارچ والے خط میں اپنی تین تحریروں کے اقتباس بھیجے تھے۔ اور ان کے آخر میں یہ لکھا تھا:

''میرا خیال ہے کہ ذات پات کے حوالے سے ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ لیکن ہمارا سوچنے کا انداز قدرے مختلف ضرور ہے۔ اسماعیل صاحب نے جو کچھ عربوں کے نسب کے حوالے سے لکھا ہے وہ سارا کچھ دنیا کے کسی بھی دوسرے خطے اور کسی بھی قوم پر اس سے کہیں زیادہ منطبق کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اس حوالے سے میں اپنے تبصرے میں کچھ عرض کر سکوں گا۔''

آپ نے میرے اس موقف کو بادل ناخواستہ تسلیم کیا لیکن ساتھ ہی استہزائیہ انداز اختیار کر لیا۔ یہاں آپ کی ٹالرنس اور پلورسٹک اپروچ کا عملی مظاہرہ ریکارڈ پر آ گیا اور پھر آتا چلا گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ اپنے (محض ترجمہ شدہ، نہ کہ کسی جستجو سے عبارت) دہریانہ افکار کے لیے جس کشادہ قلبی کا تقاضا کرتے ہیں ویسی کشادہ قلبی ملنے کے باوجود آپ خود اپنے نظریے کو کسی فرقہ پرست کی طرح مسلط کر رہے ہیں۔

میرے پیش کردہ ٹھوس جوابوں کو نظر انداز کر کے محض اپنی رٹی رٹائی باتیں دہرائے جا رہے ہیں۔ حالانکہ جب میرے ساتھ مکالمہ ہے تو دونوں طرف پیش کیے جانے والی باتوں کے ذریعے ہی بات آگے بڑھ سکتی ہے۔ مثلاً پہلی ساری باتیں ایک طرف، ابھی میں نے آپ کے بارہ مارچ کے انگریزی والے خط کا اقتباس دے کر اس کے جواب میں جو کچھ پیش کیا ہے کیا آپ کو اس حوالے سے اپنے لکھے ہوئے الفاظ پر کوئی ندامت محسوس ہوئی؟ آپ کو کسی اظہارِ ندامت کی ضرورت پیش آئی؟

آغا جی کے نام لکھے گئے آپ کے خط کی جو کاپی مجھے بھیجی گئی تھی اس کا عنوان ہی آپ نے یہ لکھا ہوا ہے۔ ''ڈاکٹر وزیر آغا کے نام ترسیل نہ ہو سکا ایک خط''۔ لیکن اب آپ اس حوالے سے میری طرف سے لکھے گئے چند جملوں کا صاف گوئی سے سامنا کرنے کی بجائے کتنا کنفیوزڈ جواب لکھ رہے ہیں۔

''آغا صاحب کو خط میں نے پوسٹ کر دیا تھا مگر آغا صاحب ان دنوں بیمار تھے لاہور میں۔ یا شاید خط ان تک ترسیل ہی نہ ہو سکا''۔

کوانٹم فزکس کی جو وضاحت آپ نے کی ہے تو یہ میرے لیے ذاتی طور پر خوشی کا باعث ہے۔ میں نے اپنی یادوں کے باب ''روح اور جسم'' میں اس حوالے سے جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک حصہ یہاں پیش کر دیتا ہوں۔

''روح کیا ہے؟ اس بارے میں دو تصورات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصور یا عقیدہ کے مطابق حمل ٹھہر جانے کے کچھ عرصہ کے بعد آسمانِ ارواح سے رُوح بچہ میں داخل ہوتی ہے۔ جبکہ دوسرے تصور یا عقیدہ کے مطابق رُوح ایک لطیف نُور ہے، یہ نور نطفہ کے اندر ہی موجود ہوتا ہے اور نطفہ کی نشوونما کے ساتھ مستحکم ہوتا جاتا ہے۔ ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' میں اس پر سیر حاصل بحث موجود ہے اور میرا یہی عقیدہ ہے کہ جسم اور روح لازم و ملزوم ہیں۔ علامہ اقبال بھی فلسفیانہ سطح پر اسی تصور کے قائل تھے۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں وہ روح اور مادہ کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے اور انسان کو ایک ایسی وحدت قرار دیتے ہیں جس کے اعمال و افعال کا مشاہدہ عالم خارجی کے حوالے سے کیا جائے تو اسے بدن کہیں گے اور جب ان کی حقیقی غرض و غایت اور نصب العین پر نظر رکھی جائے تو اسے روح کہیں گے۔ عقیدہ اور فلسفہ سے ہٹ کر سائنس میں کلوننگ کے تجربہ سے اس عقیدہ اور تصوّر کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ روح ہمارے ہر سیل میں سرایت کئے ہوئے ہے۔''

تو جناب آپ کوانٹم فزکس کے ذریعے جس دیار کی بات کر رہے ہیں، کوانٹم فزکس سے کسی شناسائی

کے بغیر بھی میں تو پہلے ہی اسی طرف گھوم پھر رہا ہوں۔ اب مزید کیا کہوں؟

ضروری لگتا ہے کہ ہماری ساری خط و کتابت کسی حاشیہ آرائی کے بغیر مکالمہ کے طور پر شائع کر دی جائے۔ چلیں کسی کا بھی بھلا نہ ہو ادبی طور پر یہ ریکارڈ تو محفوظ ہو جائے گا۔

ہماری صحت یابی کے لیے آپ کی وش کا شکریہ۔ اللہ آپ کو بھی صحت و سلامتی سے رکھے۔

والسلام

آپ کا مخلص

حیدر قریشی

■■■

''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' کا جائزہ

مصر میں مقیم ترکی نژاد اسماعیل احمد ادہم ۱۹۱۱ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۰ء میں وفات پا گئے۔ان کے اردو ترجمہ نگار عمر فاروق ہیں۔آپ چودہ سال تک انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں عربی پڑھاتے رہے ہیں۔آج کل کینیڈا کے شہر ٹورانٹو کے قریب مقیم ہیں۔ان کے مطابق اسماعیل احمد ادہم نے اپنی ۲۹ سال کی کُل عمر میں ریاضی اور فزکس میں پی ایچ ڈی کر لی تھی۔عربی، ترکی، فارسی، جرمن، روسی ،اطالوی، انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں انہیں مہارت حاصل تھی۔کتاب ''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' کے چوتھے مضمون ''محمد حسین ہیکل کی کتاب **حیاتِ محمدؐ** پر نقد و تعلیق'' سے معلوم ہوتا ہے کہ اسماعیل احمد ادہم نے اُس زمانے کے سوویت یونین کی روسی سائنس اکیڈمی سے پی ایچ ڈی کا تحقیقی کام کیا تھا۔کم عمری میں وفات پا گئے اور ان کی وفات کے بعد ان کے کام اور نام کو بھلا دیا گیا۔تاہم لگ بھگ تیس سال کے بعد ایک دوست کی توجہ سے ان کے مضامین کے مجموعے شائع کیے جانے لگے۔اسماعیل احمد ادہم کے اردو ترجمہ نگار نے ان کی کتاب **قضایا و مناقشات** میں سے چار مضامین منتخب کیے اور انہیں اردو میں ترجمہ کر کے عنوان بالا کے تحت شائع کیا۔مجھے ان کی طرف سے اس کتاب کی ان پیج فائل اور پی ڈی ایف فائل ملی ہیں اور انہیں کی بنیاد پر میں اس کے مضامین کا جائزہ لے رہا ہوں۔کتاب میں شامل چار مضامین کے عنوان یہ ہیں۔

۱۔عربوں کا علم الانساب: ایک تجزیاتی مطالعہ
۲۔واقعۂ عام الفیل اور رسولِ اسلامؐ کی ولادت
۳۔قدیم دور میں اسرائیلیوں اور عربوں کے تعلقات
۴۔محمد حسین ہیکل کی کتاب **حیاتِ محمدؐ** پر نقد و تبصرہ

کتاب کے شروع میں ہی مصنف کی جانب سے اپنے قارئین سے یہ تقاضا کیا گیا ہے۔

''تاریخِ عرو بہ و اسلام کے بارے میں سنجیدہ علمی تحقیق سے دل چسپی رکھنے والے حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت حتی الامکان اپنے اپنے روایتی نظریات اور موروثی تعصّبات سے الگ ہو کر، ان افکار میں مقید ہوئے بغیر اس کا مطالعہ کریں جو کچھ اوپر ہزار سال سے مشرق کی رگوں میں پیوست ہیں، اور اسے تہذیبِ انسانی کا ساتھ دینے سے روکے ہوئے ہیں''۔

(اسماعیل احمد ادہم)

سنجیدہ علمی تحقیق کا مطالعہ کرتے وقت اور سنجیدہ علمی تحقیق کرتے وقت ہر طرح کے نظریات و تعصّبات سے بالا رہنا چاہئے۔لیکن اپنے مضامین میں اسماعیل احمد ادہم خود سنجیدہ تحقیق کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھ سکے. ان کے کام کی نوعیت سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ منظّم طور پر اسلام کے خلاف ایسا کنفیوژن پھیلانا چاہ رہے ہیں جس کا مقصد کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنے کی بجائے قارئین کو بھول بھلیاں میں لا کر چھوڑ دینا ہے۔اس کتاب کے ترجمہ نگار عمر فاروق بھی اپنی کسی ''روحانی'' نسبت کے باعث نہ صرف اسی مزاج کے حامل ہیں بلکہ اتنے سنجیدہ اور حسّاس موضوعات پر مکالمہ کرتے ہوئے نہ صرف سنجیدہ غور و فکر کی طرف یکسر توجہ نہیں کرتے بلکہ اپنے دہریانہ افکار کو زبردستی منوانے کے لیے طنزیہ و استہزائیہ انداز اختیار کرتے ہیں۔اگر انہیں ان کے منفی رویے کی طرف توجہ دلائی جائے تو کسی ایک آدھ جگہ دوسرے موقف کا اعتراف تو کر لیتے ہیں لیکن اسی لمحہ میں غیر مہذب اور ایک رنگ میں دھمکی آمیز روش اختیار کر لیتے ہیں۔ترجمہ نگار عمر فاروق کا یہ سارا طرزِ عمل ہمارے مکالمہ ''**ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں، ۲ مارچ ۲۰۱۶ء سے ۱۴ مارچ ۲۰۱۶ء تک ہونے والا مکالمہ**'' میں محفوظ ہے۔بہر حال میں اپنے اس مضمون میں اسماعیل احمد ادہم کے مذکورہ چاروں مضامین کا مختصراً جائزہ لوں گا اور اس جائزہ میں آگے چل کر ظاہر ہو گا کہ تاریخ اور تحقیق کے نام پر مصنف اور ترجمہ نگار دونوں عربوں، مسلمانوں اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف خود اپنے ''عقائد'' کو مسلط کرنے کے لیے اپنے نظریات اور تعصّبات کے بُری طرح اسیر ہیں۔

''عربوں کا علم الانساب: ایک تجزیاتی مطالعہ'' مضمون کا لُبِّ لباب یہ ہے کہ عرب خانہ بدوش قبائل میں خانہ بدوشی کے باعث مادری نظام رائج تھا۔اس کے تحت عورت کے ایک سے زائد خاوند ہوا کرتے تھے۔اس لیے بچوں کا نام باپ کی نسبت سے نہیں بلکہ ماں کی نسبت سے جانا جاتا تھا۔سو عربوں میں نسب نامہ کا کوئی تصور نہیں تھا۔حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں اس کی بنیاد پڑی اور پھر بتدریج نسب

نامہ کی روایت مستحکم ہوتی گئی۔مصنف کے اپنے الفاظ میں:

''یوں اولاد کو بجائے باپ کے عام طور پر قبیلے، اور کبھی ماں کی طرف منسوب کیا جاتا تھا۔ انساب کے وہ سلسلے جنھیں قدیم عربوں سے متعلق سمجھا جاتا ہے، زمانۂ ماقبلِ اسلام کے عرب ان سے واقف نہیں تھے۔ انساب کے یہ سلاسل (یعنی شجرہ ہائے نسب/Genealogical Lines) دوسری صدی ہجری میں راویوں اور نسب بیان کرنے والوں (نسّابین) کی اختراع ہیں۔

انساب کا یہ تصور اس وقت سامنے آیا جب عمر بن خطّاب نے اپنے زمانۂ خلافت میں محکمہ محصولات (دیوان الخراج) کا آغاز کیا، اور ناموں کے اندراج میں لوگوں کی دینی اور نسبی حیثیتوں کو پیشِ نظر رکھا۔ یہ بات کوئی ایک صدی بعد شجرہ ہائے نسب وضع کرنے کی تمہید بنی۔''[1]

''زمانۂ ماقبلِ اسلام کے عرب مادری نظام (Matriarchy) کے قائل تھے، اور بچوں کی نسبت ماں یا قبیلے کی طرف کی جاتی تھی۔''[2]

اس بارہ میں جب ترجمہ نگار نے میرے ایک خط پر اعتراض کیا تو میں نے اپنی وضاحت پیش کرنے کے ساتھ انہیں یہ بھی لکھا:

''میرا خیال ہے کہ ذات پات کے حوالے سے ہم ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں۔لیکن ہمارا سوچنے کا انداز قدرے مختلف ضرور ہے۔اسماعیل صاحب نے جو کچھ عربوں کے نسب کے حوالے سے لکھا ہے **وہ سارا کچھ دنیا کے کسی بھی دوسرے خطے اور کسی بھی قوم پر اس سے کہیں زیادہ منطبق کیا جا سکتا ہے**۔تاہم اس حوالے سے میں اپنے تبصرے میں کچھ عرض کر سکوں گا۔''[3]

اس کے جواب میں ترجمہ نگار نے لکھا:

''نسب انساب کی حقیقت یقیناً سب کے ہاں تقریباً ایک سی ہے۔بس اپنی حقیقت چھوڑ کر عام روش یہی ہے کہ دوسرے کی حقیقت بتائی جائے اور اپنے لیے تسکین دل کا سامان بہم پہنچایا جائے۔'' [4]

ایک علمی حقیقت کا اعتراف و اقرار کر لینے کے بعد چاہئے تو یہ تھا کہ ترجمہ نگار مزید سنجیدگی اختیار کرتے لیکن اس کے برعکس وہ اسی مکتوب میں ہی جھلاہٹ کا شکار ہو کر ''تو تڑاک'' پر اُتر آئے۔میں نے انہیں اس غیر علمی اور غیر مہذب رویے کی طرف توجہ دلائی تو اسے گدگدی قرار دینے لگے۔اس ساری تفصیل کو جاننے کے لیے ہماری مراسلت ''ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں، ۲ مارچ ۲۰۱۶ء سے ۱۴ مارچ ۲۰۱۶ء تک ہونے والا مکالمہ'' کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

اب میں زیرِ گفتگو مضمون کے بارے میں اپنا موقف بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔انسان کی ابتدا اور انجام کی بابت ایک موقف مذہبی کتب کا ہے۔جن کے مطابق خدا نے آدم کو تخلیق کیا، پھر ان کا جوڑا بنایا اور نسلِ انسانی کی ابتدا ہوئی۔دنیا میں اچھے اور برے اعمال کی بنیاد پر آخرت میں جزا سزا کے عمل سے گزرنا ہوگا۔

مذہبی روایات کے متوازی جدید علوم کے ذریعے بھی حیاتِ انسانی کی ابتدا کو جاننے کی کاوشیں جاری ہیں۔ابھی تک حیاتِ انسانی کی دلچسپ داستان کا سارا تحیّر اس راز میں ہے کہ اس داستان کے ابتدائی صفحات اور آخری صفحات غائب ہیں۔سوزندگی کا کھوج لگانے والے ماہرین اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق انکشافات کرتے رہتے ہیں۔وہ انکشافات مکمل حقیقت ہونے سے زیادہ مختلف امکانات ہوتے ہیں۔ممکن ہے ایسا ہوا ہو، ممکن ہے ویسا ہوا ہو۔بعض ماہرین کے اپنے اپنے ذہنی پس منظر کے باعث اپنی اپنی ترجیحات بھی کہیں کہیں کام کر جاتی ہیں یا ہاتھ دکھا جاتی ہیں۔سو جب پورے کرۂ ارض پر حیاتِ انسانی کی ابتدا کے حوالے سے ایک ہی جیسا حال ملتا ہے تو محض عربوں کے ہاں مادری نظام کا انکشاف کیوں؟

اسماعیل احمد ادہم نے جس انداز سے قدیم ادوار کو دیکھنے کی کوشش کی ہے، میں اسی انداز کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ان کے تھیسس کے برعکس نتیجہ پیش کر دیتا ہوں۔

جب اسماعیل احمد ادہم عربوں کو خانہ بدوش کہتے ہیں تو وہ اصولاً اپنے بنیادی تھیسس کو خود ہی رد کر دیتے ہیں۔قدیم خانہ بدوش اور زرعی معاشرہ میں فرق کو واضح کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔خانہ بدوش زندگی کا سارا انحصار روشنی پر ہوتا تھا۔دن میں سورج کی روشنی، رات میں چاند کی روشنی، ستاروں کی روشنی، پھر روشنی کے ان آسمانی مظاہر کی نسبت سے آگ کی روشنی۔روشنی کا بنیادی مظہر آسمانی ہے۔آسمان دھرتی کے مقابلہ میں مردانہ خواص رکھتا ہے۔جبکہ دھرتی عورت کے خواص کی مظہر ہے۔اسی لیے قدیم زرعی معاشرہ نے دھرتی ماتا اور مادرِ وطن جیسے احساس کو اجاگر کیا۔زمین بیج کو اپنے اندر جذب کر کے ماں کی طرح پودے کو جنم دیتی ہے اور پھر اس کی نشوونما کرتی ہے، جبکہ سورج کی روشنی دھرتی اور بیج دونوں کے لیے مردانہ حرارت کی مظہر ہے۔دنیا میں اہم اور بڑے خانہ بدوش قبائل کے ہاں دیوتاؤں کا تصور ملتا ہے جبکہ زرعی معاشرے میں دیویوں کا تصور ملتا ہے۔جو معاشرے خانہ بدوشوں کو رُکنے پر، ٹھہراؤ پر مجبور کر دیتے تھے وہاں دیویوں اور دیوتاؤں کا ملاپ عقیدے میں شامل ہو جاتا تھا۔اگر اسماعیل احمد ادہم کے نزدیک عرب خانہ بدوش تھے تو پھر ان کے ہاں تو مزاجاً ہی

مردانہ بالا دستی موجود تھی۔ سو عرب معاشرے میں عورتوں کے تعدد ازدواج کی صورت میں عورت کی بالا دستی کا مضمون اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

اِدھر ہندوستان کی قدیم سوسائٹی کو ہی دیکھ لیں۔ آریا خانہ بدوش تھے اور دیوتاؤں کے ساتھ ہند میں وارد ہوئے تھے۔ ہندوستان کے مقامی لوگ دراوڑ، بھیل اور دیگر سب زرعی معاشرہ کے لوگ تھے۔ ان کے ہاں دیویاں ہی دیویاں تھیں۔ یہاں تک کہ خدائے واحد (ایشور) بھی عورت تھی۔ لیکن دونوں کے ملاپ سے پھر ہند آریائی تہذیب ابھری۔

ہند کی دھارمک روایات میں ارجن کا دروپدی کو جیتنا اور پھر ماں کے کہنے پر (ماں کے کہنے پر اہم نکتہ ہے) پانچوں بھائیوں کا دروپدی کو بیوی بنا کر رکھنا مذکور ہے۔ اس سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم ترین دور میں جب وہاں عورت ایک سے زائد شوہر رکھا کرتی تھی، یہ داستان اسی کثرت ازدواج کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ لیکن یہ قدیم زرعی معاشرہ میں ہوا تھا۔ سو عورتوں کا ایک سے زیادہ مردوں سے شادی کرنا قدیم زرعی معاشرہ میں تو رواج پا سکتا تھا، کہ زرعی معاشرہ عورت ہی کا ترجمان معاشرہ تھا، لیکن خانہ بدوش قبائل میں ایسا مشکل دکھائی دیتا ہے کہ ان کا مزاج مردانہ ہے۔

جہاں تک حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں محکمہ محصولات کے ذریعے نسب نامہ کی روایت کو فروغ ملنے کا قیاس ہے، اگر اسے کسی حد تک درست مان لیا جائے تب بھی قرآنی تعلیم میں سورہ **الحجرات** کی آیت ۱۳ میں صریحاً یہ فرمان موجود ہے۔

''اے انسانو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت تخلیق کیا اور تمہاری ذاتیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم آپس میں پہچان رکھ سکو۔ بے شک فضیلت اللہ کے نزدیک تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور خبر رکھتا ہے۔''

بے شک مسلمانوں میں اس واضح فرمان کی عملی صورت بہت کم دیکھنے میں آتی ہے لیکن دنیا بھر کے ہر مذہب اور ہر معاشرے میں ذات پات کا نظام کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے۔ اس کے لیے صرف عربوں کو مطعون کرنا مناسب نہیں ہے۔ تاہم اس بات کا عربوں میں مادری نظام کے رواج والے الزام سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اسماعیل احمداد ہم نے اپنے مضمون میں طوطمیت کے حوالے سے بھی جو بحث کی ہے، اس کا بھی ان کے بنیادی موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں بنتا، ٹوٹم کا ذکر محض مضمون کو طویل کرنے اور اپنے مطالعہ کو ظاہر کرنے کی کاوش ہے۔ دنیا بھر کے قدیم قبائلی معاشروں کے مطالعہ میں

ٹوٹم کا ذکر مل جاتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ٹیبوز کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اسماعیل احمداد ہم نے جیسے ٹیبوز کو نظر انداز کیا ہے ویسے ہی ٹوٹم کو بھی نظر انداز کر سکتے تھے۔ کیونکہ ان کے ذکر سے ان کے بنیادی موضوع کو کوئی تقویت نہیں ملتی۔ مجموعی طور پر مضمون ''عربوں کا علم الانساب: ایک تجزیاتی مطالعہ'' سنجیدہ علمی تحقیق کے نام پر ایک غیر سنجیدہ اور غیر علمی تگ و دو ہے۔ مفروضوں کی بنیاد پر تحقیق کی عمارت کھڑی کی گئی ہے۔ اس مضمون میں مضمون نگار کا اپنا تعصب ظاہر ہوتا ہے۔ ایک تو اُس زمانہ میں وہ سوویت یونین کے کیمونزم کے دہریت والے پہلو سے متاثر دکھائی دیتے ہیں، جو سرمایہ دار مغرب سے تمام تر اختلاف کے باوجود ان کے لبرل حلقوں سے مطابقت بھی رکھتا ہے۔ دوسرے مستشرقین یورپ کے افکار کا ان پر غلبہ ہے۔

سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے نتیجہ میں عربوں کا عمومی طرزِ عمل شاید اتنا مناسب نہ تھا اور اس حوالے سے ترک قوم کو عربوں سے جو شکوے شکایات ہوں، وہ بڑی حد تک درست بھی کہی جا سکتی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کوئی ترک نژاد اُٹھے اور پوری عرب قوم سے بدلہ لینے کے لیے اس قسم کی تحقیق پیش کرنے لگ جائے۔ تحقیق کی آڑ لے کر یہ محض اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ اسماعیل احمداد ہم کا ذاتی فعل اور ذاتی کردار ہے، ورنہ ترک قوم اپنے تمام تر تحفظات کے باوجود عالمِ عرب اور عالمِ اسلام سے محبت کا تعلق رکھتی ہے۔

زیرِ گفتگو کتاب کا دوسرا مضمون ''واقعۂ عام الفیل اور رسولِ اسلامؐ کی ولادت'' ہے۔ اس مضمون میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ابرہہ خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے کوئی چڑھائی کرنے نہیں آیا تھا۔ اسے رومن شاہ کی طرف سے ترغیب دی گئی تھی کہ وہ ایران پر حملہ کرے تاکہ ایران کی توجہ منقسم ہو اور رومن سلطنت ایرانی دباؤ سے نکل سکے۔ ابرہہ کو ایرانی سرحد تک پہنچنے کے لیے ارضِ حجاز سے ہوتے ہوئے گزرنا تھا۔ چنانچہ جب اہلِ مکہ نے اس لشکر کو آتے ہوئے دیکھا تو یہ باور کر لیا کہ ابرہہ خانہ کعبہ کو گرانے کے لیے آ رہا ہے۔ لیکن جب بادِ سموم کے چلنے اور چیچک کی وبا پھیلنے کے باعث ابرہہ کا لشکر واپس چلا گیا تو اہلِ مکہ نے اسے نصرتِ خداوندی قرار دے دیا۔ جبکہ ابرہہ تو ایرانی سرحد کی طرف جانا چاہ رہا تھا۔ اس موضوع کو نبھانے کے لیے مصنف نے پھر زیادہ تر اہلِ مغرب کی تواریخ کا سہارا لیا ہے۔ کچھ مفروضے اپنے طور پر قائم کیے ہیں۔ اس کے باوجود جب وہ خود یہ اقرار کرتے ہیں:

''واضح رہے یمن سے فارس کے لیے روانہ ہونے والی حبشی فوج اپنی راہ میں آنے والی کسی بھی بستی کو روندتی ہوئی وہاں سے اپنا زادِ راہ حاصل کرتی آگے بڑھتی۔ لمبی صحرائی مسافت کے بعد حجاز اس

فوج کے راستے میں آنے والی پہلی آبادی تھی۔ لازم بات ہے کہ وہ اس آبادی کو زیر کرتی آگے نکلتی۔ مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے صحرا کے سفر سے نامانوس اہلِ حبشہ کی یہ فوج بادِ سموم اور وبائی مرض کا شکار ہوگئی۔ یہی وہ عنایتِ الٰہی تھی جس نے اہلِ حجاز کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔'' ۵

مصنف خود تسلیم کر رہے ہیں کہ بے شک لشکر کا اصل نشانہ خانہ کعبہ نہ تھا لیکن جب اس نے اس علاقہ سے گزرنا تھا تو اسے روندتے ہوئے اور زیر کرتے ہوئے گزرنا تھا تو اس کے بعد کسی بھی دور کی کوڑی لانے کی کوئی ضرورت رہ جاتی ہے؟

ابرہہ کی نیت کیا تھی؟ اس نے کہاں جانا تھا؟ اسماعیل احمد اہم کے سارے مفروضے درست مان لیے جائیں پھر بھی یہ تو ان کی اپنی تحریر سے واضح ہو گیا کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ شہر کو روندتے ہوئے اور زیر کرتے ہوئے گزرنا تھا۔ ایسے لگتا ہے کہ اسماعیل احمد اہم محض کنفیوژن پھیلانے کی غرض سے خود ہی متضاد باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ مثالیں دیکھیں:

''عربی مصادر کے مطابق اہلِ حبشہ کی مکہ کی جانب پیش قدمی کا سبب لوگوں کو کعبہ سے روگرداں کرنے کی خاطر یمن کے دارالحکومت صنعا میں ابرہہ اشرم کا تعمیر کردہ ایک ہیکل تھا۔ (18) جب کہ **مسیحی مصادرِ تاریخ میں اس بات کا قطعاً ذکر نہیں ملتا کہ ابرہہ نے Arabia Felix میں کوئی ہیکل تعمیر کیا تھا۔ (19) مزید برآں، مؤرخ اوزیٹ اپنی (تاریخِ کنائس) میں عرب کے نصاریٰ، ان کے پادریوں اور معروف لوگوں کے ضمن میں ابرہہ اور صنعا میں اس کی جانب سے ہیکل تعمیر کرنے کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ (20)**

یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ یمن کے بعض علاقوں اور نجران میں عیسائی آباد تھے۔ نیز اہلِ حبشہ کے عرصۂ حکومت کے دوران یمن میں عیسائی پادری بھی موجود تھے۔ (21) **یہ پادری حضرات، جو بلاشبہہ اپنے لوگوں کے مذہبی معاملات کی پاسبانی کا فریضہ ادا کرتے تھے، یمن کے دارالحکومت میں اپنے لیے کوئی نہ کوئی ہیکل یا کنیسہ ضرور رکھتے تھے**، اور بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ کنیسہ ہی عربوں کی مذکورہ روایات کی بنیاد بنا۔ **عین ممکن ہے کہ اہلِ حبشہ، جو یقیناً نصرانی تھے، نے حاکمِ ملک ہونے کی رعایت سے اس کنیسہ کو اپنے مطابق زیب و زینت دی اور آراستہ کیا ہو۔** یہی بات صحرائے عرب کے بدوؤں اور اہلِ حجاز کے ہاں حبشہ والوں کی طرف سے اپنے ہیکل کو کعبے کے مقابل لانے کی کوشش سمجھی گئی۔۔۔۔۔ بدیں وجہ عرب راویوں کی بیان کردہ حجاز پر حملے کی بات ہمارے نزدیک کسی صورت قابلِ قبول نہیں۔ (22)'' ۶

اس اقتباس کے اندر موجود تضادات سے قطع نظر جب ایک قاری نے مصنف مذکور کو قرآن مجید کی سورۃ الفیل کی طرف توجہ دلائی تو موصوف کی طرف سے صفحہ نمبر ۵۲ پر لکھی گئی پہلی بات کو دہراتے ہوئے یہ جواب دیا گیا۔

''سورۂ فیل کی آیات اور عنایتِ خداوندی کے لحاظ سے واضح رہے یمن سے فارس کے لیے روانہ ہونے والی حبشی فوج اپنی راہ میں آنے والی بستی کو روندتی ہوئی وہاں سے اپنا زادِ راہ حاصل کرتی آگے بڑھتی۔ لمبی صحرائی مسافت کے بعد حجاز اس فوج کے راستے میں آنے والی پہلی آبادی تھی۔ لازم بات ہے کہ وہ اس آبادی کو زیر کرتی آگے نکلتی۔ مگر وہاں تک پہنچتے پہنچتے صحرا کے سفر سے نامانوس اہلِ حبشہ کی یہ فوج بادِ سموم اور وبائی مرض کا شکار ہوگئی۔ یہی وہ عنایتِ الٰہی تھی جس نے اہلِ حجاز کو اس کے شر سے محفوظ رکھا۔'' ۷

اسماعیل احمد اہم نے کئی صفحات اس تحقیق پر ضائع کر دیئے کہ ابرہہ کے لشکر میں ہاتھی نہیں تھے۔ وہ ہاتھی کہاں سے لاتے، اور کیسے لاتے۔ وغیرہ۔ لیکن جب وہ **سورۃ الفیل** میں مذکور عنایات خداوندی کی براہِ راست تکذیب سے بظاہر پہلو بچاتے ہیں تو پھر یہاں قارئین کو **سورۃ الفیل** میں مذکور حقائق کا یاد دلانا ضروری ہو جاتا ہے۔

''شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیسا کیا۔ کیا ان کی تدبیر کو برباد نہیں کر دیا۔ اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے جو ان پر پتھر پھینکتے تھے۔ پھر کر ڈالا انہیں کھائے ہوئے بھُس کی مانند۔''

اب سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ اعلانیہ طور پر قرآن مجید کی اس سورۃ کی براہ راست تکذیب سے تو دامن کو بچاتے ہیں لیکن ان کے اخذ کردہ نتائج سب کے سب اس سورۃ کی تکذیب کرتے ہیں۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

موصوف لکھتے ہیں۔

''نجاشی نے، از رہِ مروت، یمن پر مقرر اپنے عامل ابرہہ کو حکم دیا کہ وہ اپنی فوج کی کچھ ٹکڑیاں شمال کی جانب فارس کی حدود پر حملے کے خیال سے روانہ کر دے۔ یمن سے فارس تک کا لمبا قدرتی راستہ مکہ سے گزر کر قدیم دور میں دریائے فرات کو بارش کا پانی مہیا کرنے والی وادیِ رمہ (وادي الرُّمَّة) میں پہنچ کر

ختم ہوتا تھا۔(14) اہلِ حبشہ کی یمنی فوج نے یقیناً شمال کو جانے والا یہی راستا اختیار کیا۔لیکن روانہ کردہ یہ فوج حجاز کے پاس پہنچ کر بری طرح تھکن کا شکار ہوگئی۔ بہت سے لشکریوں کو بیماری چاٹ چکی تھی۔ چیچک کے وبائی مرض نے ان کا ستیاناس کر دیا تھا۔(15) چنانچہ حبشہ والے مجبور ہو گئے کہ اپنی فوج واپس بلالیں اور رومیوں سے اپنے نقصانات کا ذکر کرتے ہوئے آگے جانے سے معذرت چاہیں۔ ادھر حجاز کے باشندے (اپنے خیال میں) اہلِ حبشہ کے اس ٹھاٹھیں مارتے لشکر کی پیش قدمی سے بری طرح خائف ہو گئے تھے، اور اسے خود پر حملہ آور تصور کرنے لگے۔مگر جب یہ لشکر وبائی مرض کا شکار ہوا، تو عرب (اہلِ حجاز) اسے اپنے لیے عنایتِ خداوندی سمجھے جس نے انھیں حبشہ والوں کے شر سے محفوظ رکھا*۔(16) یہ وہ تاریخی واقعہ ہے جس کے گرد (سفرِ فیل) سے متعلق عربوں کی تمام روایات کا تانا بانا بنا گیا۔'' **۸**

''**عرب مؤرخین** اہلِ حبشہ کے اس حملے کو **بالاتفاق** (سفرِ فیل) کا نام دیتے ہیں، جو حبشی فوج میں ہاتھیوں کی موجودگی سے منسلک ہے۔(23) لیکن یہ بات ہمیں (تحقیقی نتائج پر اثر انداز ہونے والے) اہم نقطہ ہائے نظر کی جانب لے جاتی ہے، جن کے مطابق بعض **مغربی مؤرخین** حبشی فوج میں ہاتھیوں کی موجودگی سے انکار کرتے دکھائی دیتے ہیں(24)، بایں سبب کہ ان کے خیال میں ہاتھیوں کو یمن میں بحفاظت رکھنا اور نجران کے صحراؤں میں چلانا امرِ محال کے ذیل میں آتا ہے۔'' **۹**

''ان تمام نتائج کے پیشِ نظر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اہلِ حبشہ کا (یمن سے ابرہہ کی قیادت میں) کسی اور غرض سے نہیں، بلکہ کعبہ ڈھانے کی نیت سے نکلنے کا قصہ اس وجہ سے ماقبلِ اسلام دور کا قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس میں خاصی غرابت پائی جاتی ہے۔ اس قصے کو زمانہ مابعدِ اسلام کی پیداوار کہنا چاہیے۔۔۔۔۔۔۔ ہمارے پیش کردہ تاریخی حقائق (اور واقعاتی قرائن) سے ثابت ہو جاتا ہے کہ عربی کتب میں مذکور یہ قصہ دراصل تخیل ہی کا کرشمہ ہے۔'' **۱۰**

ابرہہ کو اس کے جرم سے بری کرنے کے ساتھ اسماعیل احمداد ہم نے ایک اور کام یہ کیا ہے کہ عام الفیل کی مصدقہ روایت کو بھی مشکوک بنانے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی ہے۔ روایات میں مذکور ہے کہ اصحابِ فیل کا واقعہ حضرت محمد ﷺ کی پیدائش کے قریب دنوں میں ہوا تھا۔اس وجہ سے اسے آنحضرت ﷺ کی صداقت کے نشان کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے۔اب اسماعیل احمداد ہم نے یہ کیا ہے کہ اپنے مغربی مستشرقین پر انحصار کرتے ہوئے ابرہہ کے لشکر کی آمد کو آنحضرت ﷺ کی پیدائش سے تیس سال پہلے کا واقعہ قرار دے ڈالا ہے۔لیکن اس معاملہ میں بھی ان کی تحقیق کتنی کنفیوزڈ ہے، اس اقتباس سے

ہی ظاہر ہو جائے گا۔

''اہلِ حبشہ کا (سفرِ فیل) کے نام سے معروف یہ حملہ 540ء میں وقوع پذیر ہوا(37)، جیسا کہ مذکورہ بالا تحقیقی نتائج سے ثابت ہوتا ہے۔ جب کہ پیغمبرِ اسلام کی ولادت محققین کے نزدیک 570ء میں ہوئی۔(38) اس لحاظ سے عام الفیل (سفرِ فیل کے سال) اور پیدائش رسولؐ کے مابین کوئی تعلق نہیں بنتا۔ دونوں کے درمیان کوئی تیس برس کا فرق ہے، جو انھیں ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے۔بعض عرب مؤرخین بھی اس زمانی بعد کا ذکر کرتے ہیں، جیسے مفسر بغوی نے لکھا ہے کہ: (سفرِ فیل) ولادتِ رسولؐ سے تقریباً چالیس برس قبل پیش آیا(39)۔ جب کہ محمد بن سائب کلبی نے اسے تئیس برس کا عرصہ بتایا ہے(40)۔ دوسری طرف ہم تاریخی لحاظ سے یہ بھی جانتے ہیں کہ ابرہہ کے جانشینوں نے یمن پر تقریباً اکتیس سال حکومت کی(41)، اور 570ء میں قدس کی افواج یمن سے اہلِ حبشہ کو نکالنے کے لیے پہنچیں(42)۔اس طرح ابرہہ کی یمن پر حکومت کا سال 540ء کے لگ بھگ ہی بنتا ہے۔ کچھ عربی مصادر میں بالواسطہ طور پر اس بات کی تائید کی گئی ہے۔'' **۱۱**

اس تحقیق کے مطابق سفرِ فیل آنحضرت ﷺ کی ولادت سے تیس سال پہلے پیش آیا۔ چالیس سال پہلے پیش آیا۔تیئس سال پہلے پیش آیا۔مقصد صرف اتنا ہے کہ واقعۂ اصحاب فیل اور آنحضرت ﷺ کی ولادت اگر ایک ساتھ ثابت ہوگئی تو یہ عربوں اور مسلمانوں کے لیے ازدیادِ ایمان کا موجب بنی رہے گی، اس لیے اس معاملے کو بھی کنفیوز کر دو۔تاریخ اور تحقیق کے نام پر جہاں تہاں سے مواد اکٹھا کر لو، بس جن لوگوں سے متعلق روایت ہے، ان کے ہاں متفقہ اور مصدقہ روایات بھی ہیں تو ان کا حوالہ بالکل سامنے نہیں لاؤ۔اسماعیل احمداد ہم کا یہی طریقۂ واردات ہے اور وہ آخر تک اسی طریق پر عمل پیرا دکھائی دیتے ہیں۔حالانکہ اگر یہ روایت غلط ہوتی تو سب سے پہلے کفارِ مکہ نے ہی شور مچانا تھا کہ ایسا کب ہوا۔کفارِ مکہ کی طرف سے ایسا کوئی اعتراض نہ کیا جانا بجائے خود ان مصدقہ اسلامی روایات کی توثیق کرتا ہے جن میں اصحابِ فیل کے واقعہ کو عام الفیل کہا گیا ہے۔

پس کفارِ مکہ کی طرف سے **سورۃ الفیل** کے نزول پر اور عام الفیل کی مصدقہ روایات کے ہوتے ہوئے کوئی اعتراض نہ کرنا بجائے خود عام الفیل کی صداقت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے اور اس عملی شہادت کے سامنے اسماعیل احمداد ہم کے سارے مفروضے اور سارے کنفیوزنگ حوالے بے معنی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل تیسرے مضمون کا عنوان ہے ''قدیم دور میں اسرائیلیوں اور عربوں کے تعلقات''۔اس مضمون میں بنیادی طور پر اسرائیلیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔عربوں سے ان کے تعلقات کو محض فلسطینیوں سے تعلقات کی حد تک رکھا گیا ہے۔یا پھر ایک جگہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ یہودیوں کے میل جول کا ذکر ہے۔سامی النسل ہونے کے حوالے سے اسرائیلی قوم کو پہلے عرب اقوام میں بیان کیا گیا ہے پھر انہیں طورانی الاصل بتایا گیا ہے۔اسرائیل کے عروج وزوال کو مذہبی پس منظر کی بجائے سماجی اور سیاسی پس منظر کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے۔اس سلسلہ میں چند حوالہ جات سے مصنف کا موقف کسی حد تک سمجھا جا سکتا ہے۔پہلے اسرائیلیوں کو عربوں کی طرح سامی النسل قرار دینے کے چند حوالے دیکھیں۔

''نوعِ انسانی کی انھی چند نسلوں میں سے ایک سامی نسل ہے،جس میں اسرائیلی قوم شامل ہے۔''۱۲

''اس سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ابتدائی سامی نسل، جو صحرانشین بدوؤں پر مشتمل تھی، اوّلاً جزیرہ نمائے عرب میں آباد ہوئی،اور وہاں سے دیگر علاقوں میں پھیلی۔ یہ ماقبلِ تاریخ کے کسی قدیم تر دور کی بات ہے۔جزیرہ نمائے عرب کے صحراؤں میں سکونت پذیر ہونے کے باعث،ابتدائی سامی نسل کے ان صحرانشین بدوؤں کو جب بھی رزق کے وسائل میں کمی کا سامنا کرنا پڑتا،تو وہ قبائل کی شکل میں دجلہ وفرات کے طاسوں اور انھیں سیلابی پانی مہیا کرنے والی وادیوں، نیز دریائے نیل کے طاس کا رخ کیا کرتے۔ ان میں سے کچھ متمدن زندگی کی طرف چلے جاتے اور اس میں ضم ہو کر جزیرہ نمائے عرب کے سامیوں سے الگ ہو جاتے۔''۱۳

''اسرائیلی صحرانشین بدو تھے،اور بدویت ہی ان کی ثقافت کی اساس تھی۔لہٰذا، وہ قبائل کی شکل میں زندگی گزارتے تھے،اور قبیلہ ہی ان کے محسوسات وخیالات کا آئینہ دار تھا،اور اسی سے ان کا وجود قائم تھا۔اسرائیلیوں کے ہاں مذہب کا تصور ان مؤثرات وعوامل کے تحت پروان چڑھا جن کے مطابق وہ ابتدائی انسانی گروہ تشکیل پایا جس سے اسرائیلی قوم وجود پذیر ہوئی۔''۱۴

اسرائیلیوں کو دوسرے عربوں کی طرح سامی النسل قرار دینے کے بعد اسماعیل احمد ادہم انہیں طورانی نسل سے بیان کرنے لگ گئے۔اس سلسلہ میں بھی ان کے چند اقتباس پیش کر دیتا ہوں۔

''یہ بات سامنے آنے پر ترک محققین اس بات کے شواہد بہم پہنچانے لگے کہ عبرانی قوم سامی النسل نہیں، بلکہ وہ طورانی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔''۱۵

''اس تحقیق سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ یہودیوں اور طورانی اقوام کے درمیان اس نوعیت کا خونی تعلق پایا جاتا ہے۔''۱۶

''اسرائیلی تاریخ کے بارے میں تازہ تحقیقات ترک محققین ہی کے نقطۂ نظر کی تائید کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ اسرائیلی قوم طورانی الاصل ہے۔''۱۷

مضمون کے عنوان کے پیش نظر اس میں فلسطینیوں اور اسرائیلیوں کی قدیم جنگوں کا اچٹتا سا ذکر کر دیا گیا ہے۔پورے مضمون میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد کے ساتھ حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کا بس اتنا سا ذکر ملتا ہے۔

''یہود خلیج کے پار طورِ سینا کے علاقے میں چالیس سال سے زیادہ ارضِ مدین میں مقیم رہے، جہاں اسماعیلی قیام پذیر تھے۔(19) اسماعیلی عرب تھے، جو حویلہ سے لے کر سور اور خاکنائے سویز [اب نہر سویز] کے پاس سولر تک پھیلے ہوئے علاقے میں سکونت پذیر تھے۔حویلہ کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ وہ یمن کے شمال میں واقع خولان کا علاقہ ہے۔گویا وہ حجاز،نجد،ارضِ مدین،صحرائے سینا اور عقبہ میں سینا کے شمال میں واقع فاران کے دشت میں آباد تھے*۔مدین میں یہودیوں اور عربوں کا پہلا رابطہ عمل میں آیا،یعنی اسرائیلی قبائل اور عربوں کے اسماعیلی قبیلے کے درمیان۔''۱۸

مختلف زبانوں اور مختلف نسلوں کے اختلاط سے دنیا میں جو نئی زبانیں وجود میں آئیں اور جو قومیں نمایاں ہوئیں،ان سب کی مثال ایسے ہی ہے جیسے مختلف ندیوں، دریاؤں،سمندروں سے بھاپ اُڑتی ہے اور پھر بادلوں کا روپ اختیار کر کے برسنے لگتی ہے۔جس طرح ان کے بارے میں کوئی حتمی حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ برسنے والا کون سا قطرہ کس ندی یا دریا کا تھا اور کون سا قطرہ کس سمندر کا تھا۔ایسے ہی زبانوں اور قوموں کی صورت پذیری کا معاملہ ہے۔تاہم ان کے سامنے کے جو مرکزی کردار ہیں وہی ان قوموں کے آبا واجداد ہیں۔

اس مضمون کو پڑھتے ہوئے مجھے گمان رہا کہ شاید یہاں بھی عربوں کی طرح اسرائیلیوں کے حسب نسب پر کوئی حملہ ہوگا۔لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔بس تاریخی طور پر جو کچھ ہو گزرا ہے اسے اپنے زاویۂ نگاہ کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے۔عربوں پر حملہ کرنے کے لیے اسماعیل احمد ادہم کو عربوں کے اندر سے اور پھر مسلمانوں کے اندر سے کوئی ٹھوس بات نہیں مل سکی تو انہیں کبھی مستشرقین یورپ کا سہارا لینا پڑا تو کبھی پادریوں کے حوالہ جات سے مدد لینا پڑی۔جبکہ اس مضمون میں ایک دو ایسے مقامات آئے تھے، جہاں زیر

گفتگو لوگوں کے حسب نسب کے حوالے سے بعض ذیلی باتیں آسانی سے کی جاسکتی تھیں۔ مثلاً یہ ایک حوالہ دیکھیں۔

''بنی اسرائیل کے ان قبائل (اسباط) کی تعداد تیرہ تھی، جو یہ ہیں: روبین، جادو، افرایم، مناسی، بنیامین، یہودا، سیمون، لاوی، ایسا کر، آشیر، زابلون، نفتالی اوردان۔'' **۱۹**

یہاں اگر اسماعیل احمد ادہم چاہتے تو وضاحت کرتے ہوئے بتا سکتے تھے کہ ان میں سے کتنے قبیلے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بیویوں سے ہونے والی اولاد میں سے تھے اور کتنے قبیلے لونڈیوں کی اولاد میں سے تھے۔ اس کے لیے کسی گہری تحقیق کی ضرورت نہیں تھی بس عہد نامہ قدیم کو ایک نظر دیکھنے کی ضرورت تھی۔

اور ہاں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے ہیں۔ اسماعیل احمد ادہم نے تیرہ قبیلے بیان کیے ہیں، جو غلط ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے۔ ان میں سے **لاوی** کی اولاد کو قبیلے میں شمار نہیں کیا جاتا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے نام کا بھی قبیلہ نہیں ہے لیکن ان کے دو بیٹوں (حضرت یعقوب علیہ السلام کے دو پوتوں) مناسی اور افرایم کے نام سے دو قبیلے ہیں۔ مناسی ان سب میں سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ گویا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ میں سے دس بیٹوں اور دو پوتوں کے نام پر بارہ قبیلوں کے نام رکھے گئے ہیں۔

موآبی قوم جو مفتوح ہو کر اسرائیلی قوم میں ضم ہوگئی، اس کا ذکر اسماعیل احمد ادہم نے بس اتنا ہی کیا ہے۔

''اسرائیلیوں، موآبیوں اور کنعانیوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگیں، جو اسرائیلیوں کی جلاوطنی اور مؤخر الذکر دو قوموں کے اسرائیلی قوم میں ضم ہو جانے پر منتج ہوئیں'' **۲۰**

حالانکہ اگر وہ بائبل کتاب پیدائش کے باب ۱۹ کی آیت ۳۰ سے ۳۸ تک دیکھ لیتے تو بتا سکتے کہ موآبی قوم (اور بنی عمون بھی) باپ اور بیٹی کے جسمانی تعلق سے پیدا ہوئی تھی۔ میں تو یہاں کسی کا نام لکھنے کی جسارت نہیں کرسکتا، تاہم دلچسپی رکھنے والے احباب بائبل کی مذکورہ آیات خود دیکھ سکتے ہیں۔

اسماعیل احمد ادہم نے جس طرح مفروضوں اور مخالفین کے بیانات کی بنیاد پر عربوں پر حملے کیے ہیں، اسرائیلیوں کے بارے میں ان کا رویہ بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ عربوں کے معاملہ میں جو چیز کہیں نہیں ہے وہ بھی انہیں دکھائی دینے لگتی ہے اور اسرائیل کے معاملہ میں سامنے کی چیز بھی انہیں دکھائی نہیں

دیتی۔ اس سے خود اسماعیل احمد ادہم کے تعصب کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''محمد حسین ہیکل کی کتاب **حیاتِ محمدؐ** پر نقد و تبصرہ'' اسماعیل احمد ادہم کی اردو میں ترجمہ کی گئی کتاب کا چوتھا اور آخری مضمون ہے۔ اس مضمون تک آتے آتے مضمون نگار کے باطن اور ترجمہ نگار کی مضامین کے انتخاب میں منظم منصوبہ بندی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے۔ یہ مضمون محمد حسین ہیکل کی کتاب ''حیاتِ محمدؐ'' پر اسماعیل احمد ادہم کے تبصرے کے تسلسل میں لکھا گیا ہے۔ اسماعیل احمد ادہم نے محمد حسین ہیکل کی کتاب پر تبصرہ کیا۔ اس پر کچھ ردِ عمل سامنے آیا۔ جب محمد حسین ہیکل نے ''حیاتِ محمدؐ'' کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو اس کا مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے ''جاہل مستشرقین اور مشنریوں کے حامی مصری ادیب پر تبصرہ'' **۲۱** کے زیر عنوان اسماعیل احمد ادہم کے اعتراضات کے جواب دیئے۔ اس عنوان کے جواب میں اسماعیل احمد ادہم نے لکھا:

''میں مشنریوں کی آرا اور جاہل مستشرقین کی بے سروپا باتیں نہیں دہراتا۔'' **۲۲**

حالانکہ ان کی تحقیق کا زیادہ تر انحصار مستشرقین اور مشنریز کے حوالوں پر ہے یا پھر ویسے ہی مفروضوں پر تحقیق کو استوار کرتے ہیں۔ سابقہ مضامین میں ان کے بعض ایسے حوالوں کی میں نشان دہی کر آیا ہوں، خود اسی مضمون میں بھی وہ ڈوزی (**ص ۱۰۳**)، ولیم میور، نولدکے، فلیجل، شپرنگر، گولڈزیہر، کائتانی، ڈوزی اور سنوک ہیگرو (**ص ۱۰۴**)، Leone Ceatani اور William Robertson Smith (**ص ۱۰۶**) کے ناموں سے اپنے موقف کو ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ بحث در بحث سلسلے کا مضمون ہے جس میں زیرِ بحث موضوعات کا بھی پوری طرح سے پتہ نہیں چلتا۔ تاہم بعض جملوں سے تحقیق کے نام پر پیغمبرِ اسلام ﷺ کے خلاف زہر اگلنے کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔ اسماعیل احمد ادہم کا یہ اقتباس دیکھیں۔

''ڈاکٹر موصوف کا کہنا ہے کہ میں **قرآن میں تحریف** کا قائل ہوں۔ عرض ہے کہ **میں نے یہ بات نہیں کی**۔ علمی دیانت داری کا تقاضا تھا کہ ڈاکٹر ہیکل اپنی رائے اور مخالف رائے کو واضح طور پر پیش کرتے اور پھر ان کے درمیان تقابل کرتے۔

اسی طرح **مرگی کے مرض** (صرع) کے بارے میں میری رائے پر ڈاکٹر ہیکل نے اپنے غلط اور سطحی قسم کے جواب میں مجھے جہالت سے متصف کرتے ہوئے طبی معلومات سے ناواقف قرار دیا ہے۔ ہم انھیں یہ کہنے کا حق ضرور دیتے اگر وہ خود ماہر طبیب ہوتے۔ لیکن عصبی امراض کے ماہر ڈاکٹر مبروزو کی

تحقیقات کے بارے میں وہ کیا فرمائیں گے؟

جہاں تک **پیغمبرؐ کے نسب اور نبوت سے قبل نام** ان کے کا تعلق ہے، تو میں نے اپنی مذکورہ کتاب کی پہلی جلد میں ان امور پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔'' **۲۳**

سورۃ **الفیل** کے معاملہ میں اسماعیل احمد ادہم کی محتاط رائے اور عملاً اس کے برعکس متشدد تحقیقی انداز سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ قرآن میں تحریف کے قائل ہیں۔ تاہم اگر وہ واقعی تحریف کے قائل نہ تھے اور انہوں نے تحریفِ قرآن کے الزام کی تردید کرنا تھی تو قولِ سدید کی طرح وضاحت کر دیتے۔ یہ کہنے کی بجائے کہ ''میں نے یہ بات نہیں کی''، صرف اتنا لکھ دیتے کہ میں قرآن میں تحریف کا ہرگز ہرگز قائل نہیں ہوں۔ لیکن انہوں نے صاف وضاحت کرنے کی بجائے گول مول بات کر کے کام نکالنے کی کوشش کی۔

تحریف کی بات سے ہٹ کر حضرت محمد ﷺ سے منسوب مرض اور آپ کی ذاتِ بابرکات کے بارے میں دوسری نازیبا باتوں کے اشاروں سے بھی اسماعیل احمد ادہم کی تحقیق کے زہریلے پن کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک دنیا بھر میں مخالفین اسلام کا تعلق ہے ان کی طرف سے اس سے کہیں زیادہ سنگین باتیں اسلام، قرآن اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کے خلاف پہلے بھی لکھی جا چکی ہیں اور اب بھی لکھی جا رہی ہیں لیکن یہ باتیں مذہبی دنیا کے حوالے سے ہی لکھی گئی ہیں۔ باقی بے شمار مخالفانہ کتابوں کو چھوڑیں صرف پادری فانڈر (C.G.Pfander) نے ان موضوعات پر ''میزان الحق'' میں جو کچھ لکھا ہے، اس کے سامنے اسماعیل احمد ادہم کے ایسے زہریلے مضامین بھی بے ضرر دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن انہوں نے تاریخ اور تحقیق کی آڑ لے کر نہیں لکھا بلکہ مذہبی زبان میں ہی بات کی ہے۔ چنانچہ ایسی مخالفانہ مذہبی کتابوں کا جواب بھی اسی انداز میں دیا جاتا ہے۔ اسماعیل احمد ادہم نے تاریخ اور تحقیق کا نقاب اوڑھ کر حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس پر، آپؐ پر نازل ہونے والی آیاتِ مقدسہ پر نازیبا اعتراض کیے ہیں اور آپ کے حسب نسب سے لے کر پورے عالمِ عرب تک کو اپنے تعصب کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ خود تو یہ تقاضا کرتے ہیں کہ انہیں پڑھتے ہوئے روایتی نظریات اور تعصّبات سے الگ ہو کر پڑھا جائے۔ لیکن وہ خود یہ سب کچھ لکھتے ہوئے اپنے دہریانہ نظریات اور زیرِ بحث موضوعات کے بارے میں اپنے تعصّبات سے بالکل باہر نہیں نکل سکے۔ صرف مصنف ہی نہیں، ان کے اردو ترجمہ نگار بھی انہیں کی طرح اپنے دہریانہ نظریات اور نفرت انگیز

تعصّبات سے باہر نہیں نکل سکے۔ اس سلسلہ میں میرے اور ان کے درمیان ہونے والی خط و کتابت سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کون سنجیدہ علمی موضوعات کو سنجیدگی سے لے رہا ہے اور کون ان پر استہزائیہ انداز اختیار کر رہا ہے۔ اس سلسلہ کی ساری خط و کتابت ''ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں، ۲ مارچ ۲۰۱۶ء سے ۱۴ مارچ ۲۰۱۶ء تک ہونے والا مکالمہ'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آ چکی ہے، اس کے مطالعہ سے قارئین میری بات کو مزید بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

مصنف اور ان کے اردو ترجمہ نگار دونوں تاریخ اور تحقیق کے دیاروں کے سفر میں چوتھے کھونٹ کا صبر آزما راستہ اختیار کر سکتے تھے لیکن اسی طرف جاتے جاتے انہوں نے موڑ کاٹا اور اپنے دہریانہ عقائد کے اثرات سے مغلوب ہو کر خود اپنے ہی تعصّبات کا شکار ہو کر رہ گئے۔

حوالہ جات

۱ عربوں کا علم الانساب: ایک تجزیاتی مطالعہ۔
بحوالہ ''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' از اسماعیل احمد ادہم صفحہ نمبر ۹

۲ ایضاً صفحہ نمبر ۱۴

۳ حیدر قریشی بنام عمر فاروق March 5, 2016 2:31 AM
''ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں،
۲ مارچ ۲۰۱۶ء سے ۱۴ مارچ ۲۰۱۶ء تک ہونے والا مکالمہ''

۴ عمر فاروق بنام حیدر قریشی March 5, 2016 8:51 PM
''ادب، تاریخ، جدید علوم اور الٰہیات کے تناظر میں،
۲ مارچ ۲۰۱۶ء سے ۱۴ مارچ ۲۰۱۶ء تک ہونے والا مکالمہ''

۵ واقعۂ عام الفیل اور رسولِ اسلامؐ کی ولادت
بحوالہ ''سامی عربی تاریخ سے چند حقائق'' از اسماعیل احمد ادہم صفحہ نمبر ۵۲

۶ ایضاً صفحہ نمبر ۵۳

۷ ایضاً صفحہ نمبر ۶۴

۸ ایضاً صفحہ نمبر ۵۲

۹ ایضاً صفحہ نمبر۵۴
۱۰ ایضاً صفحہ نمبر۵۷
۱۱ ایضاً صفحہ نمبر۵۸اور۵۹
۱۲ قدیم دور میں اسرائیلیوں اور عربوں کے تعلقات۔ ایضاً ایضاً صفحہ نمبر۶۳
۱۳ ایضاً صفحہ نمبر۷۶
۱۴ ایضاً صفحہ نمبر۸۹
۱۵ ایضاً صفحہ نمبر۸۰
۱۶ ایضاً صفحہ نمبر۸۱
۱۷ ایضاً صفحہ نمبر۸۲
۱۸ ایضاً صفحہ نمبر۸۵
۱۹ ایضاً صفحہ نمبر۸۶
۲۰ ایضاً صفحہ نمبر۸۸
۲۱ محمد حسین ہیکل کی کتاب **حیاتِ محمدؐ** پر نقد و تبصرہ۔ ایضاً ایضاً صفحہ نمبر۹۹
۲۲ ایضاً صفحہ نمبر۹۹
۲۳ ایضاً صفحہ نمبر۱۰۶

اسلامیہ کالج پشاور یونیورسٹی کا تحقیقی مجلّہ ''آرٹس اینڈ لٹرز''
شمارہ نمبر۱۶۔سال ۲۰۱۶ء
(یہ مجلّہ اپریل ۲۰۱۷ء میں منظرِ عام پر آیا)

انٹرنیٹ پر حیدر قریشی کی کتابوں کی دستیابی نہایت مربوط اور آسان،
حیدر قریشی کے متعدد دیگر بلاگس اور لنکس کے مقابلہ میں آسان ترین لنک

شعری مجموعے
سلگتے خواب،۔۔عمرِ گریزاں،۔۔محبت کے پھول،۔۔دعائے دل،۔۔درد سمندر،۔۔زندگی،

نثری مجموعے
روشنی کی بشارت،۔۔۔قصے کہانیاں،(افسانے)۔۔۔میری محبتیں (خاکے)
کھٹی میٹھی یادیں،۔۔۔قربتیں، فاصلے (انشائیے)،۔۔۔ سوئے حجاز (سفرنامہ)

تحقیق وتنقید
حاصلِ مطالعہ،۔۔تاثرات،۔۔مضامین اور تبصرے،۔۔مضامین ومباحث
ستیہ پال آنند کی بودنی، نابودنی،۔۔ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور مابعد جدیدیت،
وزیر آغا عہد ساز شخصیت،

ماہیا کے حوالے سے تحقیق وتنقید
اردو میں ماہیا نگاری،۔۔۔اردو ماہیے کی تحریک،
اردو ماہیے کے بانی ہمت رائے شرما،۔۔۔اردو ماہیا،۔۔۔ ماہیے کے مباحث،

حالاتِ حاضرہ
منظر اور پس منظر،۔۔۔خبر نامہ،۔۔۔اِدھر اُدھر سے،۔۔۔چھوٹی سی دنیا،

حیدر قریشی کی مذکورہ بالا تمام کتابیں، الگ الگ کتاب کی صورت میں اس لنک پر دستیاب ہیں
http://my27books.blogspot.de/

انٹرنیٹ پر حیدر قریشی کی کتابوں کی پیش کش کا ایک اور انداز

چھ شعری مجموعے ایک جلد میں

''قفس کے اندر''

۱۵۲ صفحات کے عوامی ایڈیشن اور ۶۱۸ صفحات کے انٹرنیٹ ایڈیشن دونوں ساتھ ساتھ

افسانوں، خاکوں، یادوں، انشائیوں اور سفرناموں پر مشتمل چھ نثری مجموعے ایک جلد میں

''خواب کے اندر خواب''

اردو ماہیے کی تحقیق وتنقید پر مشتمل پانچ کتابیں ایک جلد میں

''اردو ماہیا تحقیق وتنقید''

علمی وادبی موضوعات پر چھ تنقیدی مجموعے ایک جلد میں

''ہمارا ادبی منظرنامہ''

پانچ شعری اور چھ نثری مجموعوں پر مشتمل میگزین سائز کتاب

''عمرِ لاحاصل کا حاصل''

مذکورہ بالا کلیات کی صورت میں حیدر قریشی کی کتابیں اس لنک سے لے سکتے ہیں۔

http://kuliat-library.blogspot.de/

حیدر قریشی کے فن کے حوالے سے مرتب کی گئی اور لکھی گئی کتابیں

اخبار وادبی رسائل کے نمبر اور گوشے اور یونیورسٹیوں کے دستیاب تحقیقی مقالات اس لنک پر

http://work-on-haiderqureshi.blogspot.de/

حیدر قریشی پر اب تک ہونے والا یونیورسٹی سطح کا تحقیقی کام

براہِ راست

۱۔حیدر قریشی شخصیت اور فن۔۔۔۔منزہ یاسمین (**ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ** سال ۲۰۰۲۔۲۰۰۰ء)

(اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور، پاکستان)

۲۔حیدر قریشی شخصیت اور ادبی جہتیں۔۔۔۔ڈاکٹر عبدالرب استاد (تحقیقی مقالہ برائے **پی ایچ ڈی** ۲۰۱۳ء)

(گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، کرناٹک، انڈیا)

۳۔حیدر قریشی۔حیات وخدمات انجم آراء (**ایم فل کا مقالہ** سال ۲۰۱۳ء)

(کلکتہ یونیورسٹی، کولکاتا، انڈیا)

۴۔حیدر قریشی کی ادبی خدمات۔۔۔۔عامر سہیل (تحقیقی مقالہ برائے ایم فل اُردو، ۲۰۱۴ء)

(ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، پاکستان)

۵۔حیدر قریشی کی شاعری کا مطالعہ۔۔۔ہردے بھانو پرتاپ (**ایم فل کا مقالہ**، سال ۲۰۱۴ء)

(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۶۔حیدر قریشی کی افسانہ نگاری کا مطالعہ۔۔۔رضینہ خان (**ایم فل کا مقالہ** سال ۲۰۱۴ء)

(جواہر لال نہرو یونیورسٹی، دہلی۔انڈیا)

۷۔حیدر قریشی کی شاعری کی روشنی میں بیرونی ممالک کی اردو شاعری۔''تنقیدی مطالعہ اور ترجمہ''

احمد عبدربہ عباس عبدالمنعم (**ایم اے کا مقالہ** سال ۲۰۱۵ء)۔**ازہر یونیورسٹی۔قاہرہ، مصر**

نگران:۱: حازم محمد احمد محفوظ ۲۔محمد السید عبدالخالق

یہ مقالہ عربی میں لکھا گیا ہے اور اس کے لیے حیدر قریشی کے چار شعری مجموعوں کا عربی ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔

.....

بالواسطہ

۱۔جدید ادب میں شائع ہونے والے مباحث۔۔۔۔شازیہ حمیرہ

سال ۲۰۰۹۔۔۔۲۰۰۷ء۔**اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور**، پاکستان سے **ایم اے اردو کا تحقیقی مقالہ**

۲۔اردو میں ماہیا نگاری از ڈاکٹر صبیحہ خورشید

سال ۲۰۰۹ء۔**ناگپور یونیورسٹی، ناگپور، انڈیا** سے **پی ایچ ڈی کا مقالہ**

.....